ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
February
2017
☆ نامور مصنفہ 'رفعت سراج' کا شاہکار ناول 'دامِ دل' اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ **دوشیزہ** کراچی

مُدیرِ اعلیٰ ——— منزہ سہام
مُدیر ——— زین شمسی
انکم ٹیکس ایڈوائزر ——— مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

فروری 2017
جلد:45☆شمارہ:02
قیمت:60روپے

خط وکتابت کا پتا
88-C II۔فرسٹ فلور۔خیابان
جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆عکاس: موسیٰ رضا/مرزا احمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

افسانے

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)..... 890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ..... 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا..... 6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی OB-7 تالپور روڈ، کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرمبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرسالانہ
کویت 55امریکی ڈالرز
ایران 55امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55امریکی ڈالرز
سری لنکا 55امریکی ڈالرز
یو اے ای 55امریکی ڈالرز
جاپان 55امریکی ڈالرز
مصر 55امریکی ڈالرز
لیبیا 55امریکی ڈالرز
یونان 55امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55امریکی ڈالرز
فرانس 55امریکی ڈالرز
جرمنی 55امریکی ڈالرز
برطانیہ 55امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55امریکی ڈالرز
ناروے 55امریکی ڈالرز
پولینڈ 55امریکی ڈالرز
امریکہ 65امریکی ڈالرز
کینیڈا 65امریکی ڈالرز
افریقہ 65امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر 021-35893121 - 35893122

احتجاج

کچھ دن قبل ایک بہت غیر معمولی خط موصول ہوا' لکھنے پڑھنے سے تعلق ہے اس لیے اس تیز دور میں اب بھی خطوط موصول ہونے پر خوشی ہوتی ہے، آنے والا یہ لفافہ بہت خستہ حالت میں تھا۔ لفافے کو ہاتھ لگاتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ احتیاط سے لفافہ کھولا اور خط کا متن پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جی ہاں یہ خط اقبال کے شاہین نے لکھا تھا۔

مدیرہ! میں پہاڑ کی چوٹی پر بہت پُرسکون زندگی گزار رہا تھا صرف شکار کے لیے پرواز بھرتا اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا...... پاکستان کی طرف سے آنے والی ہواؤں سے پتہ چلا کہ آپ کے ملک میں بھی شاہین بستے ہیں جو بذریعہ جہاز پرواز کرتے ہیں اور ہر میدان میں اُتر کر شکست فاش کا سامنا کرتے ہیں۔ میں آپ کی قومی ٹیم کی بات کر رہا ہوں' میرے خاندان میں تو اب تک کوئی ناکام نہیں ہوا ہماری دنیا میں بڑی عزت ہے۔ شاعرِ مشرق جناب علامہ اقبال نے ہمیں پرندوں میں افضل ترین گردانا تھا ورنہ اس سے قبل تو لوگ ہمیں خونخوار قسم کی بڑی چڑیاں ہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہماری شان اپنی شاعری کے ذریعے بڑھائی۔ مگر آخر آپ کے میڈیا کو کیا تکلیف ہے کہ ایک مستقل ہارنے والی ٹیم کو شاہین کہہ کر پکارتے ہیں۔ میرے پاس عدالت کی سہولت نہیں ورنہ اس میڈیا پر نالش کرتا...... آپ سے گزارش ہے کہ میرے دکھوں کا سدباب کیجیے تاکہ میں اپنے بچوں کو منہ دکھانے کے قابل رہوں اپنی کرکٹ ٹیم کو کسی اور جانور یا پرندے کے نام سے پکاریئے۔ خدارا انہیں شاہین مت کہیے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے قلم کے ذریعے میرا دکھ اور شکوہ اربابِ اختیار تک ضرور پہنچائیں گی۔ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں سے کبھی گزر ہو تو میرے غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے گا' اچھا لگے گا۔

اللہ حافظ

منجانب: اقبال کا شاہین

منزہ سہام

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیراعلیٰ

تمام پڑھنے والوں کو منزہ سہام کا خلوص بھرا اسلام...... جس وقت میں یہ سطور لکھ رہی ہوں جسمانی طور پر تو کراچی میں ہوں مگر میرا ذہن لاہور پہنچا ہوا ہے۔ جی ہاں سچی کہانیاں کے پہلے ایوارڈز 26 جنوری کو ہونے جارہے ہیں اور آج 24 تاریخ ہے دوشیزہ کی تیاری عروج پر ہے میرے چاروں طرف کاغذات ہی کاغذات ہیں خطوط کی شکل میں افسانوں کی شکل میں' اس وقت میں مکمل تصویر ہوں کاغذی پیراہن کی...... آپ سب کی دعاؤں کی متمنی ہوں ایوارڈ کی تقریب کرنا اور وہ بھی اپنے شہر سے دور ایسے ہی ہے جیسے بیٹی کو پردیس میں بیاہنا' آخر وقت تک بے شمار کام ہیں جو کرنے کے ہیں۔ بس یہ یقین ہے کہ آپ سب ساتھ ہیں تو ہر مشکل آسان...... چلیے بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب یخ بستہ موسم میں محبت اور خلوص کی گرمی سے سجا یہ خط ہے ہماری پیاری زمر کا لکھتی ہیں۔ بہت پیاری منزہ سہام! السلام علیکم! اللہ آپ پر ہمیشہ مہربان رہے آمین۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی اور ادارے کے تمام اراکین ووابستگین کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ ثم آمین) منزہ جی! سب سے پہلے تو آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ کی اپنائیت و خلوص میرے لیے آکسیجن سے کم نہیں۔ آپ کی دعائیں اثرانگیز ہیں۔ اس لیے الحمدللہ پہلے سے بہتر ہوں۔ ہمیشہ دعائیں دیتی رہیے گا اور میں اپنے سبھی ساتھی لکھاری اور قارئین کرام کی بھی مشکور ہوں جو اپنے تبصروں اور رائے سے میرے قلم کو نہ صرف مہمیز کرتے ہیں بلکہ میرا حوصلہ بھی بڑھاتے ہیں کہ وہ مجھے پڑھنا چاہتے ہیں۔ میرے دوستوں کی تنقید بھی تعمیری عمل سرانجام دیتی ہے۔ ناول کی نویں قسط ارسال کررہی ہوں۔ پہلے سے طویل ہے' امید ہے موصول ہوتے ہی مجھے اطلاع مل جائے گی۔ احمد سجاد بابر کو اس بار ایوارڈ مبارک ہو۔ سچی کہانیاں ایوارڈ کا چرچہ و دھوم تو بہت سنی ہے۔ مگر انویٹیشن اب تک نہیں ملا۔ کیا ہمیں 'محروم' رکھنے کا ارادہ ہے؟ (کاشی بھائی) کاشی بھائی کو اس لیے Under Braket کیا ہے کیونکہ وہی سچی کہانیاں کے ایڈیٹر ہیں۔ اور منزہ آپ بھی یقیناً یہی کہیں گی کہ اس معاملے میں کاشی بھائی سے رجوع کیا جائے۔ اس تقریب کا شدت سے انتظار ہے۔ آپ سب سے ملنے کی کوئی راہ تو نکلی۔ اللہ کرے کہ اُس دن بلکہ ہمیشہ حالات سازگار اور طبیعتیں خوشگوار رہیں' آمین۔ منزہ جی اس بار رسالے پر تبصرہ نہ لکھ پاؤں گی کیونکہ مکمل مطالعہ نہیں کر پائی۔ ذہن مسلسل سوئی گیس کی قلت پر اُلجھتا بھٹکتا رہا۔ کچھ موسم کی شدت اور دانتوں شکست و ریخت نے پریشان رکھا۔ انشاء اللہ اگلی بار مکمل تبصرے کے ساتھ حاضرِ محفل دوشیزہ رہوں گی۔ سبھی ساتھیوں کو میرا اسلام عرض ہے۔ آپ بھی بخیریت و عافیت عازمِ لاہور ہوں اور انجام بخیر ہر مرحلہ پایہ تکمیل تک پہنچے آمین۔ اپنا بہت خیال

مبارک باد

ہماری ہردل عزیز لکھاری ساتھی سکینہ فرخ گزشتہ ماہ ایک پیاری سی نواسی کی نانی بن گئیں۔ادارہ سکینہ فرخ کو خوشی کے ان لمحات میں مبارکباد پیش کرتا ہے اور نومولود کی درازیٔ عمر اور صحت کی دعا کرتا ہے۔

رکھیے گا۔ آنٹی رخسانہ کو بہت سلام کہیے گا۔ زین اور دانیال کے لیے بہت سی دعائیں ہمیشہ شاد و کامران رہیں' آمین۔کاشی بھائی اور اسٹاف کے تمام ممبرز کو سلام۔

ھ: سوئٹ زمر! ہم سب کے لیے ایک دوسرے کی محبت آکسیجن کا ہی تو کام دیتی ہے اور جہاں تک سچی کہانیاں ایوارڈز کے دعوت نامے کا تعلق ہے تو زمر اپنے گھر آنے کے لیے بلاوہ تھوڑی چاہیے ہوتا ہے ہم تو ایک فیملی ہیں تکلفات میں کیسا پڑنا۔اپنی صحت کا خیال رکھو سب سے قیمتی شے زندگی کے بعد یہ ہی ہے۔باقی گیس' بجلی' بے ایمانی' بے سکونی کس کس کو روئیں لہٰذا بہتر ہے سب پر لعنت بھیجو' قسط موصول ہوگئی ہے مجھے تو تمہارے کرداروں کے درمیان رہنے میں بہت مزہ آرہا ہے۔اگلے ماہ تمہارے تبصرے کا انتظار کروں گی امی تک سلام پہنچا دیا ہے وہ بھی جیتی رہو کہہ رہی ہیں۔

⋈: کراچی سے تشریف لائی ہیں فرح اسلم لکھتی ہیں۔اس کڑاکے کی سردی میں جذبات کی آنچ سے سجا دوشیزہ پڑھنا بہت اچھا لگا۔مایہ ناز قلم کاروں کے نام فہرست میں دیکھ کر دلی خوشی ہوئی سارے افسانے اور ناولٹ بہترین رہے۔بے بی اور باربی (صبیحہ شاہ) عزیزہ خالہ (رضوانہ پرنس) اور دل کے لاکرز (غزالہ رشید) میں اس بار کانٹے کا مقابلہ رہا۔رضوانہ پرنس کی تحریر نے تو جیسے آئینہ ہاتھوں میں تھما دیا۔کیا زبردست خیال تھا۔لفظ لفظ دل میں ترازو ہوگیا۔بے بی اور باربی میں صبیحہ شاہ نے عورت کی نفسیات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔غزالہ رشید نے دل کے لاکرز میں چھپی محبت کی دولت کی مہک لفظوں کے ذریعے صفحہ قرطاس پر بکھیر دی ہے۔الماس روحی کی رومانیت میں قاری کو خوابوں کی دنیا سے باہر لاکر حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔بہت اچھا افسانہ لگا۔دیوانگی عشق میں نفیسہ سعید کے افسانے نے بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کردیا واقعی بعض نام ایسے ہوتے ہیں کہ اندازہ نہیں ہوپاتا موصوف ہیں یا موصوفہ......اور پھر اماں کا اندازِ ذکر......واہ واہ کیا کہنے۔زبردست نفیسہ سعید خوش رہو......ناولٹ میں درد یہ لا دوا نہیں نزہت جبیں ضیاء اور تجدید وفا پھر......تحسین انجم انصاری دونوں قابل تعریف ہیں۔دونوں کے موضوعات' انداز تحریر اور انتخابات الفاظ سب بہترین تھا۔مکمل ناول میں لوٹرائی اینگل (مریم) نے حسب معمول خوبصورتی سے تحریر کیا۔باقی تمام سلسلے زبردست رہے۔سلسلے وار کہانیاں اچھی جارہی ہیں۔بازگشت میں اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر طلعت اخلاق کی تحریر پڑھ کر بہت اچھا لگا۔منزہ طلعت احمد کو واپس لائیے' انہوں نے کب سے دوشیزہ کے لیے کچھ نہیں لکھا۔جیسی من موہنی وہ خود ہیں ایسی ہی اُن کی تحریریں لگتی ہیں۔نئے لہجے نئی آوازیں......عائشہ نور کی 'ادارک' اور فریدہ جاوید فری کی 'رکھنا پڑتا ہے' دونوں کی شاعری زبردست رہی۔شعبان کھوسہ کے وطن کے لیے جذبات قابل تحسین تھے۔وقت پر تبصرہ بھیجنے کے لیے جلدی جلدی میں خط لکھا

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

جنوری 2017 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''عزیزہ خالہ'' رضوانہ پرنس

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ

فروری 2017

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی
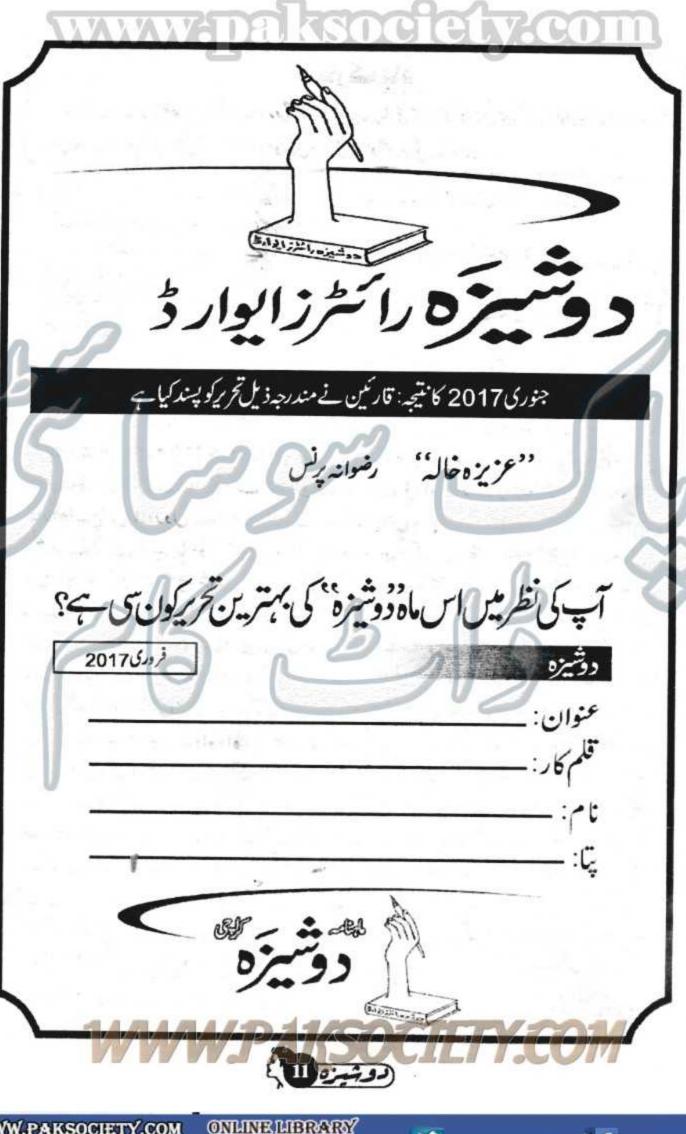
گیا ہے۔ کمی بیشی پر معذرت' منزہ خط کے ساتھ ایک افسانہ' چابک' ارسال کر رہی ہوں امید ہے پسند آئے گا۔

ٹ: بہت ہی پیاری فرح! تم نے وقت نکالا میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ 'چابک' ملتے ہی میں ڈر گئی اور سوائے پسندیدگی کہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا سوچا اگر فرح کی چابک پڑ گئی تو کیا ہوگا بس پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ شمارہ پسند کرنے کا دل سے شکریہ، یقین ہے دوشیزہ کی محفل کے لیے آئندہ بھی وقت نکالتی رہو گی۔

⋈: اور یہ کھلکھلاتی آمد ہے ہماری خولہ کی لکھتی ہیں۔ سالِ نو کی نوخیز امیدوں اور بار آور ہو جانے والی مہکتی خواہشات کے ساتھ حاضرِ محفل ہوں۔ بروقت پرچہ مِل بھی گیا اور زیرِ مطالعہ بھی آ گیا۔ پرچہ پر موجود ماڈل نے جتنی ٹھنڈک آنکھوں کو بخشی۔ اس سے کہیں زیادہ ذہن و دل کی تراوٹ کا باعث اس میں موجود افسانے اور ناول' ناولٹ ثابت ہوئے۔ لیکن اُس سے پہلے دلِ ناتواں پہ ایک سانحہ کچھ یوں گزرا کہ آپ کے خوبصورت اداریے نے سال نو کے لیے جو امیدوں بھرا خوشیوں کا چراغ روشن کیا تھا۔ وہ محفل میں قدم رنجہ فرماتے ہی دھیما پڑ گیا اور اتنا کہ چراغ تلے اندھیرے کی جگہ ہماری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ہماری غلطی کے بارے میں یقیناً آپ کو آگاہی ہو گئی ہو گی۔ اس لیے سوچا کہ اس دفعہ کا خط اپنی معذرتوں کے نام کر دیں۔ سب سے پہلے غالب سے معذرت کہ ان کا شعر پوری دیدہ دلیری کے ساتھ میر کے نام کر دیا۔ یقین کریں منزہ گھر میں شادی کے ہنگامے پھوٹے ہوئے تھے ورنہ نہ ہم (پی۔ کے) دیکھ رہے تھے نہ (پی۔ کے) لکھ رہے تھے لیکن جانے کیسے ذہن بھٹک گیا۔ پھر آپ سے معذرت کہ ہماری غلطی آپ کے لیے باعث ندامت ہوئی ہو گی۔ پھر قارئین سے معذرت کہ ہم ان کی دنیائے شعر و ادب میں سونامی لانے کا باعث بنے کیونکہ غالب کا شعر میر کے نام سے پڑھ کر تو ہمارے ذہن میں بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے تھے اور بس نہیں چل رہا تھا کہ اگلا مہینہ اگلے دن سے ہی شروع ہو جائے۔ جس میں یہ معذرت بھرا خط شامل ہو کر ہماری لاکھ رکھ لے لیکن ایک ہماری اور آپ کی بہت عزیز ادبی دوست رضوانہ کوثر نے اتنے پیار سے اصلاح شدہ شعر رات میں مسیج کیا کہ ہمیں اپنی غلطی پر ندامت کی بجائے کچھ فخر سا محسوس ہونے لگا اور دل چاہا کہ دو چار غلطیاں ہر خط میں کر کے ان کی محبت بھری سرزنش سے محظوظ ہوا جائے لیکن پھر آپ کی اور دوشیزہ کی محبت دامن گیر ہو گئی کہ آپ کو کیونکر آزمائش میں ڈالا جائے۔ مذاق برطرف امید ہے کہ سب قارئین و مبصرین و مصنفین ہماری اس غلطی کو معاف کر دیں گے۔ اس کے بعد ایک معذرت روحیلہ صاحبہ سے بھی کرنی تھی جس کا گلہ انہوں نے پچھلے مہینے کی محفل میں کیا تھا۔ اس حوالے سے کہ ان کے افسانے سنہری بٹوا پر جس شخصیت نے معصومیت سے اس کا مقصد پوچھا تھا وہ گناہگار میں ہی ہوں وہ نام بھی لکھ دیتیں تو برا نہیں مانتی لیکن ان سے مودبانہ عرض ہے کہ جملہ یہ تحریر کیا گیا تھا کہ افسانے میں اس کی مقصدیت کی وضاحت نہیں ہوتی محسوس ہوئی تھی صرف قارئین کے حوالے سے کہ ہر طبقۂ فکر اس کا مطالعہ کرتا ہے اگر رانی بھابی کے بٹوے پر گھر والوں میں سے بھی کسی کی نظر پڑ جاتی تو افسانے میں مزید جان پڑ جاتی۔ ورنہ ابتداء سے آخر تک کہانی کا اتار چڑھاؤ' جملوں کی

ادارہ پرل پبلی کیشنز کے دیرینہ ساتھی اور رفیق

سابق ایڈیٹر 'سچی کہانیاں'

'سلیم فاروقی'

اب ہم میں نہیں۔

سلیم فاروقی کی مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر کی دعا ہے۔

دکھ کی ان گھڑیوں میں ادارہ اپنے قارئین سے سلیم فاروقی کی مغفرت کے لیے بھی دعا کی اپیل کرتا ہے۔

بندش اور موضوع کے انتخاب کو اس وقت بھی سراہا تھا اس کا تعلق قطعاً ہماری معصومیت و ناسمجھی سے نہیں ہے اور نہ اس سے ان کی دل آزاری مطلوب تھی اس لیے پھر ایک بار تہہ دل سے معذرت روحیلہ ان الفاظ پر جو غلط فہمی کی بناء پر آپ کی دل شکستگی کا باعث بنے۔ منزہ قامتِ خط پر نہ جایئے گا جہاں جس جملے پہ سنسر بورڈ لگانا ہو لگا دیجیے گا اب تبصرہ بقلم خولہ بھی ہو جائے ورنہ آپ کہیں گی بہت باتیں بناتی ہوں تو جناب وہ جو کہتے ہیں نا کہ محفل لوٹ لی وہ تو ہم لوٹتے ہی ہیں...... ہاہاہا...... لیکن دوشیزہ نے اس ماہ کے تو ہمارا دل ہی لوٹ لیا۔ مزید آپ کے جواب نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے۔ زہے نصیب کہ آپ کو میری تحریر پسند آئی۔ مجھے ایوارڈ مل گیا۔ منزہ دو تین تحریریں اور بھی آپ کے پاس موجود ہیں۔ اس میں فرشتۂ رحمت اور جزا و سزا پہ ایک بار نظر ثانی ضرور کریں۔ دعا ہے اور امید ہے کہ وہ بھی آپ کو ضرور پسند آئیں گی تقریباً سال ہو گیا ہے اُن کو ارسال کیے خیر جو آپ بہتر سمجھیں ماہ وش طالب' فریدہ فری' حنا بشریٰ' ثمینہ طاہر اور زمر کو تحریر کی پسندیدگی کا شکریہ ماشاء اللہ سب ہی علم و ادب کے قبیلے کے محترم اراکین و مصنفین ہیں۔ زمر زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خواہشیں قلیل کر لیں تو خوشیاں کثیر ہو جاتی ہیں۔ کسی کی محبت کی ایک نظر حوصلہ افزائی کا چھوٹا سا جملہ امید اور کامیابی کا ایک بڑا جہاں کھول سکتا ہے۔ جتنی تحریریں خوبصورت اتنا ہی حسین آپ کا اندازِ حوصلہ افزائی شکریہ زمر۔ منزہ آپ کے اداریے کے بعد آپ کی سابقہ مدیروں کے ساتھ احوالِ دعوت کی تعریف کروں یا اس ویرانی کی اداسیاں رقم کروں جو آپ کے دوشیزہ گلستاں میں تحریر لفظوں نے معاشرے کی غیر منصفانہ مزاج کی عکاسی کر کے حقیقتاً ہمارے اندر درد کی صورت پھیلا دیں۔ پھر اسماء کے لائف بوائے نے اپنی کہانی کے سحر میں جکڑ لیا۔ صبیحہ شاہ نے بے بی سے باربی تک کے سفر کو بے انتہا خوبصورتی سے رقم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف سراہنا کافی نہیں ہوتا کسی کے ساتھ ہماری جذباتی وابستگی اور اس کی توجہ بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ رضوانہ پرنس کا عزیزہ خالہ بھی حاسدانہ جذبے کی عکاسی کرتا عمدہ افسانہ تھا۔ غزالہ رشید کا دل کے لاکرز' الماس روحی کا رومانیت اور نفیسہ سعید کا دیوانگیٔ عشق بھی متنوع موضوعات اور بہترین اسلوبِ نگارش کی عکاسی کرتی تحریریں تھیں۔ ناولٹ درد لا دوا اور تجدیدِ وفا پھر دونوں اپنے مصنفین کی خوبصورت کاوش کا نمونہ تھیں۔ نزہت اور تحسین کو بہت بہت مبارک ہو۔ مریم کا لوٹرائی اینگل اچھوتا ٹاپک اور خوبصورت اندازِ تحریر کہ ناقابل یقین بات پر بھی یقین کا گماں لگتا ہے۔ زمر اور رفعت کا ناول بہترین انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں ہی باریک بینی سے واقعات کے تمام جزئیات کو موزوں اور ماموقع جملوں کے استعمال سے چار چاند لگا دیتی ہیں۔ حالات و واقعات آگے پیچھے کے سب پر اچھی گرفت نظر آتی ہے۔ نسرین اختر کا ناول بھی خوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور سب سے خوبصورت بلکہ دوشیزہ کی جان جو تحریر تھی وہ بازگشت کی طلعت صاحبہ کی لگی کیا احساسات کی ترجمانی کرتے جملے تھے واہ...... انسانی خیر و شر کی بہترین جملوں کے ساتھ روح میں اتر جانے والی حقیقت کی عکاس تحریر تھی ایک اور جنم داتا' اندازِ تحریر کی تعریف کروں یا موضوع کی بہت عمدہ بہت خوب' ویسے منزہ بہت بہت بہت...... عمدہ تحریریں پڑھنے کا

موقع ملا سب کو مصنفین کو ہماری طرف سے مبارک باد دیجیے گا اور زندہ دلانے لاہور کا شکریہ کہ انہوں نے محفل کو رونق بخشی۔ ہر لحہ آپ کی اور دوشیزہ کی صحت' ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو اور ایک غزل کے ساتھ اجازت دیں۔

ﮪ: ڈیئر خولہ غلطی تو انسان سے ہی ہوتی ہے مگر خوبصورت بات یہ ہے کہ محفل پڑھنے والے کتنی توجہ اور دلچسپی سے ہر خط پڑھتے ہیں کہ تمہاری غلطی بھی پکڑلی...... تمہاری مبارک باد مصنفین تک پہنچا دی ہے۔ اس یقین کے ساتھ طلعت اخلاق کو آواز دے رہی ہوں کہ اب میرے ساتھ ساتھ انہیں اور بھی بہت لوگ یاد کررہے ہیں تو طلعت چلی آیئے یہ آپ کی اپنی محفل ہے اور ہم دل کی آنکھوں سے آپ کے منتظر۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں مسز نگہت غفار لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ تم نے بہت ہی اچھی بات کی ہے بیشک ان رویوں کی اذیت یہ تکالیف یہ دکھ بوجھ' اگر اپنوں نے دی ہے بالکل اپنے سگے لوگوں نے تو پھر یہ اذیت...... یہ تکالیف یہ دکھ اور بھی شدید ہوجاتا ہے۔ متاثرہ شخص ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے کرچی کرچی ہوجاتا ہے ایسے میں ''جی'' کرآنے والے کل کا انتظار کرنا کہ وہ خوشی لے کر آئے گا ہے تو مشکل لیکن ناممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے آمین۔ منزہ آپ سے التماس ہے کہ اس محفل کو وسیع کریں بہت ہی محدود ہے۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کا انتظار ہے بہت شدت ہے۔ بہت ہی پیارے بیٹے کاشی ہزاروں برس جیو...... بیٹا ذرا کان اِدھر لاؤ...... ارے نہیں پکڑوں گی نہیں کچھ کہنا ہے چند میسج کا جواب ہر بار دے دیا کرو نا...... اور ہاں بہت بہت مبارک ہو۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ آنے والا پڑھ کر بے انتہا مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ تم کو ہمت عطا فرمائے تمہاری محنت اور جانفشانی ضرور رنگ لائے گی انشاء اللہ تعالیٰ بہت کامیاب تقریب ہوگی۔ اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے ہم تمہاری کیا مدد کرسکتے ہیں؟ جواب ضرور دینا عامر محمود کی والدہ کا سن کر دکھ رب کائنات مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے آمین۔ دردانہ نوشین' فرح انیس کی تحریر' آگہی' سبق آموز کہانی تھی اَن کہا دکھ' کڑی دھوپ اچھی کہانیاں تھیں باقی قسط وار کہانیوں کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ دوشیزہ گلستاں میں روشن' طاہر علی' تبسم' غزالہ پروین' افشاں' ماہرہ' رافعہ کی تحریریں اچھی تھیں۔ نئے لہجے میں فصیحہ' فریدہ فری' شبانہ تبسم کے لہجے اور آواز دونوں ہی خوبصورت لگے۔ دوشیزہ گلستاں نئے لہجے نئی آوازیں میں میری تحریروں کی اشاعت پر آپ کا بے حد شکریہ۔ اللہ آپ کو ہزاروں خوشیاں نصیب کرے آمین۔ پیاری منزہ میں اپنے بیٹے فہد کی شادی کا احوال بھیج رہی ہوں امید ہے کہ آپ شائع کریں گی اب اجازت چاہوں گی اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی فیملی اور دوشیزہ کی فیملی کو اپنی حفظ امان میں رکھے آمین۔

ﮪ: بہت اچھی نگہت! آپ کے بیٹے کی شادی کا احوال کیوں نہیں شائع کروں گی۔ یہ آپ کا ہی تو دوشیزہ ہے حالانکہ آپ نے مجھے دعوت نہیں دی تھی چلیں کوئی بات نہیں...... کاشی کے تو کان مجھے کھینچنے ہیں آجائیں ذرا لاہور سے واپس...... آپ کی محبت کا بہت شکریہ بس دعا کیجیے کہ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ خیریت سے ہوجائے۔ دوشیزہ گلستان میں اس بار آپ بھی شامل ہیں امید ہے آئندہ بھی خوبصورت یادداشتیں ارسال کریں گی۔ آپ کی پسندیدگی مصنفین تک پہنچا دی ہے۔

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا

کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو

ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ

سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

✉: دبئی سے آمد ہوئی ہے تسنیم منیر علوی کی لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ' ڈھیروں دعائیں اور پیار قبول ہوں۔ آج ایک عرصے کے بعد مخاطب ہوں۔ وہ اس لیے کہ یہاں ہم تک پرچہ بہت دیر سے پہنچ جاتا ہے۔ ہم نے دو تین خط لکھے مگر شاید تاخیر کے باعث وہ آپ نے لگائے نہیں۔ پھر یوں بھی ہوا کہ ہمارا ایک افسانہ...... بہت پرانا...... کوئی سات آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے ہوگی۔ جب وہ نہیں لگا تو ہم نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ موصول نہیں ہوا۔ ہم نے تو رجسٹری بھیجی تھی۔ بہرحال اب دوبارہ ارسالِ خدمت ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں جگہ پاسکے تو عنایت ہوگی۔ اس وقت نئے سال کی آمد...... آمد ہے اس لیے تمام اراکین کو' سال نو مبارک' تبصرہ کر نہیں سکتے کیونکہ زیرِ نظر نومبر کا شمارہ ہے۔ اس لیے معذرت...... امید ہے اب طبیعت ٹھیک ہوگی آفس سے معلوم ہوا تھا کہ طبیعت ناساز ہے۔ یہاں بھی موسم کی تبدیلی کے ساتھ...... طرح طرح کے فلو پھوٹ پڑے ہیں اور ہر شخص کھانس یا چھینک رہا ہے بہرحال یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔ اللہ حافظ۔

ﷺ: ڈیئر تسنیم! آپ نے دوشیزہ کی محفل کے لیے وقت نکالا بہت اچھا لگا انشاءاللہ جلد آپ کی تحریر شمارے کا حصہ ہوگی۔ اللہ ہماری ٹیلی فون آپریٹر کو اچھا رکھے جتنا وہ مجھے بیمار رکھتی ہیں کوئی اور یہ جرأت کر نہیں سکتا میں اکثر کہتی ہوں شبانہ کبھی انسان یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ میڈم سیٹ پر نہیں' آج آئی نہیں ہیں ہر بار آپ مجھے بیمار کیوں کر دیتی ہیں چلیں اس بہانے آپ سب میری خیریت پوچھ لیتے ہیں۔ خوش رہیے اور محفل میں ضرور شرکت کیا کریں۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں فرحی نعیم لکھتی ہیں۔ میں پچھلے چند سالوں سے مختلف اخبارات و رسائل میں لکھ رہی ہوں۔ اور اب آپ کے ادارے سے بھی جڑنا چاہتی ہوں۔ ایک کہانی ارسال کررہی ہوں۔ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو بہرحال آپ ہی کریں گی۔ لیکن امید کرتی ہوں کہ اس کی نوک پلک سنوار کر آپ مجھے اپنے کثیر الاشاعت رسالے کی قلم کاروں کی فہرست میں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ آپ اور آپ کے ادارے کے افراد کی محنت رسالے کے ہر ہر صفحے سے جھلکتی ہے۔

ﷺ: سوئٹ فرحی! آپ کا افسانہ موصول ہوگیا انشاءاللہ جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔ آپ کی آمد مجھے بہت اچھی لگی۔ امید ہے کہ یہ روابط برقرار رہیں گے۔

✉: ثمینہ طاہر بٹ لاہور سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم منزہ جی۔!! حسب وعدہ دوشیزہ کی پیاری محفل میں حاضرِ خدمت ہونگی۔ اور آپ سب کی سلامتی، صحت اور تندرستی کے لیئے دعا گو ہوں۔ اللہ رب العزت آپ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور دنیا و آخرت کی خوشیاں اور بھلائیاں آپ سب کا نصیب بنائے اور ہمارا بھی۔ آمین ثم آمین۔ اور جی۔ آپ سچی کہانیاں کا پہلا رائٹرز ایوارڈ لاہور میں منعقد کروا رہے ہیں۔ سو بسمہ اللہ جی۔ ہم دیدہ دل فرشِ راہ کیے آپ سب کے منتظر ہیں۔ منزہ جی، آپکی ہمشیرہ محترمہ کی صحت یابی کا پڑھا۔ دل بہت خوش ہوا۔ الحمد اللہ۔ اللہ پاک انہیں کاملہ و عاجلہ صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔ آمین اور اب آتی ہوں جنوری کے دوشیزہ کی طرف۔ نئے سال کا

پُراسرار کہانی نمبر

خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں‘

ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں‘

فراعنہ کی سرزمین سے‘

اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستانِ حیرت‘

پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طلسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں

جو آپ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

تو پھر دیر کس بات کی ہے......

ماہِ مارچ میں ’پُر اسرار کہانی نمبر‘ کی کاپیاں آج ہی بک کرالیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

Email : pearlpublications@hotmail.com

سچی کہانیاں کا مارچ 2017ء کا شمارہ ’پُر اسرار نمبر‘ ہوگا

پہلا شمارہ اپنے روائتی انداز میں جلوہ گر ہوا اور کیا خوب ہوا۔ ماشاللہ، سرِ ورق سے لیکر چمن کا رنز تک سب ہی لاجواب تھا۔ سرورق کی حسین نازنین کو دل کھول کر سراہتے ہوئے اندرونی صفحات کی طرف بڑھے اور سارے اشتہارات کو سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے منزہ جی کے ''روشن صبح'' کا دیدار کیا۔ واہ، بہت خوب، کیا بات کی ہے منزہ جی آپ نے، واقعی، ہر نیا سورج ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اس گذرتے وقت کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے اعمال کا از خود جائزہ لیں اور اپنا احتساب خود کرتے ہوئے خود کو راہ راست پر لے آئیں۔ بس، اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ دوشیزہ کی محفل بھی خوب سجی تھی۔ ماشاللہ پیارے پیارے چمکتے ستارے سب ایک جگہ جمع خوب جھلملا رہے تھے۔ سب کی خدمت میں سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ ''یاسر نوابلوچ'' سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ اللہ اس حسین جوڑے کا ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور ڈھیروں کامیابیوں سے نوازے۔ آمین۔ دوشیزہ کے سب ایڈیٹرز کے اعزاز میں ہونے والے لنچ کا احوال اور تصاویر بہت اچھا رہا۔ اپنے سب پسندیدہ مصنفین اور ایڈیٹرز کو ایک جگہ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ سلامت رہیں۔ خوش رہیں۔ ''اسما اعوان'' کی ''لائف بوائے کہانی'' ہمیشہ کی طرح خوب تھی۔ ویلڈن اسماء۔ ''نئے برس میں دوشیزہ اور آپ ساتھ ساتھ۔'' جی جناب۔ برس نیا ہو یا پرانا، ہم سب ہمیشہ ایکساتھ رہیں گے انشاللہ۔ سروے میں سب ساتھیوں سے ملکر بہت بہت اچھا لگا۔ جزاک اللہ خیر۔ اللہ پاک سب کو اپنی امان میں رکھے۔ مستقل ناولز دونوں ہی بہت اچھے جارہے ہیں۔ ماشاللہ رفعت آپا اور زمر نعیم دونوں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ جزاک اللہ۔ ''صبیحہ شاہ'' کا ''بے بی اور باربی'' اچھی کاوش رہی۔ سچ ہے، ایک وقت آتا ہے کہ بچے بھی بڑوں کے مسائل سمجھنے اور انہیں راستہ دکھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ویری ویلڈن صبیحہ۔ ''غزالہ رشید'' کا ''دل کے لاکرز'' ایک اچھی کاوش۔ سچ ہے جی، دل کے لاکر میں ایکبار جو تصویر سج جاتی ہے، اسکاری پلیس ہونا ناممکن ہی ہوتا ہے۔ بہت خوب غزالہ، بہت خوب۔ ''ام مریم'' کا ''لوٹرائی اینگل'' محبتوں کی چاشنی میں گندھا خوب صورت ناول۔ ام مریم کا مخصوص رنگ بیان اس میں جھلک رہا تھا۔ اپنی شادی کے بعد ام مریم دوشیزہ کے لیئے اتنا خوبصورت تحفہ لائیں۔ شکریہ ام مریم۔ اللہ رب العزت آپکو اپنے گھر میں خوش ع خرم رکھے اور آپ زندگی کے اس نیئے سفر میں بہت کامیابیاں و کامرانیوں سمیٹیں۔ آمین۔ ''رضوانہ پرنس'' کا ''عزیزہ خالہ'' معاشرتی رویئوں پر لکھے جانے والی خوب صورت تحریر۔ رضوانہ نے سچ ہی کہا کہ یہاں سب کے اندر کہیں نہ کہیں ایک آدھی ''عزیزہ خالہ'' براجمان ہوتی ہیں اور وقت ملتے ہی اچک کر باہر آ جاتی ہیں۔ بہت اچھے رضوانہ۔ بہت خوب۔ ''نسرین اختر نیناں'' کے ''سپنے سہانے'' ابھی آنکھوں میں سج رہے ہیں۔ جب مکمل ہو جائیں گے تو تبصرہ بھی تب ہی مکمل ہو پائے گا۔ اوور آل منی ناول ''سپنے سہانے'' بہت اچھا جارہا ہے۔ ''نزہت جبین ضیا'' کا ناولٹ ''یہ دردلا دوا نہیں جاناں'' مردوں کی روائتی سوچ اور سفا کی کا مظہر تھا۔ نزہت نے بہت اچھا لکھا ماشاللہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ''نفیسہ سعید'' کا ''دیوانگیِ عشق'' ہلکی پھلکی تحریر بہت مزہ دے گئی۔ سچ ہے غلط فہمیوں کی بنیاد پر بعض اوقات ایسے ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں

سچی کہانیاں کا ''مختصر کہانی نمبر''

عام شماروں سے قطعی مختلف ومنفرد ایک معرکۃ الآرا شمارہ

''مختصر کہانی نمبر''

ہم وہاں تک رسائی رکھتے ہیں

جہاں عام سوچ کی پہنچ نہیں

آپ کے پسندیدہ لکھاریوں کی اعلیٰ پائے کی کہانیوں سے سجا......

''مختصر کہانی نمبر''

بہت جلد آرہا ہے

مختصر کہانی نمبر میں اپنی تخلیقات اس طرح ارسال کریں کہ 30 مارچ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

سچی کہانیاں کا ''ایوارڈ نمبر''

سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی تقریب 26 جنوری 2017ء کو قذافی اسٹیڈیم کے پنجابی کمپلیکس میں شان وشوکت کے ساتھ انجام پائی۔

ایوارڈ تقریب کی مکمل روداد ایوارڈ پانے والے لکھاریوں کے تاثرات اور تقریب کے یادگار لمحات کی مکمل تفصیل اور تصویری جھلکیاں، سچی کہانیاں کے ایوارڈ نمبر میں شائع کی جائیں گی۔

انشاء اللہ ماہ اپریل 2017ء کا شمارہ سچی کہانیاں کا ایوارڈ نمبر ہوگا۔

(لکھاری ساتھیوں سے گزارش ہے کہ اپنے تاثرات اس طرح ارسال کریں کہ 25 فروری تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔ سچی کہانیاں کا ماہ اپریل کا شمارہ ''ایوارڈ نمبر'' ہوگا۔

کہ انسان صرف سوچتا ہی رہ جاتا ہے۔ ویری ویلڈن نفیسہ۔ ''ڈاکٹر الماس روحی'' کا ''رومانیت'' ایک تلخ مگر کڑوی ترین حقیقت۔ بعض لوگ بھی ہاتھی دانت جیسی ہی خصلت رکھتے ہیں۔ کھانے کے اور، اور دکھانے کے اور۔ راحت شاہ کا کردار بھی ایسا ہی تھا۔ بہت اعلیٰ۔ ''تحسین انجم انصاری'' کا ناولٹ ''تجدید وفا پھر'' بلاشبہ اس ماہ کی بہترین تحریر ٹھہری۔ تحسین نے ایک بے حد حساس موضوع پر قلم اٹھایا اور بہت خوبصورتی اور روانی سے اس مسئلے کو احاطہ تحریر میں لائیں۔ باقی سب بھی بہت اچھا تھا۔ اوور آل جنوری کا دوشیزہ بہترین رہا۔ امید ہے کہ جس طرح نئے سال کا پہلا شمارہ بے مثال تھا، اسی طرح آئندہ آنے والے سب شمارے بھی بے مثال ہوں گے۔ انشاءاللہ۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔ منزہ جی، میں ویلنٹائن کے حوالے سے ایک چھوٹی سی تحریر میل کر رہی ہوں۔ پسند آئے تو جگہ ضرور دیجئے گا۔ فی امان اللہ۔

☜: پیاری ثمینہ! تمہاری یہی ادا تو بھاتی ہے کہ تم وعدے کی پکی ہو تمہاری تحریر مل گئی ہے انشاءاللہ فروری کے شمارے میں شامل ہوگی۔ ہر تحریر کو اتنی توجہ سے پڑھنے کا شکریہ مجھے بھی یقین کہ اس سال بھی تمہارا اور ہمارا ساتھ بنا رہے گا' خوش رہو۔

✉: بالکل آخری لمحوں میں شریف لائے ہیں بھائی بلال فیاض ملتان سے لکھتے ہیں۔ ڈیئر منزہ آپی! السلام وعلیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گی۔ سب سے پہلے 'اُف یہ محبت' کی اشاعت کا بے حد شکریہ (اعزازیہ دسمبر 2016 میں موصول ہو گیا تھا، بہت شکریہ) اکتوبر 2016 کے شمارے میں آپی رضوانہ کوثر کا خط پڑھا، سیروں خون بڑھ گیا، رضوانہ آپی! آپ نے مجھے یاد رکھا، آپ کی یہ رائے میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ خولہ عرفان اور سکینہ فرخ نے میری تحریر پر رائے دی بے حد خوشی ہوئی، شکریہ۔ سال 2017 کا پہلا شمارہ ''سالگرہ نمبر'' کی صورت میں دلکش سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ سب سے پہلے، ہمیشہ کی طرح آپ کا بے حد خوبصورت انداز میں لکھا گیا اداریہ پڑھا، دعا ہے کہ آپ کے لیے اور ادارے کے لیے سال 2017 مبارک ثابت ہو۔ دوشیزہ کی محفل ہمیشہ کی طرح پُر بہار تھی۔ ایڈیٹرز کے اعزاز میں دی گئی ضیافت کا احوال پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ تصاویر کے ساتھ لکھے کمنٹس بہت دلچسپ تھے۔ اسما اعوان ہر بار کی طرح اس بار بھی لائف بوائے سے جڑی ایک دلچسپ کہانی لے کر آئیں۔ نئے برس کے حوالے سے 'سروے' نے سال گرہ نمبر کو چار چاند لگا دیئے۔ تمام افسانے ایک سے بڑھ کے ایک تھے۔ صبیحہ شاہ کا افسانہ 'بے بی اور باربی' (خوبصورت یادوں سے سجا) بے حد دلچسپ تھا، اتنا مزہ تو فیس بک یوز کر کے نہیں آتا جتنا افسانہ پڑھ کے آیا۔ غزالہ رشید کا ہلکا پھلکا افسانہ مزہ دے گیا، اختتام پسند آیا۔ نفیسہ سعید کا 'دیوانگی عشق'، رضوانہ پرنس کی 'عزیزہ خالہ'، ڈاکٹر الماس روحی کا 'رومانیت'، دلچسپ اور پُر اثر افسانوں نے سالگرہ نمبر کا لطف دوبالا کر دیا۔ اُم مریم ایک بھرپور مکمل ناول کے ساتھ موجود تھیں، اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد۔ پیاری آپی نزہت جبیں ضیا کا ناولٹ 'درد یہ لا دوا نہیں' دلچسپ تھا۔ تحسین انجم انصاری کا ناولٹ 'تجدید وفا پھر' قابل

تعریف ہے۔ بازگشت کا سلسلہ زبردست ہے، طلعت اخلاق احمد کے افسانے ’اک اور جنم داتا‘ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مستقل سلسلے حسب معمول اچھے لگے۔ اب اجازت چاہوں گا۔ ’’توازن‘‘ کی اشاعت کا انتظار ہے۔ دعاؤں کے ساتھ۔ خدا حافظ

٭: اچھے بلال بھائی...... آپ کی محفل میں شرکت بہت اچھی لگی وقت نکال کر پابندی سے شریک ہوا کریں۔ شمارہ آپ کو پسند آیا یقین جانیں میری محنت ٹھکانے لگی۔ آپ کا افسانہ کمپوز ہو چکا ہے جلد شائع کروں گی۔ خوش رہیے۔

✉: ساہیوال سے تشریف لائی ہیں نیرّ شفقت لکھتی ہیں۔ محترمہ منزہ سہام! السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ دوشیزہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ہر ماہ یہی سوچتی کہ رسالہ جلد پڑھ لوں تاکہ تبصرہ ٹائم پر بھیج سکوں مگر کبھی رسالہ پڑھنے میں سستی ہوتی تو کبھی تبصرہ لکھنے میں آج ہمت تو کرلی ہے مگر لگتا ہے پھر دیر ہوگئی ہے۔ بہرحال میں تو اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔ سب سے پہلے رفعت سراج کا دامِ دل پڑھا۔ اچھا جا رہا ہے لیکن رفعت جی معذرت کے ساتھ کہ یہ ناول اس پائے کا نہیں جو آپ پہلے لکھا کرتی تھیں۔ ایک ایک حرف گویا موتی جڑے ہوئے ہوں۔ کیا اب گھرداری میں زیادہ گھر گئی ہیں۔ بے بی اور باربی سوشل میڈیا کے ساتھ اچھی تحریر رہی۔ دل کے لاکرز نے مزہ دیا۔ لوٹرائی اینگل ایک بہت بورناولٹ رہا۔ اُم مریم سے معذرت کے ساتھ یہ آپ کی تحریر نہیں لگ رہی۔ رحمن رحیم سدا سائیں جیسی تحریر کے بعد ایک پھسپھسے موضوع پر بچکانہ تحریر محسوس ہوئی۔ رضوانہ نے عزیزہ خالہ کی بالکل صحیح عکاسی کی۔ یقیناً ہم سب کے اندر ایک عزیزہ خالہ ضرور چھپی ہوئی ہیں۔ نزہت جبیں کا ناولٹ اچھا لگا۔ اختتام خوب رہا۔ دیوانگیٔ عشق مزے کی تحریر تھی پڑھنے والوں کے چہرے پر یقیناً مسکراہٹ بکھر گئی ہوگی۔ رومانیت انتہائی غیر رومانیت ثابت ہوئی۔ وہی کنگلے شرابی شاعر اور اس کے پیچھے کم عمر پاگل لڑکی‘ آج کے دور میں سوچیں تو عجیب لگتا ہے۔ تجدیدِ وفا بہت اچھے موضوع پر بہت اچھی تحریر تھی۔ ویل ڈن تحسین جی...... بازگشت نے ایک بار پھر وہی مزہ دیا جو پہلی بار کہانی پڑھ کر آیا تھا۔ ویسے یہ طلعت ہوتی کہاں ہیں...... زمر سے ابھی معذرت...... باقی مستقل سلسلے بھی بہترین تھے۔ اے آر وائی والوں نے اپنی خبریں نہیں دیں اس مرتبہ (ہاہاہاہا) افسانہ بھیج رہی ہوں۔ دیکھ لیجیے گا۔ عائشہ پوچھ رہی میری کہانی کا کیا بنا؟ کتنے مہینوں سے ایوارڈ تقریب کے چرچے سن رہے ہیں اب بتا بھی دیں کہ کب ہو رہی ہے۔ لاہور کا دعوت نامہ کو ضرور بھیجیے گا۔ عائشہ بھی Excited ہو رہی ہے جانے کے لیے رخسانہ آنٹی کا کیا حال ہے۔ دوشیزہ کے سب دوستوں کو سلام اور دعائیں۔ ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی (جھوٹا) وعدہ کہ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی۔

٭: اچھی نیرّ! دوشیزہ کی محفل میں آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ محفل کا اختتام لکھ رہی تھی جب آپ کا خط ملا۔ دعا کیجیے کہ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ اپنی اُسی شان وشوکت کے ساتھ کرسکوں جو اس تقریب کا خاصہ ہے‘ عائشہ کا افسانہ بھی جلد شائع ہو گیا اور ہاں وعدہ پکا والا کریں تب مزہ آئے گا۔ آپ کی تنقید اور تعریف مصنفین تک پہنچادی ہے۔ امی خیریت سے ہیں۔ اگلے ماہ بھی آپ کی منتظر رہوں گی۔

اس آخری خط کے ساتھ اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اِس رنگا رنگ محفل میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ خوش رہیے اور خوش رکھیے۔ اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

سوہائے علی ابڑو

اداکارہ، ماڈل اور ڈانسر

ذیشان فراز

آج آپ کی ملاقات کروائیں گے مشہور ماڈل، ایکٹرس اور ڈانسر سوہائے علی ابڑو سے......

انتہائی نازک، دھان پان سی اس لڑکی کو دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کے کتنے مشکل دور سے گزری ہے...... 13 مئی 1993ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہونے والی بچی اداکاری اور ماڈلنگ میں اتنا بڑا نام کرے گی شاید کسی کو یقین نہ ہو......مگر اپنی انتھک محنت کے بل بوتے پر سوہائے علی آج پاکستانی شوبز انڈسٹری کا ایک جانا مانا نام ہے۔

س: سوہائے آپ کا اپنا ایک منفرد اسٹائل ہے۔ جس میں آپ بہت مطمئن نظر آتی ہیں وجہ؟

ج: سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں کسی سے مرعوب نہیں میں اپنے کام میں انفرادیت رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی ہی غلطیوں سے سیکھتی ہوں۔

س: ''جوانی پھر نہیں آنی'' کے بعد آپ کہاں غائب ہوگئی تھیں؟

ج: میں دن رات کام کر کے اس قدر تھک گئی تھی کہ اسپتال میں داخل رہی مجھے مکمل طور پر Recover کرنے میں 6 ماہ لگے۔

س: لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں کیسا لگتا ہے؟

ج: مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوتی ہے کیونکہ ایک وقت تھا جب لوگ مجھے نفرت سے حقارت سے دیکھتے تھے' چھوٹے قد کی' کالی' موٹی بھدی سب کہتے تھے۔ میں اس مشکل دور کو سوچنا بھی نہیں چاہتی۔

س: کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

ج: میں صرف 9 سال کی تھی جب میرے والدین کا انتقال ہو گیا۔ دونوں ڈاکٹر تھے اور ہم 3 بہن بھائی' والدین کے بعد سب بکھر گئے مجھے نہیں پتہ اب میرے بہن بھائی کہاں ہیں۔ بس بچپن تیرے میرے گھر میں گزارا۔ جیسے یتیم بچوں کا گزرتا ہے۔ مگر میں نے بہت چھوٹی عمر میں سوچ لیا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں گی۔ مجھے روتی دھوتی عورتیں زہر لگتی ہیں۔

س: ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی سپورٹ بہت کامیابی دلاتی ہے آپ کی زندگی میں وہ کون ہے؟

ج: مجھے فخر ہے کہ میں ہمایوں سعید جیسے دوست رکھتی ہوں اُن کی اور اُن کی فیملی کی سپورٹ نے مجھے کبھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔

س: یہ فیصلہ کب کیا کہ ڈرامہ کرنا ہے؟

ج: یہ فیصلہ تو بچپن میں ہی ہو گیا تھا جب میں اسکول میں ڈرامہ سوسائٹی کی ممبر بنی۔ میں نے تھیٹر بھی کیا یوں مجھے خود اپنے ٹیلنٹ کا اندازہ ہو گیا۔

س: فارغ وقت کیسے گزارتی ہیں؟

ج: سچ پوچھیں تو مجھے فارغ رہنا بالکل پسند نہیں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ جیسے Sos ویلج جا کر کام کرتی ہوں۔ الہدیٰ کی بھی کلاسز لیتی رہتی ہوں۔

س: خاموش رہتی ہیں یا غصہ کا اظہار کرتی ہیں؟

ج: میں بہت منہ پھٹ ہوں جو بات بری لگے فوراً کہہ دیتی ہوں۔ بہت ضدی بھی ہوں جو فیصلہ کر لوں پھر تبدیل نہیں کرتی چاہیے کچھ بھی ہو جائے۔

س: اچھا یہ بتائیں آپ رقص بہت اچھا کرتی ہیں، اداکاری بہت اچھی اور حقیقت سے قریب کرتی ہیں۔ خود رقص اور اداکاری میں زیادہ کس کو پسند کرتی ہیں۔

ج: مجھے رقص سے جنون کی حد تک عشق ہے بڑی عجیب بات ہے کہ خوش ہوتی ہوں تب بھی ناچتی ہوں اور غمگین ہوتی ہوں تب بھی......

س: کیا آپ نے رقص کی باقاعدہ تربیت لی ہے؟

ج: جی میں نے کتھک کی تربیت PACC سے لی ہے۔

س: آپ ڈراموں میں بہت کم نظر آتی ہیں کیوں؟

ج: آپ اس کو میری اچھی عادت کہیں یا بری میں بہت Choosy ہوں اسکرپٹ دیکھ کر حامی بھرتی ہوں۔

س: کیسے کردار کرنا پسند کرتی ہیں؟

ج: مجھے مضبوط عورت کا کردار کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ عورت جو دنیا سے لڑ کر اپنی جگہ بناتی ہے۔ جس کو دیکھ کر لوگ گھبرائیں ایسے کردار مجھے اچھے لگتے ہیں۔

س: ایسے کون سے انسانی رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟

ج: لفظ دکھ تو میں نے اپنی ڈکشنری سے نکال دیا ہے ہاں لوگوں کے رویے کا دوغلہ پن زہر لگتا ہے۔ اپنی بہنوں کو بے شمار مردوں کے سامنے شادیوں پر لہنگا چولی پہنا کر ناچنے دیتے ہیں بلکہ تعریف بھی کرتے ہیں وہی کام ہم کریں تو برا بھلا کہتے ہیں۔

س: ایسا کون سا کردار ہے جس نے آپ کو حیرت زدہ کیا ہو؟

ج: مجھے فلم 'برفی' میں جھلمل کا کردار بہت اچھا لگا اور وہ میرا All Time فیورٹ بھی ہے۔

س: عام طور سے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ فلم مرد یعنی ہیرو لے کر چلتے ہیں اور ڈرامہ عورت آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ج: بالکل غلط مضبوط اسکرپٹ فلم یا ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ اسکرپٹ میں اگر

مرد کا کردار طاقت ور ہوگا تو وہ لوگوں کو مرعوب کرے گا اور اگر عورت کا تو وہ کردار بھی لوگوں کو برسوں یاد رہے گا۔

س: آپ کو اپنے کیے گئے ڈراموں میں سب سے اچھا کردار کس کا لگا؟

ج: مجھے پیارے افضل میں اپنا کردار سب سے اچھا لگا حالانکہ وہ مین رول بھی نہیں تھا مگر بہت طاقت ور تھا مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے اس رول کو پہلے منع کردیا تھا۔

س: پاکستانی معاشرہ کیا عورت کے کام کرنے میں مددگار ہے؟

ج: پاکستان میں عورت کو کسی مقام پر پہنچنے کے لیے مردوں سے کئی گناہ زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے عجیب عجیب طرح کی رکاوٹیں آتی ہیں اور ہماری فیلڈ تو اور مشکل ہے کیونکہ اداکارہ کے پاس تو وقت بھی کم ہوتا ہے۔

س: ہمایوں سعید کے علاوہ آپ کے اچھے دوستوں کی لسٹ میں اور کون کون ہے؟

ج: جن لوگوں نے صحیح معنوں میں میری رہنمائی کی وہ یاسر نواز اور ندیم بیگ ہیں اور میں صرف انہی کو اپنا اچھا دوست مانتی ہوں۔

س: مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

ج: میں اسٹار بنا چاہتی ہوں اور مستقبل میں ایسا ہوتا دیکھ بھی رہی ہوں۔

س: سوہائے علی اپنے پڑھنے والوں کو کیا پیغام دیں گی؟

ج: صرف یہ کہ عورت کی عزت کریں اور عورتیں خود کو کمزور نہ جانیں۔

☆☆......☆☆

شادی میرے بیٹے کی

بیٹے کی شادی کے پُر کیف لمحات کی تفصیل...... ماں کے قلم سے......

مسز نگہت غفار

کہا اور سنا جاتا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں دونوں میں سے ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں کیوں نہ ہو اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت مرد کی پسلی سے بنی ہے۔ بالکل...... یہ ممکن ہے سچ ہے اسی طرح فہد کے لیے صبا بنی تھی۔

ہوا یوں کہ حلیمہ بھابی کی دوستی یوں ہوئی کہ میرے بیٹے عبید کی شادی مون (غضنفر) سے پہلے ہوئی تھی مون بڑے تھے۔ عبید کی شادی میں مجھے بری کے جوڑے تیار کرنے تھے تب مجھے میرے اسکول کی ٹیچرز نے بتایا کہ نگہت باجی آپ حلیمہ باجی سے سلوائیں وہ اپنے اسکول کے قریب ہی رہتی ہیں بہت ہی اچھے کپڑے سیتی ہیں اسکول اور میرے گھر کے بیچ میں وہ رہتی تھیں یوں میری ملاقات اُن سے ہوئی تب پتہ چلا کہ صبا کا بڑا بھائی اخلاق میرا شاگرد ہے۔ آج کل فوج میں ہوتا ہے حلیمہ بھابی نے بتایا تو مجھے بہت خوشی ہوئی صبا اور اُس سے چھوٹی غوشیہ دو بہنیں تھیں۔ میں نے بیٹے کے بعد دیگرے دو بہوؤں کی بری بھی حلیمہ بھابی سے سلوائے حلیمہ باجی بہت ہی پُر خلوص، ملنسار اور شفیق تھیں۔ تھیں اس لیے کہ اب وہ ہم میں نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) بہت ہی نیک ہمدرد اور دکھ بانٹنے والی خاتون تھیں سنا ہے کہ اُن کے شوہر بھی بالکل حلیمہ بھابی کی طرح تھے۔ میری اُن سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے میرے شوہر غفار صاحب کے انتقال کے کچھ دنوں بعد اُن کا بھی انتقال ہوا ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ میں شامل نہ ہوسکے۔ میں تین بیٹوں کی شادی کے بعد ریٹائرڈ بھی ہوگئی تھی اور چوتھے بیٹے کی شادی میں خاصہ گیپ آگیا تھا۔

ایک دن اچانک مجھے خیال آیا کہ میں حلیمہ بھابی کے پاس افسوس کرنے نہیں گئی کیوں نہ آج چلی جاؤں۔''

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی حلیمہ بھابی خوشی سے کھل اٹھیں میری اس طرح اچانک آمد پر حیران ہوگئیں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ بولیں۔

مسز نگہت غفار اپنے بیٹے 'بہو اور اپنی والدہ کے ہمراہ

آپی چلیں اور صبا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں نے دیکھا یہ تو پارلر کا کمرہ تھا اور صبا دلہن تیار کر رہی تھی حلیمہ بھابی نے صبا کو مخاطب کیا آپی دیکھو تو کون آیا ہے؟'' (وہ بیٹی کو پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ بیٹی کو آپی کہتی تھیں)۔

صبا نے پلٹ کر دیکھا پہلے تو چند لمحے حیران ہوئی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی والہانہ انداز میں مجھے چومنے لگی۔

''اللہ مس آپ......؟ اللہ آپ کہاں تھیں مس آپ بہت یاد آتی تھیں۔'' میں نے مسکرا کر اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''بس بیٹا ریٹائرمنٹ لے لی نا اس وجہ سے اِدھر سے گزرنا بہت ہی کم ہوتا ہے۔''

دولھا دلہن کے ساتھ اہل خانہ کی ایک خوبصورت تصویر

میں نے گھر آ کر بچوں کے سامنے اپنا خیال ظاہر کیا کہ زبیر کے لیے صبا کیسی رہے گی۔ بچوں نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا میں چپ ہوگئی میری بڑی بیٹی شازیہ کی بیٹی صبا کے پاس پارلر میں کام سیکھنے جارہی تھی۔ جب اُس نے میری بات سنی تو صبا سے بولی۔

''آپ...... آپ میری مامی بن جائیں نا۔''

انگلی پکڑائی' دودھ پلائی' جوتا چھپائی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق لفافے میں رقم دی گئی۔

بہنوں نے دروازہ رکوائی کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں رکھی تھی۔ اس وجہ سے انہیں سرپرائز ملا صبا اور فہد کی طرف سے شازیہ امبر دونوں کو گولڈ کے لاکٹ ملے۔

فہد نے مجھے بھی گولڈ کا لاکٹ دیا۔ ویسے میں صبا کو ماشاء اللہ سے ہماری طرف سے گولڈ زیادہ

دولہا دلہن کے ساتھ بڑے بھیا غضنفر اور ان کے صاحبزادے بلال

صبا ہنس پڑی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' مناہل نے جھٹ سے اپنے سیل پر زبیر' فہد دونوں کی تصویر دکھائی صبا نے فہد کو پسند کیا اور پھر اللہ کے حکم شازیہ بڑی بیٹی امبر چھوٹی بیٹی اور سب سے زیادہ اصرار کرنے والی مناہل کی کوششوں سے 2 ستمبر 2016ء کو صبا میری سب سے چھوٹی بہو بن کر میرے گھر آ گئی۔ شادی کی مکمل تیاری بری' کپڑے' ٹیلرز' جیولرز ساری ذمہ داری دونوں بہنوں نے کی باقی ہال' کھانا' تقریبات کی گاڑیاں دیگر ذمہ داریاں فہد کے دوستوں اور کزنز نے پوری کیں۔

ماشاء اللہ ہر کام پہلے سے طے کر کے کیا گیا۔

ملا۔ دونوں بہنوں نے سیٹ دیے ایک بھائی نے بھی گولڈ کا سیٹ دیا دوسرے بھائی نے بھی صبا کو گولڈ کا لاکٹ دیا۔ نزہت نے رنگ دی' مناہل نے ٹوپس اور امبر کی بیٹی آنچل نے نوز پن دی۔

بحرحال اللہ رب العزت نے اپنا کام کیا بخیر وخوبی یہ نیک فریضہ احسن طریقے سے اختتام پذیر ہوا۔

اب آپ سب کی طرف سے قیمتی خیالات کا انتظار ہے کہ آپ سب کو یہ شادی کیسی لگی۔

رب کریم ہر والدین کی یہ ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کے لیے اُن پر رحم فرمائے (آمین ثم آمین)۔

☆☆......☆☆......☆☆

لائف بوائے... ہر وعدہ وفا کرائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''نازنین! ارے گڑیا ذرا باہر تو دیکھو کتنی دیر سے دروازہ بج رہا ہے۔'' رانی دادی نے پاندان سے کتھا چونا انگلی کی پوروں پر لگا کر چاٹا اور دیر سے ہوتی دستک پر متوجہ ہوتے پوتی کو پکارا۔

''دادی اماں بس میری دو روٹیاں رہ گئی ہیں۔ جب تک پوری نہ کرلوں، میں نہیں آنے کی ہاں۔'' نازنین نے کچن سے ہی تیز آواز میں دادی کو جواب دیا۔

''ہاں بھلے سے دروازے کی ساری چولیں ہلا دے کوئی۔'' رانی دادی دہل کر رہ گئیں۔

''ارے دادی اماں کچھ نہیں ہونے کا دروازے کو...... بڑے مضبوط دروازے ہیں۔ اور ویسے بھی ہمارے برنس روڈ کے قدیم دروازے تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ بھلے سے جافری کی ساری جالی نکل جائے چوکھٹا کبھی نہ نکلے گا۔'' نازنین بھی حرفوں سے بنی تھی کہاں باز آتی۔

''اچھا تو چلو میں آپ ہی دیکھ لیتی ہوں۔''

نازنین کی شوخی اور بچپنے سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ لہٰذا دروازہ کھولنے چلی آئیں۔

''اے لو! بھلا یہ کیا مذاق ہوا۔ اتنی دیر سے دروازہ پیٹے دے رہے تھے اور دروازہ کھولا تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب...... ارے کیا زمانہ آ گیا ہے۔'' رانی دادی دروازے پر کھڑی فضیحتہ کرنے لگیں۔

''دادی آ جائیں! جانے والے جا چکے۔''

''ہاں سب جا چکے، میں رہ گئی کلیجہ پیٹنے کو، اے میں کہتی ہوں کیا تھا اگر تُو ذرا کی ذرا آ کر دروازہ کھول جاتی...... مگر بھیا تجھے تو اپنی دو روٹی پوری کرنے کی جلدی تھی۔ بھلا ہم دو کے علاوہ کون سا ٹبر ہے جس کے لیے تُو چولہے کو آگ لگائے بیٹھی تھی۔''

''روٹی تو آگ پہ ہی بنتی ہے۔ آگ جلے گی تو روٹی بنے گی۔'' نازنین نے ٹھسے سے ہنسنا شروع کردیا۔

''چپ کرجا...... آئی بڑی میاں کو سکھانے والی۔

تیرا باپ بھی تیری ہی طرح تھا۔ اللہ بخشے میرا بچہ ہر وخت (وقت) بس ماحول کو زعفرانِ زار ہی بنائے رکھتا تھا۔ ہاق ہاہ!'' دادی نے سرد آہ بھری۔

''جنے کہاں سے چپ کی ڈلی پلّے پڑ گئی اور خاموش ہو گیا میرا لعل!'' رانی دادی نے بہو کی شان میں قصیدہ گوئی ضروری سمجھی۔

''خبردار دادی جو میری اماں کو کچھ کہا تو...... ہاں نئی تو...... ابا نے لاکھوں میں سے چنا تھا میری امی کو! مذاق ہے کیا اور ایک آپ ہیں 'روایتی ساس'......''

''اری چپ...... دادی کو چپ کرائے گی تُو ہے کون...... آخر بتا ہی دیتی ہے کہ ثروت آراء کی لونڈیا ہوں۔'' دادی نے اس کی بات قطع کی اور گویا تنبیہ کر دی کہ وہ بہو کی حمایت میں کچھ سننے کی روادار نہیں ہیں۔

''ارے میری پیاری سی دادی...... جب آپ بولتی ہیں نا ایسے تو قسم سے جی چاہتا ہے کہ آپ کو چائے میں گھول کر پی جاؤں۔'' اور یہ سب مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ دادی کے گلے کا ہار ہو گئی۔

''میری گڑیا! میری رانی! تُو بالکل اپنی ماں کی طرح پیاری ہے۔ بس وہ تو میرے منہ سے بس ایسے ہی نکل جاتا ہے کبھی کبھی۔ مگر واقعی میری بہو ہیرا تھی۔ اللہ میرے بیٹے کو اور بہو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ بس بٹیا میں تو تیرے دم سے جی رہی ہوں۔ کاش کہ تجھے بالوں کا یہ عیب نہ لگا ہوتا۔'' رانی دادی نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اُسے حسرت سے دیکھا۔

''دادی آپ بھی نا! ارے دادی میرے بال بڑھتے ہی نہیں تو شکوہ کیسا...... چلیے میرے ساتھ تو پھر تھوڑا مسئلہ ہوا مگر ہمارے علاقے میں اکثر لڑکیاں ان ہی مسائل کا شکار ہیں۔ میں نے تیل والے بھائی سے کدو کا تیل منگوایا ہے نا...... وہ کہہ رہا تھا کہ بٹی کدو کے تیل سے بالوں کا ہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگلی پھیری پر لیتا آوں گا۔''

''ارے کتنے کا تیل منگوالیا تُو نے؟'' رانی دادی کے ماتھے پر اچانک ہی بل پڑ گئے۔

''ساڑھے تین سو کا آئے گا دادی۔'' وہ اٹھلائی۔

''ارے بھکو ساڑھے تین سو کا آئے گا...... اور اگر ساڑھے تین سو بال نہ اُگائے تو یے کار گیا نا کدو کا تیل۔'' بات تو دادی نے پتے کی کی تھی۔

''اوہو دادی...... وہ لوگ نیا شیمپو بھی بنا رہے ہیں۔ وہ ضرور کام دکھائے گا۔'' نازنین خوش ہوتی بولی۔

''بھیا کہیں اُن کا شمپو واقعی 'کام' نہ دکھا جائے۔'' یہ کہہ کر دادی نے کھٹاک سے پاندان کھولا اور پان کی چھوٹی سی کترن نکال کر تیار کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

نازنین کے ماں باپ حادثاتی طور پر زمین کی گود میں جا سوئے تھے اور نازنین اپنی دادی کی گود میں آ گئی تھی۔ حادثے کے وقت نازنین چار برس کی تھی۔ کوچ کو آگ لگی تو قدرت نے نازنین کو بچا لیا۔ اُس کے بال بری طرح جھلس گئے تھے جو ناگا سا کی اور ہیروشیما کی طرح آج بھی اپنی بربادی کی داستان سناتے تھے۔ بالوں کی افزائش رک سی گئی تھی۔ قدیم علاقے میں رہائش کے سبب باہر کی ہوا اب تک اُن کے تیسرے مالے پر نہ آئی تھی۔ نازنین کو دادی نے قیمتی خزانے کی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ نہ خود کہیں جاتی تھیں نا اُسے ہی کہیں جانے دیتی تھیں۔ یہی ڈر لگا کرتا تھا انہیں کہ اگر نازو باہر جائے گی تو بیٹے بہو کی طرح سوختہ واپس نہ آ جائے۔ نازنین اسکول کی بھی ابتدائی تین کلاسوں کے بعد آگے نہ پڑھ سکی تھی کہ دادی کے خدشات بہت تھے اور اُس کی سوچیں محدود...... گھر میں نہ ٹی وی تھا نا

دیگر آسائشات...... دو وقت کی روٹی کے بھی لالے تھے۔ میاں کی پنشن میں گھر چلتا تھا۔ بس کسمپرسی میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ نازنین اب چودہ برس کی ہو چکی تھی۔ مڈل کلاس کا المیہ ہے کہ وقت سے پہلے بچے شعور کی منازل طے کر لیتے ہیں۔ چودہ برس کی عمر میں نازنین گھر داری میں طاق ہوئی تھی۔ اپنا اور دادی کا ہر کام خود بخود ذمہ داری بنتا چلا گیا تھا۔

دروازہ پھر سے بجنے لگا اور کھانا کھاتے دونوں دادی پوتی کے ہاتھ رُک گئے۔

"جا جا کر دیکھ کون ہے، دروازہ بجانے کا انداز تو وہی ہے جو پہلے تھا۔" رانی دادی نے فوراً اُس کی دروازے پر دوڑ لگوا دی۔

"اوفوہ! کیا مصیبت ہے؟ کھانا تک کھانے نہیں دے سکتے لوگ' ہونہہ! خدا پوچھے اِن کو۔" وہ بکتی جھکتی دروازہ کھولنے لگی۔

"کیا ہے؟ کون بے صبرا ہے جو دروازہ توڑ ڈالے گا آج۔" اور دروازہ کھولتے ہی ایک نازک سی لڑکی ہاتھ میں بیگ لیے کسی پروڈکٹ کی سیل کے لیے موجود تھی۔

"جی فرمایئے...... کیا لائی ہیں آپ؟"

"آپ میری بات تو سن لیں...... میں نیا لائف بوائے شیمپو آپ کے لیے لے کر حاضر ہوئی ہوں۔"

"بیچنے کے لیے لائی ہو ناں! تو اتنا انداز دکھانے کا فائدہ' سیدھا بولو کہ شیمپو خرید لیں۔"

"ارے کیا دروازے پر شور مچا رہی ہے۔ اندر بلا لے۔ میرے گھر میں کون سے مُردوے ہیں۔" دادی نے اُسے جھڑکا اور وہ لڑکی کو اندر لے کر آ گئی۔

"بیٹھو بٹیا! تین منزلیں چڑھ کر آئی ہو' پیاس تو لگی ہو گی۔"

"آنٹی آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں بالکل نہیں تھکی اور ہاں میں آپ کے حکم پر آ تو گئی ہوں اندر، مگر گھروں کے اندر جانے کی ہمیں اجازت نہیں ہوتی۔"

"ارے میری گڑیا! ہمارے ہاں ہم دو دادی پوتی کے علاوہ کون ہے۔ خیر اللہ رکھے تم بتاؤ' کیا لیے لیے گھوم رہی ہو؟"

"دادی میں نیا لائف بوائے شیمپو لے کر آئی ہوں۔ آپ ایک بار استعمال کریں۔ ہمارا لائف بوائے شیمپو آپ کے بالوں کے تمام مسائل ختم کر کے نئے بال اُگاتا ہے اور آپ کے بالوں کو گھنا اور طاقت ور بناتا ہے۔"

"بٹیا سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کیمیکل والے شیمپو کہاں بالوں کو بہتر کرتے ہیں۔"

"دادی آپ جو بات بھی کہہ رہی ہیں قبل از وقت ہے۔ آپ نیا لائف بوائے شیمپو ایک بار استعمال کر کے دیکھیں۔ اگر آپ کے بالوں کا مسئلہ حل ہو جائے تو پھر جو فیصلہ آپ کریں مجھے منظور۔" لڑکی نے اعتماد سے کہا تو دادی کو اس کے اعتماد نے حد درجہ متاثر کیا۔

"چندا...... میری پوتی کے بال جھلس گئے تھے ایک حادثے میں' تب سے اس کے بال متاثر ہوئے اور افزائش رُک سی گئی ہے۔ تمہارا اعتماد مجھے پسند آیا ہے مگر اس مسئلے کا حل تو بس اللہ میاں سے دعا ہی ہے۔"

"ارے دادی! اللہ میاں نے ہی انسان کو عقل دے کر نئی نئی سہولیات کے قابل بنایا ہے۔ آپ خیال نہ کریں۔ اللہ میاں پر بھروسہ کرتے ہوئے ہمارے لائف بوائے شیمپو کو آزما کر دیکھ لیں۔"

"آپ پھر نظر کب آئیں گی۔" نازنین نے طنز کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"ارے میری چھوٹی بہن! میں پورے ایک مہینے بعد خاص طور پر اپنی بہن کے بالوں پر اپنے نئے

لائف بوائے شیمپو کا اثر دیکھنے آؤں گی۔ میرا یقین ہے کہ اللہ میاں نے لائف بوائے شیمپو کی صورت آپ کے لیے مسیحا بھیج دیا ہے۔''

''سچ!'' نازنین نے فرطِ مسرت سے لڑکی کے ہاتھ تھام لیے۔

''بالکل! وعدہ! اعتماد کا وعدہ' تم استعمال تو کر کے دیکھو۔'' لڑکی نے بیگ سے دو لائف بوائے شیمپو کی بوتلیں نکال کر نازنین کو تھما دیں۔ دادی نے پیسے دینے کے لیے پاندان کھولا تھا۔

''ارے بٹیا کتنے پیسے ہوئے۔''

''ارے دادی! یہ تو اعتماد کا سودا ہے۔ میں اپنی بہن کے لیے بطور تحفہ دے کر جا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر لڑکی تو چلی گئی مگر دادی پوتی کو حیرت کی دنیا میں ڈال گئی۔

☆......☆......☆

باقاعدگی سے نازنین نے نئے لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو اُسے اپنے بالوں میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی بلکہ بال شیمپو کرنے کے بعد مزید اُلجھ جاتے تھے۔ ایک دن وہ اسی مسئلے سے دوچار تھی کہ رانی دادی نے ٹوک دیا۔

''کیوں بالوں کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ ارے میں کہتی ہوں دفع کر دے اِسے۔''

اُلجھے بالوں کو سلجھاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور دادی کس طرح پوتی کو تکلیف میں برداشت کر سکتی تھیں۔

''دادی اماں! مجھے لگ رہا ہے پہلے سے کچھ بہتری آئی ہے۔ دادی یہ دیکھیں پہلے میرے بالوں کے کنارے تانبے کی تار جیسے تھے مگر اب ان میں کچھ حد تک نرمی آئی ہے۔ دیکھیں نا آپ۔'' نازنین اُلجھے بالوں کو لیے دادی کے پاس آ گئی۔

''ارے......'' دادی نے بال ہاتھوں میں لے کر چیک کیے۔

''کوئی نرمی نہیں آئی ہے۔ بس چھوڑ دے بٹیا یہ سب...... دیکھ تو! بالوں میں کنگھا کرتے کرتے تیری آنکھیں کیسی لال ہو گئی ہیں تکلیف سے۔'' دادی نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''دادی اماں! مجھے لائف بوائے شیمپو پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ ایک دن کمال ضرور ہوگا۔ شیمپو والی باجی کا اعتماد ضرور رنگ دکھائے گا۔'' یہ کہہ کر نازنین بال سلجھانے لگی اور رانی دادی پوتی کے اعتماد کو لے کر صدقِ دل سے دعا مانگنے لگیں۔

☆......☆......☆

چند ماہ کے باقاعدہ استعمال سے نازنین کے بال واقعی اپنی اصل حالت میں آنے لگے تھے۔

آج اُس کی شیمپو والی باجی اُس سے ملنے خاص طور پر آئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

''کیوٹ گرل! دیکھ لو اللہ میاں نے مسیحا بھیجا نا لائف بوائے شیمپو کی شکل میں۔'' وہ لائف بوائے شیمپو کے کمال پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

''سچ ہے باجی! بات ہے اعتماد کی اور لائف بوائے شیمپو پر اعتماد نے میرے بالوں کے مسائل ہی حل نہیں کیے بلکہ مجھے بھی ایک پُر اعتماد زندگی دوبارہ سے دے دی ہے۔ آئی لو یو لائف بوائے شیمپو...... تم نے تو واقعی میں کمال کر دکھایا۔''

''ہاں سارا کمال لائف بوائے شیمپو کا ہے۔ اگر میں اُس دن دروازہ کھولنے پر شور نہ مچاتی تو بھلا یہ کمال ہوتا۔ اے بولو بٹیا!'' دادی ماں بھلا پیچھے کیوں رہتیں۔

''بالکل! سارا کمال تو دادی ماں کا ہے۔ جن کی بدولت لائف بوائے شیمپو کی شکل میں مسیحا ہمارے گھر کو آیا تھا۔'' نازنین یہ کہہ کر کھلکھلا کر ہنس دی اور اُس کی شیمپو والی باجی بھی مسکرانے لگی تھیں۔

ناول
رفعت سراج

دامِ دل

قسط 25

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

چمن اور افشاں گھر میں داخل ہوتے ہی بہت مصروف ہوگئی تھیں اور دونوں کے دل میں ایک ہی خیال تھا کہ جیسے ہی رشتے داروں جاننے والوں اور دوستوں کو بانو آپا کے رخصت ہوجانے کی خبر پہنچے گی تو گھر پہنچنا شروع ہوجائیں گے۔

افشاں نے لاؤنج میں بھاری بھرکم سامان کھینچ کر ایک طرف کرنا شروع کر دیا۔
''افشاں کیا کر رہی ہو؟'' چمن کو جیسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔
''بھابی وہ اسٹور میں سفید چادریں چاندنیاں جو امی قرآن خوانی میلاد وغیرہ میں بچھایا کرتی تھیں رکھی ہوئی ہیں وہ یہاں بچھا دیتے ہیں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''اچھا...... تو تم اکیلی مت گھسیٹو نا یہ صوفے وغیرہ اچھے خاصے بھاری ہیں۔'' چمن بھی سب کچھ بھلائے موجودہ لمحے میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔
''میرا خیال ہے بھائی جان اب آنے ہی والے ہوں گے۔'' افشاں نے اب اپنی Wrist Watch دیکھتے ہوئے چمن کی طرف دیکھا۔ چمن کے دل کو کچھ ہوا۔ افشاں کا بھائی گھر پہنچنے ہی والا تھا۔
افشاں کا بھائی جو اب اُس کا کچھ نہیں تھا مگر کیا کیجیے یہ دنیا داری اور اِس کے شکنجے کتنے بے رحم اور مضبوط تھے کہ آج وہ اِس گھر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود...... افشاں کی مدد بھی کر رہی تھی اور اُس کے بھائی کے ذکر پر روحانی اذیت بھی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اب دل کو ایک تسلی سی تھی کہ اسٹیج پر جو کردار ادا ہو رہا تھا یہ اُس کردار کا آخری منظر تھا۔ وہ اپنا کردار ادا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُتر جائے گی اور پھر اُس کو یہاں کوئی بھی کردار نبھانے کی ضرورت نہیں ہوگی یہ سوچ بھی قدرے تقویت کا باعث تھی۔
وہ...... صوفوں کو دھکے لگا کر دیوار کے ساتھ لگانے لگی۔ ابھی وہ سامان دیوار کے ساتھ لگا کر چاندنی بچھانے میں لگی ہوئی تھیں کہ عطیہ بیگم بھی پہنچ گئیں اور آگے بڑھ کر افشاں کو گلے سے لگا لیا۔
افشاں اُن کے گداز سینے میں سر پھنسا کر نئے سرے سے اتنا روئی کہ چمن کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ پہلے تو وہ بھاگ کر ایک گلاس پانی بھر کر لائی پھر افشاں کو عطیہ بیگم سے الگ کرنے کی سعی کرنے لگی لیکن افشاں بے اختیاری میں عطیہ بیگم سے بار بار لپٹ جاتی تھی۔ جو اُس کے سر پر بہت شفقت اور ہمدردی سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔
''بس کرو بیٹا...... جانے والوں کو اِن آنسوؤں سے بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ جب یہاں سے چلے جاتے ہیں تو پھر ہمارے تحفوں کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ تحفے جو ہم اللہ کا کلام پڑھ کر اُن کو ہدیہ کرتے ہیں۔''
''آنٹی میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔''
''پاپا تو پہلے ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب امی جان بھی......'' افشاں پر کسی تاکید تلقین کا اثر نہیں تھا وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔
''بیٹا...... خود کو سنبھالو...... یہاں کون ہمیشہ رہنے کے لیے آیا ہے۔ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ہی ہے۔'' عطیہ بیگم طبعاً رقیق القلب تھیں۔ سمجھاتے سمجھاتے خود بھی آبدیدہ ہو گئیں۔
''آنٹی...... آپ بہت اچھی ہیں...... پلیز میری امی کو معاف کر دیجیے گا۔''
''آپ بھابی سے پوچھیں...... میری امی تو اتنی اچھی تھیں انہوں نے تو بھابی سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔''
افشاں نے سر اُٹھا کر چمن کی طرف اشارہ کیا تاکہ وہ گواہی دے اور تمام موجود لوگوں کو یقین آ جائے کہ اس کی ماں واقعی اہلِ جنت میں سے ہے۔ اڑوس پڑوس کی خواتین گھر میں داخل ہو رہی تھیں اور افشاں
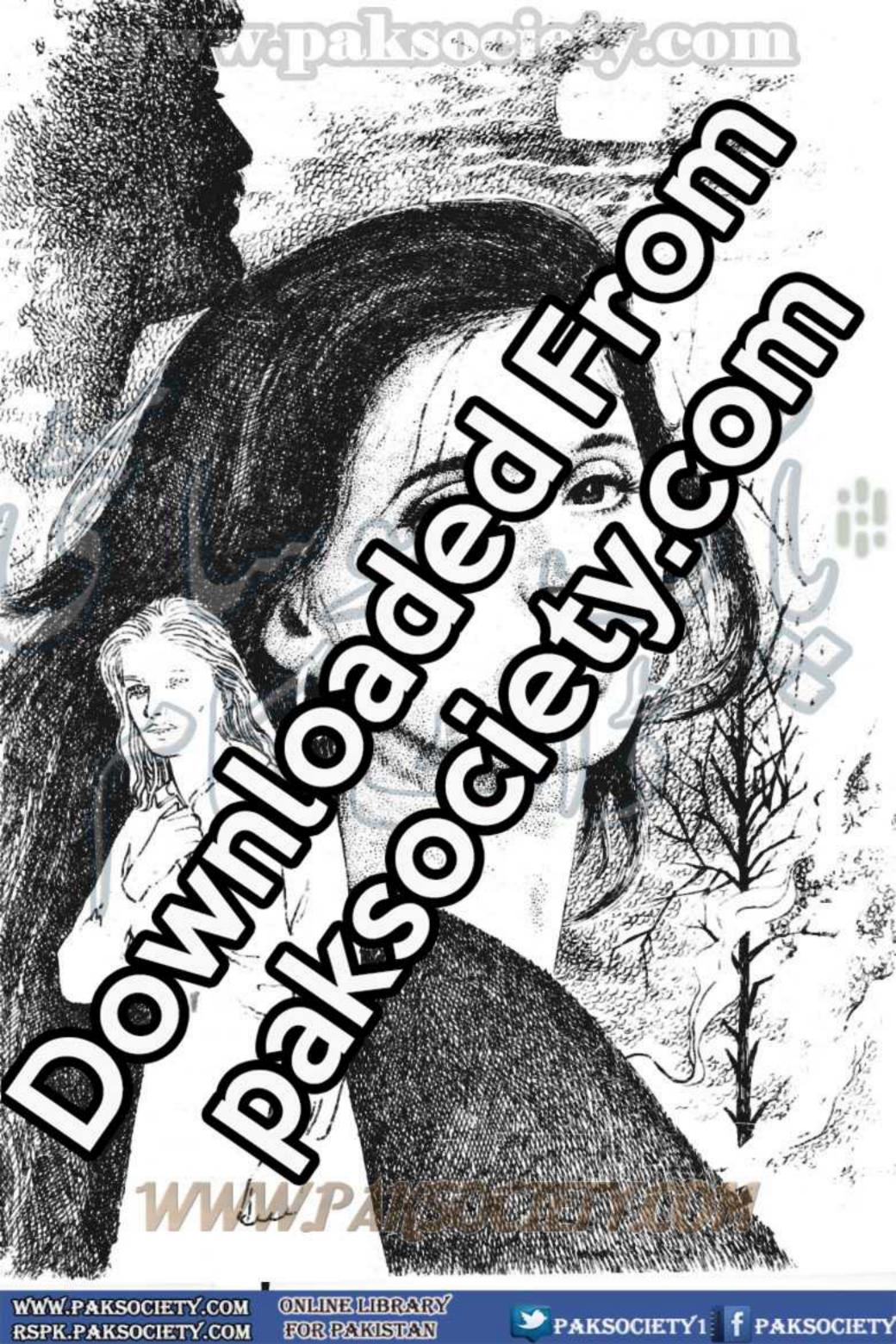
کو دلاسہ دینے اس کے قریب آتی جا رہی تھیں۔

''ارے بیٹا...... جانے والوں سے کیسی شکایتیں...... اللہ ان کو بخشے ہمیں کوئی شکایت نہیں...... جانے والے اپنا حساب کتاب ساتھ لے کر جاتے ہیں۔''

''گلے شکوے تو زندوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور یہ زندگی کے رنگ ہیں۔'' عطیہ بیگم نے افشاں کی معافی کی درخواست پر اسے یوں سینے سے لگالیا گویا وہ افشاں نہ ہو چمن ہو۔

☆......☆......☆

جتنی دیر ضابطے کی کارروائی میں لگی اس دوران ثمر نے قریب ترین رشتے داروں کو جن میں اُس کے زیادہ تر ننھالی رشتے دار تھے فون کر کے بانو آپا کے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ اور پھر اُس کے بعد اُسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بانو آپا کا جسد خاکی اُن کے حوالے کر دیا گیا وہ ماں کو اُس گھر میں لے کر پہنچا جس گھر میں اُس نے گھر کے ہر کونے میں ماں کی آواز سنی تھی۔ وہ گھر جس کو اُس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا اور سنوارا تھا۔ اور جب بھی کوئی نئی آرائش کرتیں تو وہ ثمر کو یاد دلاتیں کہ وہ یہ گھر اُس کے لیے سجا رہی ہیں۔ یہاں پر اُس کے پیارے پیارے بچے کھیلیں گے اور اُن بچوں کے ساتھ اپنی زندگی کے بہترین اور خوشگوار لمحات گزاریں گی۔

اُس کی ماں بچوں کے ساتھ کھیلنے کے خواب دیکھتے دیکھتے اِس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور...... گھر اپنی جگہ موجود تھا۔ اِس گھر کی بیشتر آرائشی چیزیں بانو آپا کی ہی خریدی ہوئی تھیں اور اُنہی کی مرضی اور پسند سے گھر میں جگہ بنائے ہوئے تھیں۔

پانچ سالہ شادی شدہ زندگی کے دور میں ثمر چمن کے ساتھ اس سجے سجائے گھر کو Enjoy کرتا رہا لطف اندوز ہوتا رہا جھگڑے ہوتے رہے روٹھنا منانا ہوتا رہا کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ اِس گھر میں کسی شے کی کمی ہے جو پورا کرنا ضروری ہو جس طرف نگاہ جاتی تھی گھر کی آرائش مکمل محسوس ہوتی تھی۔

ثمر کو یاد تھا جب اِس گھر کی تعمیر ہوئی تو وہ بہت چھوٹا تھا زیرِ تعمیر گھر کا جائزہ لینے کے لیے اُس کے والد وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی اُس کو بھی ساتھ لے آتے تھے لیکن اس دوران بس وہ اِس کو دیکھتے ہی رہتے تھے کہ وہ کچرے میں سیمنٹ میں ریت مٹی میں اپنے آپ کو گندہ یا آلودہ نہ کر لے۔

ٹھیکیدار سے آرکیٹیکٹ سے باتیں کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے اُسے آواز دیتے رہتے تھے تاکہ اُن کو یہ یقین رہے کہ وہ اُن کے آس پاس ہی ہے...... خاص طور پر وہ اُس کو نامکمل پہلی منزل کی طرف جانے سے بہت سختی سے روکتے تھے کیونکہ وہاں چھت پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ حالانکہ اُس کا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر اوپر جا کر کھلی چھت پر اچھل کود کرے۔

اکلوتا ہونے کے باعث وہ کبھی کبھی کرکٹ بھی خود ہی کھیل لیتا تھا فٹبال بھی کھیلنا تو اُس کے لیے بہت آسان تھا مگر کرکٹ میں اُسے اچھی خاصی جان کھپانی پڑتی تھی کیونکہ باؤلنگ' فیلڈنگ و بیٹنگ ساری ذمہ داریاں اُس کے ننھے کاندھے پر ہوتی تھیں۔

چمن نے ایک مرتبہ دبی زبان میں لاؤنج کے صوفے تبدیل کرنے کا کہا تھا۔ مگر بانو آپا نے یہ کہہ کر اُس کی اِس فرمائش کو بے وقت کر دیا تھا۔

''ارے یہ کوئی معمولی صوفے نہیں ہیں ایک Piece مجھے بائیس ہزار کا پڑا تھا اب یہ سات Seats تم گن لو ایک لاکھ سے اوپر کا بل بنا تھا۔ پھر اُس کے سامنے یہ جو سیٹ اور موڑھے رکھے ہوئے ہیں یہ ریگسین کے نہیں چمڑے کے ہیں۔ ایک ایک Piece اس وقت تمہیں بارہ بارہ ہزار کا ملے گا۔ اِس لاؤنج کی آرائش پر میں نے 3 ساڑھے تین لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا ایسے نہیں بھرے ہیں آخر تین ساڑھے تین لاکھ روپے مگر تم کیا جانو۔''

ایک چھوٹی سی فرمائش پر ڈھیروں صلواتیں سن کر ایسی خاموش ہوئی کہ گھر سے نکل گئی مگر صوفے تبدیل کرنے کے لیے دوبارہ نہیں کہا۔

چمن نے عطیہ بیگم کے ساتھ تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ بڑی بڑی چاندنیاں بچھانے کے بعد اُس نے اگربتیاں بھی سلگا دی تھیں اور ایک چھوٹی سی Table درمیان میں رکھ کر قرآن کے سپاروں کا سیٹ بھی رکھ دیا تھا۔ صرف انتظار تھا تو یہ کہ بانو آپا اِس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے کے لیے کس وقت پہنچتی ہیں۔ اور پھر...... انتظار جاں گسل نہ ہوا۔ اندازاً اِس وقت ثمر کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ پہنچ گیا تھا اور...... اُس کے پہنچنے سے پہلے محلہ کمیٹی کے کچھ لوگ انتظامات کے لیے آموجود ہوئے تھے۔ کفن دفن اور غسل دینے والی کا انتظام وہ ثمر کی ایک فون کال کے بعد ہی کر چکے تھے۔

چمن، عطیہ بیگم اور افشاں گھر میں انتظار کر رہی تھیں اور محلہ کمیٹی کے لوگ باہر ایمبولینس کے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ثمر ایمبولینس کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کی اپنی گاڑی شاید ہاسپٹل میں کھڑی تھی۔ وہ ایمبولینس سے اترا تو محلہ کمیٹی کے صدر اشتیاق صاحب نے بتایا کہ وہ بالکل فکر نہ کرے۔ سب انتظام ہو گیا ہے اور پڑوس کے حمزہ صاحب اِس وقت قبرستان میں ہیں اور وہاں قبر تیار کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔

ثمر نے اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اُن کو گلے لگا کر اُن کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ ایکدم سے ایسی سر پر آ پڑی تھی کہ وہ اکیلا چار طرف بھاگ دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اچھا خاصہ بدحواس ہو رہا تھا اور واقعہ ایسا تھا کہ اس وقت وہ اپنا فون بھی Powered Off نہیں کر سکتا تھا۔ بس ایک ہی خیال اُس کو فکرمند کیے جا رہا تھا کہ کہیں ندا کی کالز آنا نہ شروع ہو جائیں اِس وقت اُس کی پوزیشن بہت نازک تھی وہ کسی صورت ندا کی کال ریسیو کر کے اُسے انفارم نہیں کر سکتا اور اگر بات کر بھی لیتا تو ظاہر ہے ٹال مٹول والی ہی بات کرتا اور ٹال مٹول والی بات ندا نے قبول نہیں کرنی تھی اور اُس نے پھر دوبارہ سے اُسے کال کرنا تھی۔ اب اُسے اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا۔

اگر اس لڑکی میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو دو چار دن سکون سے رہتی اور مجھے بھی سکون سے اپنا کام کرنے دیتی۔ پیاری امی جان تو مجھے مشکل سے نکال کر چلی گئیں۔ حقیقت حال سے افشاں کو آگاہ کرنا اور اُس کا ردِعمل دیکھنا ایسا کوئی خاص کام نہیں تھا بہن اپنے گھر کی تھی اگر اعتراض بھی کرتی تو بھی اپنے گھر چلی جاتی اور بھائی کے فیصلے پر خوشی کا اظہار کرتی تو بھی اُسے تو اپنے ہی گھر جانا تھا افشاں اُس کا Concern نہیں تھی۔

محلہ کمیٹی کے مردوں کے ذریعے اُن کے گھر کی عورتوں کو بھی اطلاع پہنچ چکی تھی اس وقت مختلف سمتوں

سے بانو آپا کے گھر کا رخ کر رہی تھیں۔ ثمر ذرا دیر کو گھر کے اندر گیا تھا..... سامنے ہی اُسے چمن بیٹھی ہوئی نظر آ گئی تھی جو سر جھکائے سپارہ ہاتھ میں لیے پڑھ رہی تھی۔ چمن پر نظر پڑتے ہی ماں کی جدائی کے غم میں ایک شدید قسم کی روحانی اذیت بھی شریک ہوگئی۔ پھر اُس سے مزید آگے نہ بڑھا گیا۔ وہ لاؤنج سے ہی پلٹ آیا۔

بانو آپا کی تجہیز و تدفین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اُس کے چند قریبی رشتے دار اور پڑوسی اُس کو ڈھارس بھی دے رہے تھے اور صبر کی تاکید بھی کر رہے تھے اور ہر طرح کا تعاون بھی..... جب کافی لوگ ہوگئے تو ثمر کو انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آنا پڑا۔ لاؤنج سے گزر کر ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے اُس کی غیر ارادی نگاہ چمن پر پڑ گئی تھی کیا اِسے ابھی بھی کوئی خوش فہمی ہے یہ کیوں آئی ہے ٹھیک ہے امی جان نے اسے بلایا تھا اور اس نے ہماری سات پشتوں پر واقعی احسان کیا۔ لیکن اب یہاں آنے کی کیا تک بنتی تھی۔

چمن کی اس گھر میں موجودگی ایسے ہی تھی جیسے اُس کے سر پر آسمان دھرا ہو۔ وہ عجیب سی کڑھن محسوس کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا تو آنے والوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز کلمات ادا کرنا شروع کیے۔

''بس بیٹا جو یہاں آیا ہے اُسے جانا بھی ضرور ہے۔ مرحومہ چلی گئیں ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں اور کسی وقت وہاں پہنچ جائیں گے جہاں ہم سے آگے والے پہنچ گئے ہیں۔'' اُس کے ایک بزرگ رشتے کے ماموں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت اپنائیت سے کہا تھا۔ ماں کی جدائی کا غم کوئی چھوٹا غم نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُس کا ذہن بالکل مفلوج ہوگیا ہے۔ اور دکھ کی بڑی سی چادر..... اوڑھ کر کسی کونے میں بیٹھ جانے کی تمنا کے علاوہ وہ اِس وقت کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ تسلی دینے والوں کی صبر کی تاکید کرنے والوں کی آوازیں بہت دور سے آتی سنائی دیتی تھیں۔ وہ اس وقت چومکھی جنگ میں مبتلا تھا۔

ایک پہاڑ سا غم دوسرے قیامت کا اندیشہ کہیں چمن اس گھر میں دوبارہ سے واپس آنے نہ سوچ چکی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب آ گئی ہو تو واپس جانے کا نام نہ لے اور افشاں اُس کی وکیل بن کر جان کو نہ آ جائے۔

ڈرائنگ روم میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھنا پڑ رہا تھا کیونکہ یہاں..... ڈرائنگ روم میں بیس پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور اس وقت تقریباً تیس سے زائد لوگ ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ باہر محلہ کمیٹی والوں نے شامیانہ تان دیا تھا اور دریاں بھی بچھا دی تھیں۔ لیکن ثمر چونکہ گھر کے اندر تھا اس لیے لوگ اُسے پوچھتے ہوئے اندر ہی چلے آ رہے تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں اِس طرح سے گم ہوا کہ اُس کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی کہ ندر گھر میں داخل ہو چکی ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی عثمان گھر گاہے بگاہے فون کر کے ماہ پارہ اور ماہ وش کی سرگرمیوں کی بابت معلوم کر رہے تھے۔ بچیاں نینا کے ساتھ ابھی تک کھیل میں مصروف تھیں۔ وہ بہت توجہ سے اپنی ذمہ داریاں ضرور نبھا رہے تھے مگر ذہن چمن کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔

انہیں بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ چمن کے گھر میں فوتگی ہوئی ہے اور وہ یہاں اسپتال میں اپنی

ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں ایک اصولی سی بات تھی جب بچیوں کے ناطے سے ایک تعلق بن گیا ہے تو اُس کے گھر جا کر اُس سے تعزیت کرنا ایک بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری تھی جو اُن کو ادا کرنا چاہیے تھی۔ کم از کم اتنا ہی پتہ چل جاتا کہ تدفین کا کام ٹائم ہے تو وہ اُس ٹائم سے تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتے اور ایک مسلمان میت کا حق ادا کر دیتے یعنی اُس کو کاندھا دینا اور اُس کو آخری منزل تک پہنچانا اور پھر اُس کی مغفرت کے لیے دعا کرنا۔

چمن کے ناطے یہ تو مرحومہ کا حق بنتا تھا وہ چند لمحے اپنی سوچوں میں اُلجھے رہے پھر اپنی دانست میں چمن کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کے لیے چمن کا نمبر ڈائل کر دیا۔

رنگ پاس ہو رہی تھی۔ ہر سکینڈ اُن کا دل دھڑکتا تھا کہ اب دوسری طرف سے چمن کی اُداس سی آواز سنائی دے گی۔

لیکن رنگ پاس ہوتی رہی اُن کی کال ریسیو نہیں کی گئی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کے میت کا گھر ہے وہ ظاہر ہے بہت مصروف ہوگی ہوسکتا ہے موبائل دور ہو اُس کو دوبارہ سے فون ملایا مگر اِس مرتبہ بھی رنگ جاتی رہی اور پھر ایک خاص دورانیے کے بعد رابطہ خود بخود منقطع ہو گیا۔ انہوں نے تیسری دفعہ Try کی پھر چوتھی دفعہ...... مگر صورت حال سابقہ رہی تب انہوں نے یہ سوچ کر فون واپس اپنی جیب میں ڈال لیا کہ شاید گھر میں بہت سے لوگ آ گئے ہوں اور اُس کو کال پک کرنے کا موقع نہ مل رہا ہو۔'' یہ سوچ کر کے دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ Try کریں گے وہ پھر اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔

☆......☆......☆

افشاں تو کافی دیر سے اپنے گھٹنوں پر سر ڈالے مغموم کیفیت میں ایک زاویے سے بیٹھی ہوئی تھی البتہ چمن تعزیت کے لیے آنے والی ہر خاتون کے لیے اپنی جگہ سے اٹھتی تھی اور اُن سے تعزیت وصول کر کے افشاں کے پاس لے آتی تھی۔ جو افشاں کو صبر کی تاکید اور تلقین کے چند کلمات ادا کر کے خاموشی سے ایک طرف جا بیٹھتی تھیں۔

ندا لاؤنج میں داخل ہوئی اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر بیٹھی ہوئی خواتین کا جائزہ لیا یوں جیسے کسی خاص شخصیت کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

آنے والی خواتین میں بہت ساری خواتین ایسی تھیں جن سے چمن کی آج پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی اور بہت سی ایسی تھیں جن سے وہ بہت عرصہ دراز بعد ملی تھی۔ لیکن ندا کی طرف دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ شاید یہ کوئی بالکل نئی جان پہچان ہے ظاہر ہے وہ بانو آپا کے حوالے سے ہی آئی ہوگی پہلے کی طرح چمن نے اٹھ کر ندا کی طرف قدم بڑھائے۔ ندا نے چمن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے جہاں تک پہنچی تھی وہیں رُک گئی اور آنکھیں پٹ پٹا کر چمن کی طرف دیکھنے لگی۔

''السلام علیکم!'' چمن نے ندا کے کاندھے پر آہستگی سے سر رکھ کر اُداسی کی کیفیت میں ایک سلام کر کے گویا اُس نے قدم بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ کیونکہ اُس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ آنے والی نوارد لڑکی بہت ججھک رہی ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہاں موجود تمام چہرے اُس کے لیے اجنبی ہیں۔

''جی آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' چمن نے بہت آہستگی سے سوال کیا تھا۔ تاکہ اُس کا مکمل تعارف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہونے کے بعد اُسے افشاں کے پاس لے کر جائے اور افشاں سے اُس کا تعارف کرائے۔

ندا نے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے چمن کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور چمن کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی طرف سے سوال کر دیا۔

''جی آپ کون ہیں؟'' ندا کے سوال نے چمن کو ایک نئی مشکل میں ڈال دیا کیونکہ اُس کے بالکل قریب ہی اُس کے قریب ترین ہمسائے موجود تھے۔ بالکل ساتھ والی ڈاکٹر آنٹی شگفتہ اور بائیں طرف والی بانو آپا کی بہت چہیتی پڑوسن آنٹی آمنہ...... جی...... میں...... چمن ہوں مسز ثمر بانو آپا کی بہو......'' چمن کو وہ سب کچھ کہنا پڑا جو وہ کسی بھی صورت میں کہنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن بیٹھی ہوئی خواتین کی نظریں اُن دونوں پر تھیں اور وہاں اتنی خاموشی تھی کہ ہلکی سی آہٹ اور آواز دور بیٹھی خواتین تک بہت آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔

وہ اِس گھر میں اپنے کردار کے آخری مرحلے سے گزر رہی تھی لیکن یہ تو صرف اُسی کو پتہ تھا۔ ندا نے سُنا تو بے اختیاری حالت میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ چمن اور وہاں موجود تمام خواتین نے ندا کا یہ انداز دیکھا تو سب ہی کے چہرے پر تعجب دکھائی دیا اور اُس وقت تو سب کی حیرت کی انتہا رہی کہ آنے والی نووارد لڑکی نے...... چمن اور افشاں سے تعزیت کیے بغیر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

وہ...... دو قدم پہلے پیچھے ہٹی تھی اور دو قدم اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مزید پیچھے ہوئی تھی۔ سب کی نظریں اُسی پر تھیں چمن سمیت بلکہ افشاں بھی اپنی آبدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب کے دیکھتے ہی دیکھتے ندا منظر سے غائب ہوگئی۔ وہ ڈرائنگ روم سے جاچکی تھی اور سب خواتین حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ مگر جلد ہی صورت حال کا احساس کر کے اپنی اپنی نظریں جھکا کر بیٹھ گئیں۔ کسی نے سپارہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے کوئی آنچل درست کرنے لگیں۔

چمن حیرت زدہ سی اُسی جگہ کھڑی تھی۔ بہت سے ذہنوں میں سوال پیدا ہوئے تھے ہونا بھی چاہیے تھے لیکن اس وقت یہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو نہیں سکتا تھا۔

چمن واپس بیٹھنے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاؤنج سے باہر آئی اُس راستے پر جس راستے سے ندا واپس ہوئی تھی مگر ندا اتنی دیر میں گیٹ سے باہر جاچکی تھی۔

چمن چند ثانیے گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ مختلف قسم کے سوال جو اندیشوں کی صورت میں خود بخود پیدا ہو رہے تھے۔ اُن کا جواب دینے والا دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

مگر دور سے ایک آواز آرہی تھی اور سماعت میں خراشیں پیدا کر رہی تھی۔ رات گئے کیا جانے والا فون......

اور ثمر کے سیل سے ابھرتی ایک نسوانی آواز......

جسے اس نے مغالطہ سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر یادداشت کے نہاں خانے میں آج بھی محفوظ تھی۔

ندا جاچکی تھی۔

مگر...... چاروں طرف اس کے سائے نظر آنے لگے تھے۔ بہت ہی چونکا دینے والا انداز تھا۔
سوگ کے گھر میں آنے والے نہ اس طرح آتے ہیں نہ اس طرح جاتے ہیں۔ آمد کا انداز بھی نرالا......

جانے کا انداز بھی انوکھا......
''یہ لڑکی کون تھی؟''
''کیوں آئی تھی؟''
''نہ تعارف...... نہ تعزیت......''
''آئی بھی اور چلی بھی گئی......''
لیکن...... اس سکون میں ایک عجیب سا انتشار پھیلا گئی۔
چمن ہزار چاہنے کے باوجود اپنا ذہن کسی اور طرف نہ لگا پا رہی تھی۔ حالانکہ آنے والی ہر خاتون سے آگے بڑھ کر تعزیت وصول کر رہی تھی۔ مگر......
ذہن مسلسل نو وارد کی آمد و رفت میں اٹک کر رہ گیا تھا۔
چند لمحوں میں یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ سر پر کوئی بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔

☆......☆......☆

''بابا...... I Am Very Depressed...... بہت بہت زیادہ بے چین ہوں بہت زیادہ پریشان ہوں کچھ سمجھ نہیں آتی۔'' ارسلان لاؤنج میں صوفے پر مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا ہوا تھا اور اپنے والد گرامی سلمان احمد سے فون پر بات کر رہا تھا اُس کی حالت اچھی خاصی غیر ہو رہی تھی۔ ندا کے گھر سے چلے جانے کے بعد اُسے تو یہ تسلی ہوئی تھی کہ وہ اُس گھر میں گئی ہے جہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اس لیے وہ جلدی واپس تو نہیں آ سکتی تجہیز و تدفین کے بعد ہی وہ اس گھر میں واپس آ سکے گی۔
جب اُس نے اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا دیا تو ذہن خود بخود اپنے پسندیدہ شغل کی طرف مڑ گیا اُس نے وسکی کی آدھی بوتل صرف آدھے گھنٹے میں ختم کر دی تھی اور اس وقت وہ نشے کی کیفیت میں بڑے بے ساختہ انداز میں دل کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔
دوسری طرف سلمان احمد اُس کی حالت زار سے بے خبر پریشانی کی کیفیت میں پوچھ رہے تھے۔ تم کیوں ڈپریسڈ ہو اگر گھر کے دام نہیں لگ رہے تو کوئی بات نہیں...... واپس آ جاؤ سال چھ مہینے کے بعد دوبارہ چکر لگا لینا کیا پتہ Political Situation Change ہونے کے بعد پراپرٹی کے دام بڑھ جائیں۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے تھوڑا صبر اور کر لیتے ہیں...... میری طرف سے تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں واپس آنا چاہتے ہو...... واپس آ جاؤ۔''
سلمان احمد کی بات پر توجہ دیے بغیر ارسلان صرف اور صرف اپنے احساسات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا...... پھر پھٹ پڑنے والے انداز میں گویا ہوا۔
''پاپا Go To Hell Property...... میں اس وقت آپ سے پراپرٹی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' ارسلان کی بات پر سلمان احمد بری طرح چونک پڑے تھے۔

''تو پھر تم کیا کہنا چاہ رہے ہو...... کیوں ڈپریسڈ ہو کیا ہوا ہے؟ ندا نے تمہارے ساتھ Misbehave کیا ہے یا اُس کے ہذبینڈ نے تم سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے لیکن تم کیوں اتنا سیریس ہو رہے ہو...... تم وہاں ہمیشہ کے لیے تو نہیں گئے ہو۔ اگر تمہیں ان دونوں کے ساتھ رہتے ہوئے Comfortable Feel نہیں ہو رہا تو واپس آ جاؤ میں نے تمہیں اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر ڈپریسڈ ہو جاؤ۔ یہاں پر بھی بہت کام ہیں جو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''پاپا Try To Understand...... پہلے آپ سن تو لیں کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتا ہوں۔'' ارسلان کی آواز نشے کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی جس کو ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا باپ Communication Error Consider کر رہا تھا۔

''ہاں ہاں بولو سن رہا ہوں میں۔'' سلمان احمد کی آواز Ear Piece میں ابھری۔

''پاپا دو فلاپ شادیوں کی وجہ سے میری پرسنالٹی Damaged ہو گئی ہے۔ جب فیملی میں اتنی اچھی لڑکی موجود تھی تو آپ نے آپشن کیوں نہیں دیا۔ آپ کا تو Blood Relation ہے۔ Direct Relation ہے۔ کاش...... کاش کہ آپ مجھے یہ آپشن دیتے اور میں آپ کی بات مان لیتا تو آج اس حال میں نہ ہوتا۔ یہ میری لائف کا بہت بڑا Loss ہے۔'' ارسلان اُسی طرح نشے میں ڈوبا ہوا اپنے دل کی بات باپ کے ساتھ شیئر کر رہا تھا گویا اپنا دکھ بانٹ رہا تھا۔ وہ دکھ جس کا انکشاف شاید اُسے کچھ دیر پہلے ہی ہوا تھا۔ نشہ چڑھتے ہی ندا ٹوٹ کر اُسے یاد آنے لگی۔ ندا کی معصومیت' بے ساختگی اور اُس کی حماقتیں ارسلان کو گویا لوٹ کر لے گئی تھیں۔

امریکا میں گیارہ بارہ سال کی لڑکی کو مکمل آگہی مل جاتی ہے وہ سماجی اور ازدواجی بہت سے معاملات سے آگاہ ہو جاتی ہے تجرباتی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ بہت کچھ جان چکی ہوتی ہے۔ اُس امریکن دوشیزہ کے مقابل ندا تو ایسے ہی تھی۔ جیسے سات آٹھ سال کی بچی جس کو جھولا جھولتے ہوئے آئس کریم کھانے کے خیال سے ہی روحانی مسرت محسوس ہوتی ہو۔

''Shutup......'' سلمان احمد کی اب قدرے خفا خفا سی آواز ارسلان کی سماعت سے ٹکرائی جس پر اُس نے معمولی سی بھی توجہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

''ندا کی بات کر رہے ہو...... بکواس کر رہے ہو۔ آخر تمہیں ایکدم سے کیا ہوا ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں پاکستان گئے ہوئے اس سے پہلے تم نے مجھ سے اس قسم کی کوئی فضول بات نہیں کی۔ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ اور بات سنو...... وہ شادی شدہ ہے۔ کسی کی بیوی ہے بہت ہی غلط بات کی ہے اس وقت تم نے...... مجھے دکھ بھی محسوس ہو رہا ہے اور غصہ بھی آ رہا ہے۔ اس طرح کی کوئی بات سوچنے سے پہلے تمہیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اب وہ کسی شریف آدمی کی بیوی ہے۔'' سلمان احمد نے اب اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔

''یہی تو کہہ رہا ہوں کہ اب وہ کسی کی بیوی ہے اور کسی کی بیوی کے بارے میں اس طرح سوچنا Corruption ہے۔ لیکن سوچ پر کس کا اختیار ہے۔ یہ میری زندگی کا Total Loss ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے پاپا......'' اب ارسلان نے جس طرح اٹک اٹک کر بات کی اُس پر سلمان احمد چونک پڑے تھے اور قدرے سکون کا سانس لیا تھا۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ اس وقت ارسلان اپنے حال میں نہیں ہے۔
''میرا خیال ہے تمہیں تھوڑی دیر کے لیے سو جانا چاہیے تم اس وقت Drunk ہو۔'' انہوں نے فوراً ہی گویا ساری بحث سمیٹ دی تھی اور فون بند کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن فون بند کرنے سے پہلے وہ یہ یقین کر لینا چاہتے تھے کہ ارسلان واقعی نشے میں ہے۔ وہ اپنی بات کا ردِعمل سننے کے لیے متوجہ ہو گئے۔
چند سیکنڈ کے سکوت کے بعد ارسلان کی آواز ابھری۔
''پاپا...... میں بالکل ہوش میں ہوں۔ ڈونٹ وری میں Drunk نہیں ہوں۔'' ارسلان کی بات سن کر سلمان احمد نے چند لمحے سوچا پھر ایک خیال سے چونک پڑے۔
''کیا ندا اور اُس کا ہزبینڈ اس وقت گھر میں ہیں؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔
''نہیں اُس کے ہزبینڈ کی ماں مر گئی ہے وہ تو اُس کو رونے گیا ہوا ہے۔ ندا کو میں نے بھیج دیا تھا۔ وہ تو جا ہی نہیں رہی تھی۔''
''پاپا میں دعا کر رہا ہوں کہ وہ شخص فراڈ ثابت ہو جائے اور ندا جلد سے جلد اُس سے نجات حاصل کر لے۔ اگر ندا کا پیچھا اُس شخص سے چھوٹ گیا نا پاپا میں پہلی فرصت میں اُس سے شادی کر لوں گا۔ مجھے ندا جیسی بیوی ہی سنبھال سکتی ہے۔ پاپا دو عورتوں نے مجھے اچھا خاصا ذلیل کر کے رکھ دیا ہے میری عزت بھی گئی میرا مال بھی گیا...... ندا سے مجھے کوئی خوف نہیں ہوگا۔ وہ نا مجھے کبھی ذلیل کرے گی اور نا مجھ سے میرا مال مانگے گی۔ پاپا مجھے جب بھی موقع ملا میں اُن دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ پاپا میں آپ سے بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ I Will Kill Them...... نہیں چھوڑوں گا میرے پاس کیا نہیں تھا...... وہ فراڈ عورتیں مجھ سے سب کچھ لے گئیں میں اُن کو نہیں چھوڑوں گا جب تک اُن کو جان سے نہیں مار دوں گا مجھے ایک پل کا چین نہیں ملے گا۔ پاپا آپ سن رہے ہیں نا...... پاپا Listen Carefully......'' سلمان احمد کی طرف سے کوئی ردِعمل نا پا کر ارسلان اُن کو اس طرح پکارنے لگا جیسے وہ اُس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوں۔
سلمان احمد کو اب سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔
''میں فون بند کر رہا ہوں...... تم کل صبح جب سو کر اٹھو تو مجھ سے بات کرنا...... Take Care۔'' کہہ کر سلمان احمد کی طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔
ارسلان سلسلہ منقطع ہونے کے بعد اپنے I Phone کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اُسے کسی اور طرف متوجہ ہونے کے لیے ارادے کی ضرورت تھی اور اس وقت وہ اپنی ہر قسم کی سرگرمی کو بھلا کر صرف اور صرف ندا کی طرف متوجہ تھا۔

☆......☆......☆

یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مجھے یہ خوشخبری سننے کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔
فردوس ربیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھائے بھرپور خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ آج صبح سے ربیعہ نے چوتھی مرتبہ قے کی تھی اور اس وقت وہ خالی پیٹ ہونے کی وجہ سے بالکل نڈھال نظر آ رہی تھی۔
فردوس کی جہاندیدہ نگاہوں نے ربیعہ کی حالت دیکھ کر ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا کہ ربیعہ بہت جلد اُن کے لیے پوتے کا تحفہ دینے کی تیاری کر رہی ہے۔

''امی جان میری حالت دیکھیے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے بس تھوڑی دیر میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ اور یہ میرا ہاتھ دیکھیے۔'' ربیعہ نے اپنا سید ھا ہاتھ فردوس کے سامنے کیا۔

''دیکھ رہی ہیں آپ کتنی کپکپی ہے مجھے اتنی ویکنیس محسوس ہو رہی ہے...... بس یوں لگ رہا ہے کہ تھوڑی دیر میں، میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔''

''ارے اچھی اچھی باتیں کرو بیٹا...... چلو اٹھو میں تمہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں...... جس خوشخبری کی بات میں کر رہی ہوں نا وہ خوشخبری اب تم ڈاکٹر کے منہ سے سننا۔ چلو شاباش......'' فردوس ربیعہ کو اٹھانے کے لیے پوری جدوجہد کرنے لگی۔ لیکن اُس کو اِس وقت اپنی جگہ سے ہلانا محال لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ بے دم انداز میں بالکل ریت کے ڈھیر کی طرح بیڈ پر آڑی ترچھی گری ہوئی تھی۔

''امی جان پلیز...... تھوڑی دیر کے لیے آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں میں تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹوں گی تو شاید میری طبیعت سنبھل جائے۔'' ربیعہ بہت کمزور اور نڈھال آواز میں ساس سے ہمکلام ہوئی۔

''بیٹا تھوڑی سی ہمت تو کرنا پڑے گی ظاہر ہے صبح سے تم نے چار مرتبہ قے کی ہے پیٹ میں تمہارے کچھ ہے نہیں...... کمزوری نہیں ہوگی تو کیا تم دوڑیں لگاتی پھرو گی۔ چلو اٹھو میں تمہیں تھوڑا سا سیب کاٹ کر دیتی ہوں۔ دو تین قاشیں کھا لو تھوڑا سہارا ملے گا تو اٹھنے کی ہمت بھی ہوگی۔ میں حامد حسین سے کہتی ہوں کہ وہ گاڑی تیار کریں تمہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اللہ نے مجھے پوتے کی خوشخبری سنائی ہے۔''

''امی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو...... پتہ نہیں مجھے فوڈ پوائزن ہو گیا ہے کیا مسئلہ ہوا ہے صبح سے مجھے Vomiting ہو رہی ہے۔ آپ پتہ نہیں کیا کرنے لگی ہیں۔''

''ہاں ہاں بس بس منہ سے بدفالیں مت نکالو۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ ارے اس وقت میں چار بیٹوں کی ماں ہوتی۔ تین مرتبہ حمل ضائع ہوا تو چوتھی مرتبہ جا کر میں نے یادر کی شکل دیکھی۔ اللہ میرے بچے کو جیتا سلامت رکھے اُسے لمبی عمر دے صحت تندرستی کے ساتھ...... اللہ اُسے اپنی اولاد کی خوشیاں دکھائے بس اب اپنا منہ بند رکھنا کچھ اور مت بولنا دل گھبراتا ہے ارے پتہ نہیں کتنے ارمانوں کے بعد یہ دن آیا ہے۔ میں نے خوشخبری سنی...... تمہیں کیا پتہ میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر اِس خوشخبری کو سننے کے لیے دعائیں کیں ہیں۔

''ارے دنیا کو ایسی خوشخبریاں صبح دوپہر شام ملتی ہیں میں نے کتنی گڑگڑا کر رو رو کر دعائیں مانگیں یا رب العالمین مجھے بھی ایسی خوشخبری سنا دے...... دنیا کو بانٹتا ہے تیرے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔ بیٹا میری راتوں کو مانگی ہوئی دعا قبول ہوئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ، چلو میرا بیٹا تھوڑی سی ہمت کرو چلو اٹھ کر بیٹھو میں تمہارے لیے سیب کاٹ کر لاتی ہوں۔ خالی پیٹ ہے ہمت کہاں سے ہوگی۔ لیٹے لیٹے دو تین قاشیں کھا لو خود بخود ہمت آ جائے گی۔''

خوشی کے مارے فردوس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے وہ اُفتاں و خیزاں کمرے سے باہر دوڑ گئیں۔

ربیعہ اتنی آؤ بھگت دیکھ کر روحانی مسرت محسوس کر رہی تھی۔ مگر خوشی کی انتہا پر ایک فطری امر ہے کہ

انسان کو کوئی ہلکا سا اندیشہ بھی تنگ کرنے لگتا ہے کہ کہیں یہ خوشی کوئی واہمہ نہ ہو۔
کہیں امی جان کو یونہی کوئی گمان تو نہیں ہو رہا...... شادی سے پہلے بھی ایک بار فوڈ پوائزن ہوا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جو فردوس سمجھ رہی ہیں وہی حقیقت ہو۔

☆......☆......☆

''ارسلان بھائی آپ یہاں کیوں مرے ہوئے پڑے ہیں اٹھیں میری سنیں دیکھیں میری طرف......''
ندا شدید غصے کی کیفیت میں ارسلان کا بازو جھنجوڑ رہی تھی جو پوری بوتل ختم کرنے کے بعد بالکل بے خبری کی کیفیت میں خراٹے نشر کر رہا تھا۔ ندا نے اتنی زور زور سے اُس کا بازو جھنجھوڑا تھا کہ اگر وہ عام حالات میں سویا ہوا ہوتا تو ہڑبڑا کر اُٹھ کر بیٹھنے کی بجائے سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن ندا کے بری طرح جھنجھوڑنے کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اُس نے ندا کی طرف سے کروٹ لینے کی کوشش کی۔
''ارسلان بھائی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے وہ شخص چیٹر ہے فراڈ ہے...... اُف میرے خدایا میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنا Decent نظر آنے والا بندہ اتنا بڑا فراڈ ہے اُس نے ٹھیک ٹھاک نہیں بہت بری طرح مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ ارسلان بھائی...... اٹھیے سنیے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ برباد کر دیا ہے اُس شخص نے مجھے...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کوئی بہت نیک انسان ہیں اور آپ کو فرشتے آ کر سب کچھ بتا دیتے ہیں آپ نے بالکل ٹھیک بتایا تھا اُس کی بیوی موجود ہے میں اُسے مل کر آ رہی ہوں۔ اٹھیے نا پلیز میری بات سنیے۔'' ندا نے پھر ارسلان کو بازو اور کمر سے پکڑ کر بری طرح سے ہلا کر رکھ دیا۔
ارسلان نے بڑے بے زار کن انداز میں اوہوں...... ہوں کہا اور پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا اور آنکھوں پر اپنا سیدھا بازو رکھ لیا۔
''اُف میرے خدایا کیا ہو گیا ہے آپ کو...... کیا نیند کی گولی کھا کر سوئے ہیں۔'' ندا کو اُس کی حالت دیکھ کر کچھ محسوس ہوا تھا وہ جس طرح بھری ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی اور ارسلان پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ اب وہ کیفیت خود بخود زائل ہو...گئی۔ وہ بڑی حیرت کے ساتھ ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ نیند کی گولی کھا کر سوئے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی طبیعت خراب ہے اب ندا کو دوسرا خیال آیا۔ اُس نے جلدی سے ارسلان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اُس کا درجہ حرارت نوٹ کرنے کی کوشش کی جو اُسے پہلی دفعہ میں تو بالکل نارمل محسوس ہوا بلکہ وہ قدرے ٹھنڈا سا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کو ندا نے اپنے گمان پر محمول کیا اور تشویش بھری نظروں سے ارسلان کو ہونقوں کی طرح گھورنے لگی۔
ارسلان کے خراٹے بہت بلند بانگ تھے۔ ندا کے کانوں میں اچھی خاصی سمع خراشی ہو رہی تھی وہ قدرے دور ہٹ گئی۔ دور ہٹتے ہوئے یوں اُسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے ارسلان کی سانسوں سے بڑی نامانوس سی مہک آ رہی ہو۔ اُس نے آج سے پہلے الکوحل کی بو نہیں سونگھی تھی اس لیے وہ کسی اندیشے یا سوچ بچار میں نہیں پڑی بلکہ فکر مندی سے ارسلان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔
''اِن کو کیا ہو گیا ہے؟ میں تو سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی میں گھر جاؤں گی فوراً ارسلان بھائی کو اُس شخص کی چیٹنگ کا بتاؤں گی تو وہ مجھے لے کر اُسی وقت نکل کھڑے ہوں گے اور ثمر سے اچھی طرح نمٹیں گے۔ ظاہر ہے

ارسلان بھائی میرے بھائی ہیں کزن ہیں اس سچویشن میں انہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔ اُن کو پوچھنا چاہیے کہ اُس نے یہ سب میرے ساتھ کیوں کیا واقعی جو ارسلان بھائی کہتے تھے وہ ٹھیک تھا۔ انہوں نے مجھے لا وارث سمجھا ہوا تھا صرف بوڑھے نانا کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے میرے جو مرضی کریں گے انہیں ورہی نہیں ہوگا۔ کوئی اُن کچھ بگاڑ ہی نہیں سکے گا۔ لیکن اب ارسلان بھائی کو ثمر کے ساتھ بات کرنا ہوگی پوچھنا ہوگا۔

اگر ثمر نے پہلی بیوی کے ساتھ پہلے کی طرح تعلقات رکھے ہوئے ہیں تو اب اُس عورت کو طلاق دینا ہوگی۔ میں ثمر سے طلاق نہیں لوں گی۔ میں ساری زندگی ثمر کو اچھی طرح سبق سکھاؤں گی طلاق ہوگی تو ثمر کی پہلی بیوی کو ہوگی۔ میں کیوں اپنا تماشا بناؤں......بس اب ارسلان بھائی کو یہ کام کر کے ہی جانا ہے لیکن یہ اٹھیں......تو سہی۔ وہ پھر تیر کی طرح آگے بڑھی اور ارسلان کے بازو کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر باقاعدہ گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''ارسلان بھائی خدا کے لیے اُٹھ جائیں رات نہیں ہے یہ دن ہے آپ اس بری طرح سو رہے ہیں رات کو کیسے سوتے ہوں گے۔ ارسلان بھائی اٹھیے پلیز...... کیا ہوگیا ہے آپ کو؟'' وہ پھر فکرمندی سے ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر یونہی اُسے خیال آیا کہ شاید ارسلان اُس کے ساتھ شرارت کر رہا ہے۔ ورنہ جس طریقے سے وہ اُسے اُٹھا رہی تھی اُسی طریقے سے تھوڑی دیر اور محنت کرے تو مردہ بھی اُٹھ کر بیٹھ جائے۔

''ہوں...... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ ارسلان بھائی یہ مذاق کا وقت نہیں ہے بہت سیریس معاملہ ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ نے جو کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا اور آج کی ڈیٹ میں Correct ہوگیا ہے۔

ندا اب اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ارسلان سے مخاطب تھی اُس نے اب بولنے کی بجائے ارسلان کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں کیونکہ وہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ شرارت کرتے ہوئے ارسلان کتنی دیر تک اپنی مسکراہٹ ضبط کر سکتا ہے۔ 2 سے 3 منٹ تک اُس نے ارسلان کے چہرے پر نظریں جمائے رکھیں لیکن اُسے بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ ارسلان مذاق نہیں کر رہا۔ اب اُس کے نرم احساسات شدید ترین تشویش میں تبدیل ہو رہے تھے۔

''ہیں...... کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں...... بے ہوش تو نہیں ہیں۔ حالت دیکھ کر تو لگ رہا ہے شاید مر گئے ہیں...... لیکن مردہ خراٹے تو نہیں لیتا۔'' ندا نے اپنی احمقانہ سوچ پر خود ہی اپنا سر پیٹ لیا۔

''جب سے آئے ہیں اس طرح تو کبھی نہیں سوئے۔''

ندا اپنی پتا بھول کر نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ کہاں تو جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک جنون سوار تھا کہ اپنا دکھڑا اختصار سے گوش گزار کر کے ارسلان کو مجبور کرے گی کہ ابھی اور اسی وقت وہ ثمر سے دو دو ہاتھ کرنے اس کے ساتھ چلے ورنہ وہ رات نہیں گزار سکے گی اور صدمے کی شدت سے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

وہ بے بسی سے ارسلان کی طرف دیکھنے لگی۔ اٹھنے والے طوفانوں کے بگولے بھی تھمنے لگے۔ ذہن قدرے پُرسکون ہوا تو وہ مزید قریب ہو کر ارسلان کا سرسے پیر سے جائزہ لینے لگی تو اسے ماحول میں عجیب

اور نامانوس سی بو کا احساس ہوا تو چونک پڑی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ یہ بو تو ارسلان کی سانسوں سے آ رہی ہے اب اُسے ایک نئی تشویش نے آلیا...... یہ Smell کیسی ہے......'' وہ سوچنے لگی۔

☆......☆......☆

بانو آپا اپنے ہاتھوں سے بنائے سنوارے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوچکی تھیں۔ جنازہ اٹھنے کے تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ قریب سے آئی ہوئی خواتین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔

افشاں کیونکہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی اس لیے اُس کے شوہر نے اُسے ایک الگ کمرے میں لے جا کر سلا دیا تھا۔ وہ بھی کئی دن کی جاگی ہوئی اور رو رو کر نڈھال ہوچکی تھی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد گہری نیند میں ڈوب گئی تھی۔

کافی ساری خواتین وہ تھیں جن کے شوہر جنازے کے ساتھ گئے تھے اور وہ اُن کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ جنازہ اٹھنے کے بعد ماحول میں ذرا سکوت طاری ہوا تو چمن کو مہوش اور ماہ پارہ کا خیال آیا عطیہ بیگم کافی دیر سے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے ابھی تک چمن کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شاید اُس کی وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے جو سپارہ شروع کیا ہوا تھا اُسے وہ مکمل کرنے کی نیت کر کے پڑھ رہی تھیں۔

چمن نے اپنے ہینڈ بیگ سے سیل فون نکالا تو اُسے پتہ چلا کہ ڈاکٹر علی عثمان نے اُسے کئی مرتبہ ٹرائی کیا تھا۔

''اوہ...... مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا......'' اُس کے منہ سے بڑبڑاہٹ کے انداز میں چند الفاظ نکلے پھر اُس نے سامنے بیٹھی ہوئی خواتین کی طرف دیکھا۔ قدرے سوچا۔ پھر ہینڈ بیگ رکھ کر دور سیل فون لے کر لاؤنج کی طرف آ گئی۔ اور ڈاکٹر علی عثمان کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی رنگ پر ڈاکٹر علی عثمان نے کال پک کر لی تھی۔

''ہیلو السلام علیکم......'' ڈاکٹر علی کی آواز چمن کی سماعت سے ٹکرائی۔

''جی ڈاکٹر صاحب وعلیکم السلام...... I Am So Sorry...... ابھی کچھ دیر پہلے ہی امی جان کو یہاں سے لے کر گئے ہیں اور...... مجھے ایکدم خیال آیا کہ میں نے آپ کی آج اچھی خاصی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے آپ کو فون کرنے کے لیے سیل ہاتھ میں لیا تو دیکھا کہ آپ کی مسڈ کالز آئی ہوئی ہیں I Am So Sorry...... یہاں پر اتنی مصروفیت رہی کہ سیل فون کی طرف خیال ہی نہیں گیا۔''

''ارے آپ کو بالکل بھی سوری کرنے کی ضرورت نہیں...... اس سچویشن میں تو کسی قسم کی معذرت کرنا بنتا ہی نہیں...... ایکچوئلی میں نماز جنازہ میں شریک ہونا چاہتا تھا اسی لیے آپ سے ٹائم معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ ہاسپٹل میں دو ڈاکٹرز چھٹی پر گئے ہوئے ہیں اس لیے اِدھر بہت کچھ مینج کر کے ہی نکلنا ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر علی عثمان وضاحت کر رہے تھے اور چمن سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا کہ فون بہانہ بن گیا۔ اُن کو تو یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

جو پردے پڑے ہوئے ہیں وہ پڑے رہیں تو بہتر ہے۔

''کوئی بات نہیں...... اِدھر تو امی اور میرے علاوہ آپ کو کوئی نہیں جانتا۔'' چمن کے منہ سے خود

بخود یہ الفاظ پھسل گئے تھے۔

ڈاکٹر علی عثمان یہ سن کر بری طرح چونک پڑے تھے۔

ان کے گھر میں چمن اور بچیوں کا آنا جانا رہتا ہے اور چمن کے شوہر کو یہی معلوم نہیں کہ اُس کی بیوی کی دن بھر کیا مصروفیات رہتی ہیں؟''

سوال فطری تھا مگر وہ کرنے کے مجاز نہیں تھے کیونکہ یہ براہ راست ذاتیات میں مداخلت کرنے والی بات ہوتی۔

''چلیں خیر...... اخلاقی طور پر مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت تو کسی بھی جگہ کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور آپ سب کو صبر عطا فرمائے آمین۔'' انہوں نے سوال ذہن سے جھٹک کر اپنا اخلاقی کردار ادا کیا۔

''آمین......'' چمن کو کہنا پڑا کہ آخر کچھ تو کہنا تھا۔

''اب یہ ہوسکتا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے گھر حاضر ہو کر آپ کے ہزبینڈ سے تعزیت کروں۔ آپ کے حوالے سے یہ میرا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ ٹینا کے لیے جو زحمت کرتی ہیں اس کا تو شکریہ ادا نہیں جاسکتا۔'' وہ اپنی دانست میں تو روانی میں بات کر رہے تھے۔ مگر لاشعور میں چھپے ہوئے سوالات انہیں کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور کر رہے تھے۔

کہ شاید وہ جو سمجھ رہے ہیں وہ صریحاً غلط ہو...... اور چمن کی کسی بات سے ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ آئیڈیل زندگی گزار رہی ہے۔ وہ دل میں ہونے والی کھٹک سے قدرے بے چین تو تھے مگر فوری طور پر اپنی اس بے چینی کو کوئی نام دینے کا راستہ یا یارا نہیں پاتے تھے۔

''ٹھیک ہے میں کچھ دیر بعد بچیوں کو لینے آتی ہوں۔ خدا حافظ۔'' اس سے پیشتر کہ وہ مزید بات کرتے چمن نے اپنی طرف سے فون بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

ندا اس صورت حال سے بہت زیادہ پریشان ہوگئی تھی۔ خالی گھر میں ارسلان کے خوفناک قسم کے خراٹے گونج رہے تھے ہزار کوششوں کے باوجود وہ اُٹھ کر نہیں دیا۔ تو ندا گرتی پڑتی نرگس کے پاس چلی آئی۔ اور چند منٹوں میں دل کی بھڑاس نکال کر ہلکی پھلکی ہوگئی۔ اُس نے تو دل کی بھڑاس نکال دی تھی لیکن نرگس کا سکتہ ٹوٹ کر نہیں دے رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑے مسلسل ندا کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''ارے سچ کہو تمہاری...... اُس کی بیوی کے ساتھ بات ہوئی ہے یا کسی نے تمہیں کہا تھا کہ یہ ثمر کی بیوی ہے۔ کیا پتہ کسی کو مغالطہ ہوا ہو...... ارے موت کا گھر تھا طرح طرح کے لوگ وہاں موجود ہوں گے۔ کوئی دور کے کوئی قریب کے......'' نرگس کافی دیر کے بعد بولنے کے قابل ہوئی تھیں۔ تو ایک تواتر سے بولتی چلی گئیں۔ اُن کی باتیں سن کر ندا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا بڑی بے بسی کی کیفیت تھی۔

''پلیز آنٹی پلیز...... آپ نے مجھے کیا پاگل سمجھا ہوا ہے میں نے کیا کہا ہے آپ سے کہ یہی نا کہ میں ثمر کی بیوی سے مل کر آرہی ہوں۔ اُس نے اپنا تعارف خود کرایا ہے میں نے پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں؟ مجھے بس یونہی خیال آیا تھا...... مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ میرے سامنے ثمر کی بیوی کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا

تھا کہ آپ کون ہیں؟ کہنے لگیں میں چمن ہوں مسز ثمر...... آپ کون ہیں؟ آنٹی مجھ سے تو بولا ہی نہیں گیا...... آنٹی آپ یقین کریں کہ...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی...... اور ظاہر ہے وہ موت کا گھر تھا...... کیا بات کرسکتی تھی...... فوراً ہی خیال آیا کہ مجھے آتے ہوئے ثمر سے مل کر آنا چاہیے تھا اور یہ بتا کر آنا چاہیے تھا کہ ثمر میں آپ کی بہت پیاری سی بیگم صاحبہ سے مل کر اب واپس جا رہی ہوں۔ لیکن آنٹی اُس وقت مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آئی لیکن میں ثمر کو چھوڑوں گی تو نہیں...... مجھے تو بہت کچھ کہنا ہے...... اور پھر دوسری پریشانی یہ کہ میں گھر آئی تو ارسلان بھائی اتنی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں جیسے نیند کی 10 گولیاں کھا کر سوئے ہوئے ہیں۔ کب سے اُن کو اُٹھا رہی تھی۔ مگر بھئی اُٹھ کر نہیں دیے تو بس میں آپ کے پاس آ گئی۔

''ارے تم اپنے اس رشتے دار کی تو بات نا کرو مجھ سے جان جلتی ہے میری...... اگر رشتے نبھاتے اتنے اچھے رشتے دار ہوتے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے تو آج جو تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ نا ہوتا ارے یہ تو اچھا خاصا تماشہ بن گیا ہے۔ تم کیا پوچھوگی میں پوچھوں گی...... ارے میرے پاس بیٹھا تھا نا رشتہ مانگنے کے لیے اور بہت مظلوم شکل بنائے بیٹھا تھا۔ جیسے اِس سے زیادہ کوئی...... غمزدہ اور دکھی انسان اِس دنیا میں نا ہو...... تم تو کیا اُس سے پوچھوگی جو میں اُس سے پوچھوں گی۔''

اب نرگس کے حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ طیش کی کیفیت میں بولتی چلی گئیں۔

''لیکن آنٹی جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا نا...... میں تو برباد ہوگئی۔ مجھے تو ثمر نے بہت اچھی طرح سے بے وقوف بنایا۔ اللہ آنٹی میں آپ کو کیا بتاؤں...... مجھے کہتے تھے مجھے اُس عورت سے نفرت ہے اور تم سے مجھے عشق ہوگیا ہے۔ میں...... میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ چمن کے ساتھ شادی ارینج میرج تھی۔ تم سے تو میں لو میرج کر رہا ہوں پتہ نہیں کیا کیا کہتے تھے۔ آنٹی میں آپ کو کیا کیا بتاؤں۔''

''تم مجھے کچھ نہ بتاؤ مجھے سب کچھ سمجھ آگئی ہے اور بات سنو جس مرد نے دوسری شادی کرنی ہوتی ہے نا اور وہ کردار کا صحیح نہیں ہوتا دوسری شادی کرنے سے پہلے اسی طرح کی باتیں کرتا ہے ارے میری تو مت ماری گئی تھی مجھے تو اُسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب بھی شادی شدہ شخص اپنی شادی شدہ زندگی کے بارے میں یہ کہے کہ بہت بری طرح سے برباد ہوگیا ہوں شادی نے تو میری زندگی کا چین اور سکون چھین لیا ہے اور اب تو دو ہی راستے ہیں یا تو میں زہر کھا کر مرجاؤں یا پھر کسی اچھی سی لڑکی سے دوسری شادی کر کے سکون کی زندگی گزاروں تو سمجھ جاؤ کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ارے جو شخص ایک عورت کے ساتھ 7 سال رہنے کے بعد پرائے لوگوں کے سامنے اپنی بیوی کی ہزاروں برائیاں کرے اُس کو برا بھلا کہے وہ کبھی بھی صحیح نہیں ہوتا ارے شریف اور عزت دار مرد تو طلاق دینے کے بعد بھی اپنی بیوی کی برائیاں دوسروں کے سامنے نہیں کرتے۔''

اُس نے تو اُس بیوی کو طلاق بھی نہیں دی تھی جس کی وہ ہزاروں برائیاں تمہارے سامنے کرتا رہا۔''

''مگر جب کوئی مرد لڑکی پھنسانے کے لیے اپنی بیوی کی برائیاں کرتا ہے تو لڑکی بھی پھولی نہیں سماتی کہ اسے ایک عورت پر برتری دی جارہی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا۔''

نرگس کو ازحد قلق ہو رہا تھا کہ وہ خود ثمر کی ظاہری شرافت پر کیوں اُلجھ گئیں...... یہ تو ان کی بھی کوتاہی

ہے۔

انہیں ثمر کی بیوی سے ضرور ملنا چاہیے تھا...... جبکہ یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ وہ اپنے منہ سے کہہ چکا ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔

''آنٹی اب بتائیں ناں...... میں ثمر کے ساتھ کیا کروں؟ ان سے کس طرح بات کروں؟ ان سے ملنے سے انکار کردوں......؟'' ندا بری طرح اُلجھی ہوئی تھی۔

''یہ تو ایک قیامت سی تھی۔ قیامت کے تصور کے ساتھ یہی خیال آتا ہے کہ ایک ایسا زوردار دھما کا ہوگا کہ مردے بھی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ اسے تو یونہی لگ رہا تھا کہ جیسے آج تک مری پڑی تھی اور صدیوں کی موت کے بعد کسی قیامت نے دوبارہ زندہ کردیا ہو۔ اب اپنے دماغ کو ذرا ٹھنڈا رکھو۔

''ابھی اُس کی ماں کی فوتگی ہوئی ہے...... جذبات میں سیدھا کام بھی اُلٹا ہو جاتا ہے۔

نرگس سمجھانے لگیں۔ ساتھ ساتھ کچھ سوچ بھی رہی تھیں۔

کام تو الٹا ہو گیا ہے۔

اب رہ کیا گیا ہے۔ بھانڈا تو پھوٹ گیا ہے ناں...... ندا روہانسی ہونے لگی۔

''نہیں...... اب ایسا بھی نہیں کہ کچھ ہاتھ میں نہ رہا ہو۔''

''کچھ دن گزرنے دو...... پھر بتاتی ہوں کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔'' نرگس نے روتی ہوئی ندا کو سینے سے لگا کر بہت اعتماد سے کہا تھا۔

☆......☆......☆

چمن عطیہ بیگم کے ساتھ مہوش اور ماہ پارہ کو لینے ڈاکٹر علی عثمان کے گھر پہنچ گئی تھی۔ ڈاکٹر علی اپنے گھر کے لان میں چمن کا انتظار کرتے پائے گئے چمن گھر میں داخل ہوئی تو وہ بڑی تیزی سے اُٹھ کر اُن دونوں کی طرف آئے۔

آپ نے بہت زحمت کی میرے خیال ہے کہ...... آج رات آپ بچیوں کو یہیں چھوڑ دیں تو...... کوئی مسئلہ نہیں ہوگا...... دیکھیں آپ کے گھر میں ڈیتھ ہوئی ہے اور جس گھر میں ڈیتھ ہوتی ہے لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں۔ آپ بہت مصروف رہیں گی اور آنٹی بھی آج بہت تھک گئی ہوں گی۔ تھوڑا سا ان کو بھی ریسٹ ملنا چاہیے یہاں تو نینا کی Maid بچیوں کو سنبھال لے گی آپ لوگ ریسٹ کریں میں اس سچویشن میں آپ لوگوں کی بس یہی اخلاقی مدد کرسکتا ہوں اگر آپ قبول کریں تو۔''

ڈاکٹر علی عثمان نے بڑے خلوص سے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ...... یہ جو آج آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے ہمارے لیے یہی بڑی بات ہے۔ چمن اور میں پُرسے میں سکون سے بیٹھ سکیں کہ یہاں پر بچیوں کی دیکھ بھال ہورہی تھی۔ ورنہ بچیوں کو ایسے ماحول میں ساتھ رکھنا اور سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے...... عطیہ بیگم جلدی سے بولیں اُن کی بیتاب نگاہیں اپنی نواسیوں کو تلاش کررہی تھیں جن کو دیکھے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

''جی...... امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ڈاکٹر صاحب یقین کیجیے کہ آج بچیاں یہاں رہیں تو ہم بھی سکون سے اپنے کام کرتے رہے...... لیکن امی جان تو اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوچکی اور اب سارے کام ختم

ہو گئے۔''

''تو آپ بچیوں کو لے کر اپنے گھر جائیں گی۔'' ڈاکٹر علی نے یونہی پوچھ لیا۔ چمن لاشعوری طور پر چونک پڑی تھی۔

''اپنے گھر......'' اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا...... مگر اُس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا۔

''جی...... جی......! امی ہی کی طرف جا رہی ہوں۔'' چمن کے جواب سے ڈاکٹر علی کو کچھ اچھنبا سا محسوس ہوا...... کچھ ایسا جو بڑا نامانوس سا تھا لیکن اُس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا اور احساسات کے لیے مناسب الفاظ میسر نہیں آ رہے تھے۔

یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ آنٹی کی طرف جا رہی ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر علی عثمان نے اپنی سوچ کو مناسب الفاظ میں ظاہر کیا تا کہ چمن کی طرف سے جو بھی جواب ہو۔ اُس کے بعد اُن کے پاس کوئی سوال نہ ہو۔

''جی...... میں امی ہی کی طرف جا رہی ہوں...... ارے بیٹیا...... ڈاکٹر علی عثمان...... ہمارے اپنے ہی ہیں ان سے کیا چھپانا...... بتا دو اِن کے کہ اب تمہارا اُس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم رسمِ دنیا نبھانے اُس گھر میں تھوڑی دیر کے لیے گئی تھیں

''بیٹیا بات یہ ہے کہ اب چمن کا اُس گھر سے کوئی تعلق رہا نہیں اور فی الحال ہم دنیا داری نبھا رہے ہیں۔'' عطیہ بیگم کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ وہ شاید علی اور چمن کے سوال جواب کے اُلجھاؤ سے تنگ پڑ گئی تھیں۔ بے ساختہ اور جھنجلائے انداز میں بول پڑی تھیں۔ یوں بھی اُن کے لیے یہ کارِ مشقت ہی تھا۔ اُن لوگوں سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہا تھا اُن کے لیے اب زندگی کے کئی گھنٹے صرف کر کے آ رہی تھیں۔ دنیا داری نبھائی تھی فارغ ہو گئی تھیں اب ہر مصلحت کسی چٹانی پتھر کی طرح اُن کے اعصاب پر گرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

چمن عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر ہی رہ گئی۔ ڈاکٹر علی عثمان البتہ حیران حیران سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''I Am Sorry...... شاید میری کسی بات سے آنٹی ہرٹ ہوئی ہیں۔ I Am So Sorry...... ایکچوئلی مجھے تو...... کچھ بھی پتہ نہیں میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' چمن کے شرمندہ شرمندہ انداز...... ڈاکٹر علی کو چمن سے زیادہ شرمندگی میں مبتلا کر رہے تھے۔

''چمن کا اُس گھر سے کوئی تعلق نہیں......'' یہ انکشاف تھا کوئی عام سی خبر نہیں۔

اس پر سے چمن کا جھکا ہوا سر جو اس چونکا دینے والی خبر کی تصدیق کرنے کے لیے کافی تھا یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی سوال ظاہر کر کے اپنی ذاتی دلچسپی کا عندیہ دیتے۔

''پلیز آپ تشریف رکھیے میں بچیوں کو لے کر آتا ہوں۔'' ڈاکٹر علی عثمان ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے طوفانوں میں ہچکولے کھاتے بچیوں کو بلانے چلے گئے۔ چمن نے جیسے کھل کر سانس لیا اور گلہ آمیز نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

کاشی چوہان

خالی ہے کاسۂ دل

''بس یار! آج کچھ موڈ نہیں...... باقی کل......!'' اچانک اس مات پر وہ کہیں کھو گئے تھے۔ ''بچھی ہوئی بساط کو ادھورا نہیں چھوڑتے ہیں۔ کھیل تو پورا ہی ہوگا۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بول رہے تھے جبکہ ہنوز مونچھوں پر تاؤ جیسے اس وقت کوئی اور کھیل......

اخبار کو آہستہ آہستہ پڑھنے کی عادت علی رضا صاحب کی شاید اُس وقت سے ہی تھی جب انہوں نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہوگا۔ یہ خیال آمنہ بیگم کا بالکل ذاتی تھا۔

آج بھی ناشتہ دوسری مرتبہ گرم کرنے کے بعد انہیں غصہ ہی آ گیا تھا۔

''یہ اخبار ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' غصے میں الفاظ بھی تو ساتھ نہیں دیتے۔

''کیا کہا؟ اخبار ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' انہوں نے اخبار ذرا سامنے سے ہٹاتے ہوئے عینک نیچے کرتے ہوئے اُن سے کہا۔

''اوہو...... بھئی میرا مطلب ہے......''

''کر رہا ہوں ناشتہ...... سوری......'' چالیس سالہ شادی شدہ زندگی کا رٹا رٹایا جملہ پھر سے اُسی تازگی سے ادا ہوا تھا۔ جب پہلی بار آمنہ بیگم نے اُن سے ناشتہ گرم کر کے لانے پر خفگی کا اظہار کیا تھا۔

''کل سے یہ اخبار ناشتے کے بعد۔'' انہوں نے اُن کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ اور پھر اُن کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگیں۔

''آج دنیا اخبار سے دور بھاگتی ہے۔ چینلز خود خبریں بول دیتے ہیں۔ آپ پڑھنے میں وقت صرف کرتے ہیں۔'' دل کی تلخی زبان پر آ گئی تھی۔ ظاہر ہے بار بار ناشتہ سرد کرنا کہاں کا انصاف تھا۔ اخبار سے جیلسی تو لازمی تھی۔

''اتنا غصہ......'' وہ دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے آنکھوں میں محبت بھر کر بولے۔

''غصے کی بات ہی ہے...... آپ جانتے ہیں نا...... مجھے فروٹی اور سائبر کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔'' اصل وجہ بیان ہوئی۔

''آپ اُن کا اتنا خیال رکھتی ہیں نا...... اسی لیے وہ بگڑ گئے ہیں سائبر کا تو آج کل جاگنگ پر جانے کو بھی دل نہیں چاہتا...... دیکھ رہی ہیں نا آپ کس تیزی سے اُس کا پیٹ نکلنے لگا۔''

''خبردار جو اب کچھ کہا آپ نے...... میں اپنے سائبر کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی

ہوں۔ اور ہاں اپنی لاڈلی سے کہیں اپنا کوئی کام خود بھی کرلیا کرے...... میں اس عمر میں اُس کے مزید لاڈ نہیں اٹھا سکتی۔"

"اوہو...... بابا میری نازک سی فروشی آپ کو کتنا تنگ کردیتی ہے۔ کام ہی کیا ہوتے ہیں اُس کے......"

"جو بھی ہوتے ہیں...... ہوتے ضرور ہیں...... آپ کو تو بس جاگنگ اور فزکس سے فرصت نہیں...... آپ کون سے سیاستدان ہیں...... آپ نے تو ساری عمر ریونیو آفس کی دوسری منزل پر کاغذ کی زمینیں ہی امانت داروں کے سپرد کی ہیں نا۔"

"تو کیا یہ کوئی آسان کام ہے۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی نوکری خدا سے ڈر کر،

انصاف سے ادا کی...... باتیں کرتی ہیں آپ بس......''

''چلیے یوں ہی سہی لیکن......''

''کہیے کہیے رُک کیوں گئیں آپ؟''

''آپ نے نوکری ایمانداری سے ہی کی تھی نا...... کبھی نوالۂ حرام ہمارے پیٹ میں نہیں جانے دیا تو پھر......''

''بس...... اب کچھ نہ کہنا۔ تم جانتی ہو میرا مزاج...... میں دوغلا آدمی نہیں...... انصاف کا علم میں نے ہمیشہ بلند رکھا ہے۔''

''مگر پھر...... ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟'' آمنہ بیگم کی برداشت جواب دے گئی۔

''ہوتا ہے...... ہوتا ہے بیگم...... کبھی کبھی ناکردہ بھی سزا کاٹنی پڑتی ہے۔''

''یہ سزا ہے؟ علی رضا صاحب...... یہ سزا ہے؟ رستے ہوئے زخم ناسور بن جاتے ہیں...... تونی، بینا، علی، زری میرے آنگن کے مہکتے پھول......''

''سابرا اور فروشی نہیں ہیں تمہارے پاس۔''

''آنگن کے پیڑ دوسری زمین پر جڑیں مضبوط کرلیں تو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چھاؤں نہیں دیتیں۔''

''کیا ہوگیا ہے آمنہ بیگم...... آج آپ......''

''کہنے دیجیے مجھے علی رضا...... میں سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہوں...... زندگی ایک ایسی شاہراہ ہوتی ہے جس کی منزل کی خبر سب کو ہوتی ہے۔ منزل پر پہنچ کر تو سکھ ساتھی ہو جاتے ہیں۔ مگر...... ہم دیکھ ہی لیجیے۔ اس عمر میں بھی جدوجہد مستقل جدوجہد...... سانسیں لینے کی جدوجہد اندھے سماج میں آنکھیں کھلی رکھنے کی جدوجہد...... خود کو مفلوج ہونے سے بچانے کے لیے جسم کے اعضاء کو مستقل حرکت میں رکھنے کی جدوجہد...... وجود کے احساس کے لیے کسی بھی جاندار کو ساتھ رکھنے کی جدوجہد......''

''بس...... یا کچھ اور......'' علی رضا نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی پر ٹیک لگا کر آمنہ بیگم کو دیکھنے لگے۔

''کیا تھک گئے؟''

''آپ کو لگتا ہے ایسا......''

''مجھے جو جو کچھ لگتا ہے...... آپ کو نظر آسکتا ہے کیا؟''

''شاید......''

''نہیں علی رضا...... آپ کو نظر نہیں آسکتا۔ وجود کے ٹکڑے جب دور دور بس جائیں تو بھلا جو درد ہوتا ہے۔ وہ آپ کو کیسے نظر آسکتا ہے۔ رات کو جب سوتے سمے ''اپنے'' آنکھوں میں نیند کے ساتھ ساتھ اُتر آئیں اور آنسو دل میں گرنے لگیں وہ آپ دیکھ سکتے ہیں؟''

''آمنہ بیگم...... کیا ہوگیا ہے آپ کو...... آج آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ آپ کی سوچ کیسی دقیانوسی ہوگئی ہے۔ ماڈرن سوسائٹی میں موو کرتی ہیں آپ تو......''

''ہاں میں آج کی سوسائٹی میں موو کرتی ہوں۔ مگر...... وہ ایک ماں بھلے ہی آج کی ہو یا پچاس سال پہلے کی...... اُس کے جذبات، احساسات سب اندر سے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میں عورت کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی ہوں...... شاید میں غلط بول گئی...... میں ایک ماں بھی تو تھی نا......''

''تم ماں ہو، تھیں نہیں......''

''نہیں علی رضا...... سات سال ہوگئے ہیں

مجھ سے یہ اعزاز کہیں کھو گیا ہے۔ میں کس کی ماں ہوں...... میں فروٹی اور سائبر کی آیا تو ہو سکتی ہوں لیکن ماں نہیں...... ماں تو میں......''

''کس نے چھینا ہے آپ سے یہ اعزاز؟''

''جنہوں نے دیا تھا، انہوں نے ہی واپس بھی لے لیا...... اور دیکھیے کسی کو بھی پتہ نہیں چلا...... ہے نا......''

''ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ...... کیا ہو گیا ہے؟''

''یہی تو سوچتی ہوں کہ اب تک مجھے کچھ ہوا کیوں نہیں۔'' آمنہ بیگم کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔

''خیر...... قسمت...... فروٹی...... ویری آر یو...... کم ہری اپ......'' کمالِ ضبط سے انہوں نے آنسوؤں کو پلکوں کی باڑ عبور کرنے سے روکا تھا اور فوراً ہی آوازیں دیتیں اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

اُن کے جانے کے بعد علی رضا نے کرسی کی پشت سے کمر ہٹائی اور ٹیبل پر کہنیوں کے سہارے چہرہ لے کر پُرسوچ انداز میں بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

غلطی کہاں ہو گئی تھی۔ رزقِ حلال عین عبادت ہے کہ اصول پر کبھی سمجھوتہ نہ کرنے والا علی رضا اس نقطے کو ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی زندگی میں کبھی آیا ہی نہ تھا۔ ایمانداری اُس کا شعار تھا۔ جس کے تحت اُس کے چاروں بچے پروان چڑھے۔ اُس نے دل و جان سے انہیں علم کی دولت سے مالا مال کرایا اور پھر وہ سب اتنے بڑے ہو گئے کہ انہیں یہ ملک چھوٹا لگنے لگا۔ یہاں کے لوگوں کا اسٹینڈرڈ بھی اُن کے اسٹینڈرڈ سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ پہلے ایک پھر دوسرا اور پھر سب ہی پاکستان سے باہر چلے گئے۔ اور...... علی رضا؟ وہ بس جاتے ہوئے اُن کی دھول ہی دیکھتا رہ گیا۔ وقت گزرا...... موسم بدلے اور پھر پہلا سال تنہائی کے کلینڈر کی زینت بنا...... اس طرح کے پت جھڑ موسموں میں سرکتے سرکتے سات گہرے سال اندھیرا بن کر کھو گئے۔ آج ایک ہزار گز کی حویلی میں یادوں کے سائے حرکت کرتے دکھائی دیتے یا پھر تحفوں کی بارش کور ئیر کے ڈبوں میں الماریاں آباد کرتی نظر آتی تھیں۔

مگر وہ سب کہاں چلے گئے تھے جن کے دم سے یہ محل سرا آباد تھا۔ کیا مٹی کی کشش نے پیروں میں محبت کی بیڑیاں نہ ڈالی تھیں۔ کیا آبیاری کر کے پودوں سے درخت بنانے والے وجود بالکل ہی سرو کے پیڑ بن گئے تھے؟

''آہ...... ظالم وقت ہاتھ میں سوائے یادوں کے تیشے اور دل میں محبت کی برچھیاں پار کرتے کتنا گزر گیا تھا۔ علی رضا اور آمنہ بیگم دو جیتے جی زندگی کے کینوس پر بنی تصویر سے اڑتے رنگوں کی طرح ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ سارے رنگ یادوں کی دھند اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔

''یارب وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ میں تجھ پر توکل کرتا ہوں۔'' علی رضا نے دل میں دعا مانگی اور الرٹ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ زندگی کی روشن صبح اُن کی منتظر تھی۔ وہ پوری امنگ سے مسٹر مراد خان کے گھر کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

☆......☆......☆

''یہ لیجیے صاحب ہمارے وزیر نے آپ کو مات دے دی۔'' مراد خان نے مہرہ چلتے ہوئے کہا۔

''اجی کہاں کھو گئے جناب چال چلیے۔''

مراد خان نے سفید مونچھوں پر تاؤ دیتے

ہوئے علی رضا کو ٹہوکا دیا۔

''بس یار! آج کچھ موڈ نہیں...... باقی کل......!'' اچانک اس بات پر وہ کہیں کھو گئے تھے۔

''بچھی ہوئی بساط کو ادھورا نہیں چھوڑتے ہیں۔ کھیل تو پورا ہی ہوگا۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بول رہے تھے جبکہ ہنوز مونچھوں پر تاؤ جیسے اس وقت کوئی اور کھیل تھا۔

''بساط پر مہرے بغیر کھیلے بھی کبھی ہرا دیا کرتے ہیں مراد خان۔''

''کیا ہوگیا ہے میرے یار کو آج...... چلو چائے پی لو پھر کھیلتے ہیں۔'' مراد خان اُٹھ کر بائیں جانب بچھے صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر علی رضا بھی اُس کے ساتھ ہی برابر میں موجود دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

بڑے اُداس لگ رہے ہو...... بچے تو ٹھیک ہیں نا...... بھابی......''

''بس یار سب کچھ ٹھیک ہے۔ بس ہم ہی ٹھیک نہیں۔''

''لگتا ہے ڈاکٹر G.Mistry سے ملنے جانا ہے۔'' مراد خان نے پرانے تعلق کے ناتے کسی خوشگوار یاد کو چھیڑا تھا۔

''اب اس عمر میں یہ شوخیاں اچھی نہیں لگتیں مراد خان۔'' کہیں بہت اندر سے علی رضا کی آواز آئی تھی۔

''مسٹر یہ بڈھا بابا کیوں بن گیا ہے آج تُو...... اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کرلے یار...... کیوں یہ بڑھاپا تیری باتوں میں در آیا ہے آج۔'' مراد خان نے خبر لینے کے انداز میں کہا تھا اور پھر اُس نے ملازم کو آواز دی اور گرم گرم چکن پکوڑوں اور لائٹ کوکیز کے ساتھ چائے لانے کا آرڈر دیا تھا۔

''پتہ نہیں کیوں یار ایسا لگ رہا ہے کہ کہیں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے مجھ سے...... جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی اُلجھتا ہوں۔''

''آمنہ بھابی نے کچھ کہا ہے۔'' رازداری سے پوچھا گیا تھا۔

''اُس نے تو صرف سوال کیا تھا اور میں اب تک جواب میں اُلجھا ہوں۔'' علی رضا نے جیسے اندر ہی کہیں جواب دیا تھا۔

''کیا کہہ رہا ہے بھائی...... پتا ہے نا اس عمر میں کانوں نے تھوڑا سا ساتھ چھوڑا ہے...... باقی سب ٹھیک ہے، تیز بول یار...... ہاں تو کیا کہہ رہا تھا......'' مراد خان نے ہاتھ سے کانوں پر چھجہ بنایا اور غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''کچھ نہیں یار بس ذرا ڈسٹرب ہوں۔ فیس بک بھی بند ہے آج کل، تو مصروفیت میں کمی سی آگئی ہے۔ دل اُکتا رہتا تھا۔'' غم غلط کرتے ہوئے علی رضا نے بات کا رُخ ہی پھیر دیا تھا۔

''بس یار دو ایک دن میں کھل ہی جائے گی یا کھول دی جائے گی۔ یار انڈیا سے زیادہ ریشیو ہے اُس کا ہمارے ملک میں...... بزنس از بزنس......'' اسی اثناء میں ملازم چائے سرو کرچکا تھا۔

''کوئی بات ہے تو بتا دے یار...... غم بانٹنے سے آدھا ہوجاتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے بھائی...... زبردست آج تو سلامت نے کمال کردیا ہے زبردست پکوڑے بنائے ہیں۔'' علی رضا نے چکن پکوڑے چکھتے ہوئے کھل کر خانساماں سلامت علی کی تعریف کی تھی۔

''بس کر یار اب اتنے بھی مزے کے نہیں

جتنے تیری بھابی بناتی تھی۔'' مراد خان کو اپنے گھر میں نوکر کے کھانے کی تعریف بالکل اچھی نہیں لگی تھی آج بھی مسز مراد خان رابعہ بیگم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا پورا حق اس گھر کی مالکن کے طور پر اپنے پاس ہی رکھتی تھیں۔ مراد خان نے ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد گھر کی سیٹنگ تک رابعہ بیگم ہی کی مرضی کے مطابق رکھی تھی غرض ہر شے سے رابعہ بیگم آج بھی جھانکتی تھیں۔ یہ مراد خان کی اُن سے بے پایاں محبت تھی۔ زندہ جاوید محبت......

جس نے کبھی اپنے عکس پر وقت کی گرد پڑنے نہ دی تھی۔

☆......☆......☆

رات کی سیاہی پوری طرح چھا چکی تھی۔ علی رضا کو کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر باہر لان میں آ گیا تھا۔ خشک پتوں نے ایک چادر سی بچھائی ہوئی تھی۔

چر چر چر کرتے وہ اِس پر چلتے جا رہے تھے۔ ہولناک سناٹے میں پتوں کی چر مر ایک گمنام سی دکھ کی بانسری بجا رہی تھی۔ سوچیں بھی کبھی خود کو بھی کیسے غافل کر دیتی ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا سوچ کے پرندے پرواز کرتے کرتے کن جہانوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بھی سوچ رہے تھے۔ سوچ گہری ہو رہی تھی لیکن ذہن کے پردے پر عکس دھندلا رہے تھے۔ کچھ بھی تو سجھائی نہ دے رہا تھا۔ اچانک اُن کے پیر سے کوئی چیز ٹکرائی تھی۔

بے ساختہ وہ جھک کر چیز اٹھانے لگے۔ کسی کی پرانی بالی تھی۔ پرانے زمانے کی بھاری بالی' بالکل چوڑی جتنی...... ہاتھ میں لے کر اُس نے معائنہ کیا۔ کسی کام والی کی ہوگی...... وہ سوچتے ہوئے اُس پرانی بالی کو لان کی باہری دیوار پر رکھنے لگے۔ اِس بالی نے جہاں اُن کی محویت توڑ دی تھی۔ وہیں انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ وہ ایک اَن دیکھے نقطے ہی کی جانب کیوں ساری توانائیاں صبح سے صرف کیے جا رہے ہیں۔

''میں بھی بس...... اللہ جانتا ہے میں نے بھی کوئی......'' وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس اندر کی طرف ہو لیے۔ آمنہ بیگم ٹی وی لاؤنج میں موجود نہ تھیں یقیناً وہ بیڈ روم میں جا چکی تھیں۔ انہوں نے ریموٹ لے کر فوراً ٹی وی آن کیا اور ایک نیوز چینل پر کرنٹ افیئر کا ایک پروگرام دیکھنے لگے۔

''دھماکے...... خودکش بمبار...... آپریشن راہِ راست...... مہنگائی کا طوفان......'' پہلی بار انہیں اپنے پسندیدہ پروگرام سے بوریت محسوس ہوئی تھی۔ اب وہ چینل پلٹ رہے تھے۔ ایک چینل پر کوئی ڈرامہ آ رہا تھا۔ عدالت کا سین تھا، جس میں ایک غریب آدمی کی جائیداد کس طرح حکومتی عہدے داروں میں بٹی تھی، کچھ ایسی ہی کہانی تھی۔ ایک بڑھیا عدالتی کٹہرے میں کھڑی ہاتھ جوڑ کر اپنے مستقبل کی امید اپنے دائر کردہ پاس شدہ کلیم زمین کے کاغذات محکمے کی ٹیبلوں اور الماریوں میں غائب ہونے پر ماتم کناں تھی۔ اور پھر وہ کٹہرے ہی میں گر کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔ اب بڑھیا کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ اُس کی تصویر ٹی وی پر عیاں ہوئی تو ایک چیز علی رضا کے لیے تجسس کا باعث تھی۔ اُس بڑھیا نے وہی بالیاں پہنی ہوئی تھیں۔ جیسی ابھی کچھ دیر پہلے علی رضا نے ایک لان کی دیوار پر رکھی تھی۔ یہ بالی مجھے کچھ یاد دلا رہی ہے۔ یاد ہی نہیں آ رہا...... کیسے بھلا میرا ان سے تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اِسی

ادھیڑ بن میں بیڈروم میں آ گئے اور پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ بستر پر لیٹ کر بھی انہیں ایک پل قرار نہ آ رہا تھا۔ انہوں نے رابعہ بیگم کو جگانا چاہا لیکن فوراً ہی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ وہ ان کی نیند کو توڑنا نہ چاہتے تھے۔ کیسی پاکیزگی آج بھی اُن کے صبیح چہرے سے پھوٹتی تھی۔ وہ کروٹ لے کر اپنی ہی بے قراری کے دائروں میں گھومنے لگے تھے۔ نیند کے آنے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔ سوچ نے ان کو تھکا دیا اور تھکا ہوا ذہن خود کو پھر سے تازہ دم کرنے کے لیے جسم کو سلا چکا تھا۔

☆......☆......☆

''مائی کتھے چلی اے۔''

''پاؤ مینوں صاب ہوریاں نال ملنا اے۔''

''کم کی اے مائی۔''

''پتر کلیم پاس ہویا اے...... تے کاگج لین آئی آں...... بڑی دوروں چلی آں تے بری پی کٹ کے آج دا دن آیا اے۔''

''اے کم تے میں وی کرا سکتا واں...... پنج کرارے نوٹ لال لال دے مینوں دے چھڈو، میں آپ سارا کم تے میں وی کرا کے تو ساں لے دے دواں گا۔''

''وہ چالی (40) سال آپ سارا کم کیتا اے تے ہن تینوں لال نوٹ دے کے کم کرواں...... اوجا وے جا...... او صاب جی...... ایتھے ای لٹی گئی آں......'' بڑھیا بین ڈالنے لگی تھی۔

'' صداقت علی...... کیسا شور ہے یہ۔''

صاحب کی آواز سن کر صداقت علی اندر بھاگا تھا۔ اور اس کے پیچھے ہی بڑھیا بھی روتی پیٹتی اندر آ گئی۔

'' صاحب جی کچھ نہیں...... بس یہ تو ان لوگوں کا طریقہ ہی ہوتا ہے۔ باری آنے پر بھیج دیتا...... دیکھیں نہ کیسے اندر آ گئی ہے یہ مائی۔''

اُس نے اپنا دفاع کیا تھا۔

''تم جاؤ باہر...... اماں جی آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔'' علی رضا نے مائی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

مائی بیٹھ گئی تھی۔

''اب بتائیں مسئلہ کیا ہے؟'' علی رضا نے رسان سے پوچھا تھا۔

''اے کاگج نے پاؤ...... تے مینوں کلیم پاس ہویا اے۔'' بڑھیا نے کاغذ علی رضا کی جانب بڑھائے۔

''اماں جی...... انڈیا کا ایڈریس تو بتائیں ذرا......''

''لکھ پتر...... تحصیل سلاہواں، گاؤں بھوریٹ تے ضلع بلاسیور اوتھوں پٹواری چراغ دین تے منھو لال ہوندے نے...... ساری کارروائی تے ہوگئی اے پتر...... ہن کی اے۔''

''اماں جی کلیم پاس ہونے سے بات نہیں بنتی ہے اور بھی دفتر کے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ تھرو پراپر چلنے والا آدمی ہوں میں...... کرائے بھاڑے کے لیے پٹواری کو کون پیسے دے گا۔ کچھ خرچہ پٹواری کو دے دیں تاکہ وہ کام آگے چلائے۔''

'' پتر گورنمنٹ خرچہ نئی جے دیندی...... گریب آدمی کتھوں اے خرچ پورے کرے گا، دس مینوں۔'' بڑھیا پریشان سی لگنے لگی تھی۔

''اماں جی دیکھیں...... میں آپ سے بالکل فیئر بات کروں گا۔ میں رشوت نہیں لیتا۔ آپ یقین کریں اگر میں پٹواری کو زور دے کر آپ کے کام کا کہہ بھی دوں تو بھی یہ لوگ ٹرخا دیں گے آپ کو۔ جو آپ کے پاس ہو تھوڑا بہت وہ دے دیں باقی میں خود دیکھ لوں گا۔ میں نے آپ کے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کاغذ دیکھے ہیں انشاء اللہ زمین آپ کو ضرور ملے گی مگر اماں جی فارملیٹیز ہوتی ہیں۔ جن کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔'' علی رضا نے بہت اطمینان سے بڑی بی کو سمجھایا تھا۔

'' پتر کیا بغیر پیساں دے کم نئی جے ہوسکدا۔'' یاس وحسرت کی تصویر بنی بڑھیا کی آنکھیں علی رضا کی صورت پر ٹک سی گئی تھیں۔

'' اماں جی...... میں نے آپ کو بتا دیا ہے آگے آپ کی مرضی۔'' علی رضا نے جیسے بات ختم کی تھی۔

'' اے لے پتر......'' بڑھیا کے ہاتھ کانوں تک گئے تھے۔

علی رضا کی بڑی سی ٹیبل پر دو پرانی وضع کی سونے کی بالیاں دھری تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی آج اُسے نظر آئی تھی۔ علی رضا نے بالیاں لے کر بڑھیا کے چہرہ پر دیکھا تو جیسے اُس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں حسرت و یاس کا جالا گہری دھند میں چھا گیا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

بڑھیا کا کیس علی رضا نے پٹواری شمشیر سنگھ کے حوالے کر دیا تھا اور رقم کی جگہ وہ بالیاں اُس نے اس عہد کے ساتھ دی تھیں کہ وہ اُس کا پورا کام کرائے گا اور اُن کی عمر کا خیال بھی کرے گا۔ اس بات کو عرصہ گزر گیا۔ نہ کبھی اُس طرف دھیان گیا اور نہ ہی کوئی خبر آئی...... علی رضا بھی کام کے پہاڑ تلے فائلوں کو سرکاتے سرکاتے بہی کھاتوں میں اُلجھ کر ریٹائرمنٹ کی حد تک آ گیا تھا۔ مگر آج......

اُسے کیا ہوا تھا۔ کیوں وقت کی ریت سے آنکھیں چندھائی جا رہی تھیں۔ کیوں سورج سوا نیزے پر دھرا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک جیسے دل بند ہونے لگا تھا۔ وہ بری طرح بستر پر اٹھ بیٹھا۔

ٹھنڈے پسینے سے اُس کا جسم شرابور تھا۔ دل بے تال اور آنکھوں میں کالی گھاس اُگ آئی تھی۔

☆......☆......☆

'' صاحب بہادر بڑے دنوں بعد آفس کے کمرے کو یاد کیا۔'' پٹواری شمشیر سنگھ نے علی رضا کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

'' اور بتاؤ سنگھ...... بڑے کھاتے بنا لیے تم نے......''

'' آپ کی دعا ہے صاحب بہادر، بندہ کس قابل تھا بھلا۔''

'' نہیں نہیں، محنت کا پھل ہے ملتا ضرور ہے۔''

'' بس خان بہادر...... اور بتائیں زندگی کیسی چل رہی ہے سرکار۔''

'' زندگی تو خود بخود چلتی ہے بھلے ہی آپ رُک جائیں لیکن یہ وقت کا پہیہ نہیں رُکتا ہے سنگھ......''

'' خان بہادر ٹھیک کہتے ہو آپ...... مگر 'مایا' کے لیے وقت کے پہیے سے تیز چلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ 'مایا' ایک جگہ رُکتی نہیں سرکار...... اگر وقت سے کچھ حاصل کرنا ہو تو وقت کو کہیں کہیں چکمہ بھی دینا پڑ جاتا ہے سرکار۔''

'' بڑی باتیں سیکھ گئے ہو سنگھ...... مگر یہ تو بتاؤ آج کل وقت کو چکمہ دے رہے ہو یا وقت یہ کام کر چکا ہے۔''

'' سرکار یہ تو بھاگم دوڑی کا کام ہے، کبھی کوئی آگے تو کبھی کوئی پیچھے...... کوئی مسلسل اس کھیل کو کب تک کھیل سکتا ہے۔ یہ تو جاری و ساری کھیل ہے جو ختم نہیں ہوتا...... خیر......'' شمشیر سنگھ کچھ دیر

کو رُکا اور کالے بدرنگ بٹن کو دبایا جس سے بھونڈی سی چنگھاڑ نکلی اور فوراً ہی ایک ادھیڑ بے ڈول سا آدمی دروازے سے حاضر ہوا۔

''دو کڑک چائے کے کپ، ملائی مار کے جلدی لا...... صاحب بہادر آئے ہوئے ہیں۔ جلدی آنا۔'' اُس نے اُسے آرڈر دیا اور خود بدرنگے ٹیبل کی بڑی ساری دراز کو چابی سے کھول کر اندر رکھی فائلوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ علی رضا بغور اس کی حرکات دیکھ رہے تھے۔

''سنگھ یادداشت تو بڑی تیز ہے تمہاری...... ذرا مجھے بھی وقت کے خزانے سے کچھ نقد ادھار کرنے دو...... سمجھ لو آج تمہارا امتحان لینے آیا ہوں میں۔''

''حاضر جناب...... آپ جم جم امتحان لیں۔ آپ کے کل بھی خادم تھے اور آج بھی آپ کے ہی خادم ہیں۔ یقین کریں خان بہادر آپ کے آنے سے لگتا ہے گزرا وقت پھر سے واپس آ گیا ہے۔'' شمشیر سنگھ کے لہجے میں واقعی لگاؤ کی مٹھاس، محبت کی پھوار برس رہی تھی۔

''شمشیر سنگھ تمہیں یاد ہے ایک کلیم کے کیس کو اَپ ٹو ڈیٹ کرنے کے لیے میں نے تمہیں سونے کی بالیوں والا ایک اماں جی کا کیس دیا تھا، اُس کیس کا کبھی کوئی ذکر تم نے نہیں کیا تھا کیا اُن کی زمین والا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ تو مسئلہ بالکل کلیئر تھا نا۔''

''خان بہادر، خیریت...... یہ آج وقت کی دھول سے چنگاری کیوں ڈھونڈنے لگے سرکار......'' شمشیر سنگھ دھیمے سے مسکراتے ہوئے انگلیاں مروڑنے لگا۔

''کبھی کبھی وقت کا کوئی سایہ حقیقت بن کر بھی خوابوں میں آنے لگتا ہے، بس سمجھ لو میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' علی رضا سچ کو کب تک اندر رکھتے آخر لبوں پر آ ہی گیا۔

''وہ تو فائل کلوز ہو گئی تھی سرکار۔''

''مگر......'' اس کے آگے الفاظ علی رضا کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فائل کلوز ہونے کا مطلب تو وہ بھی خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے کرسی پر اپنی مٹھیاں مضبوطی سے بھینچ لی تھیں۔ اُس کا ضبط انتہا کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ اتنی دیر میں ملازم چائے لے کر آ چکا تھا۔

''خان بہادر چائے......'' شمشیر سنگھ نے جیسے کچھ یاد دلایا تھا۔ علی رضا نے چائے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اُسے اچانک ایسا لگا جیسے دو بالیاں اب بھی اُس کے سامنے پڑی ہیں۔ تمام باتیں اُس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ اُس نے چائے کا کپ اٹھا لیا جیسے ہی چائے کی پہلی چسکی لی اچانک چائے میں دو ویران ساکت آنکھیں حیرت و یاس کے جال لیے تیرنے لگیں۔

''اچھا بھئی اب میں چلتا ہوں۔'' علی رضا سے ایک پل رُکنا دشوار ہو گیا تو چائے چھوڑ کر باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☆......☆......☆

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' رابعہ بیگم نے علی رضا کو سوچوں میں گم دیکھا تو بول پڑیں۔

''کچھ نہیں بس یونہی۔''

''کوئی یاد آ رہا ہے؟''

''بھولنے والوں کو یاد کیا جاتا ہے؟ ہم کسے بھولے ہیں جو یاد کریں...... کچھ سوچ رہا تھا۔''

''خیریت'' ''یادوں کی گٹھری ایک بار کھل جائے نا تو علی رضا پھر مشکل ہی بندھتی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اس گٹھری سے بعض اوقات ایسے خزینے حاصل ہو جاتے ہیں جو

سوچ کے دائرے وسیع تر کر دیتے ہیں اور ہم وقت کے بے رحم بہاؤ میں اُن دائروں کو صرف دیکھ سکتے ہیں چھو نہیں سکتے۔'' علی رضا نے چھت پر موجود مکڑی کے ایک جالے کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے کچھ مجھے بھی تو پتا چلے نا...... آج کل آپ کی خاموشی گہری اور سوچ کی دنیا آباد ہوتی جا رہی ہے۔'' رابعہ بیگم نے انہیں چائے کا کپ دیتے ہوئے کہا۔

''ہماری زندگی بھی کیسی ہے۔ ساری عمر گھر آباد کرنے کے لیے وقت کر دی اور گھر آباد کرنے کا وقت آیا تو نصیب میں سناٹا آباد کرنا لکھ دیا گیا۔'' علی رضا چائے کی ایک چسکی لے کر پھر سے جالے کو دیکھنے لگے۔

''میں سمجھتی ہوں آپ کی سوچ کو، آپ کے خیالات کو جامہ پہنانا بھی جانتی ہوں۔ مگر علی رضا آپ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ اولاد کی تربیت میں جہاں اچھی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، مستقبل بہتر سے بہتر بنانے کے لیے باپ اور ماں اپنے سکھ آرام تج دیتے ہیں وہاں وطن سے محبت کا اگر ایک بُوٹا بھی سچے دل سے لگایا جائے اور محنت سے پرواخت چڑھایا جائے تو وہ ایک بُوٹا مستقبل کی گھنی چھاؤں دینے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔''

''رابعہ بیگم آپ کی بات سے اختلاف کرتا ہوں میں...... میں نہیں سمجھتا ایک بُوٹا چھاؤں دے سکتا ہے۔ کبھی کبھی ہرے بھرے باغ بھی چھاؤں نہیں دے پاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا کام ضرور زندگی میں ہم سے ہو جاتا ہے جس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ جاتا ہے۔'' افسردگی لہجے سے نمایاں تھی۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''سب کچھ سمجھایا بھی تو نہیں جا سکتا۔'' علی رضا چائے چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی جانب چلے گئے۔ رابعہ بیگم انہیں جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''سائبر ڈونٹ موو...... کم ہیر......'' رابعہ بیگم نے کتے کو پچکارتے ہوئے اپنی جانب اشارہ کیا۔

فروٹی قریب ہی دودھ کے برتن میں منہ ڈالے بیٹھی تھی۔ علی رضا آج خلافِ معمول اخبار ڈائننگ ٹیبل پر چھوڑ کر باہر نکلے ہوئے تھے۔

اچانک سائبر نے بھونکنا شروع کیا اور باہر کو بھاگا۔ فروٹی بھی دودھ چھوڑ باہر کو بھاگی تھی۔

''اللہ خیر کرے۔'' رابعہ بیگم کا دل یکدم بیٹھنے لگا تھا۔

اسی اثناء میں علی رضا مردہ قدموں سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کے پاس آکر اُس پر ڈھے سے گئے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی......؟'' رابعہ بیگم نے انہیں جھنجھوڑ ہی تو دیا تھا۔

وہ کچھ بھی نہ بولے اور خاموشی سے بند مٹھی کھول کر ٹیبل پر دھر دی ڈائننگ ٹیبل کے گلاس پر وہ پرانی بالی خوب دھج دکھانے لگی تھی لیکن اُسے دیکھ کر علی رضا کے ساتھ ساتھ رابعہ بیگم کی آنکھوں میں بھی ایک مکڑی کا جالا اپنے تار وسیع کرتا جا رہا تھا۔

گھر میں صرف سائبر اور فروٹی کی آوازیں سناٹے کو چیرنے کی بھرپور کوشش کرتیں ماحول کو پُراسرار کرتی جا رہی تھیں۔

ہر طرف ایک منجمد کر دینے والا مہیب گاڑھا اندھیرا پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

افسانہ

روحیلہ خان

سیلن

''ثمینہ...... مسئلہ کیا ہے تمہارا...... بولو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' واجد اس کی اس دیوانگی کا عادی تو نہیں تھا لیکن اس پر اس کا اثر بھی نہ پڑا تھا۔ ایسے جیسے وہ واقعی گلی میں بھونکتی کوئی کتیا ہو جو کبھی کبھار بڑے درد سے بھونکتی ہو۔ ''کتیا ہوں میں سنا...... مسئلہ یہ ہے کہ میرا......

''نالی پھر بھر گئی تھی شاید پانی رِس رِس کر جا رہا تھا اُس پر کوفت سوار ہوئی برتنوں کا ایک ڈھیر تھا جو اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔

''مما...... ! میری ٹائی کہاں رکھی ہے، کہیں اڑ تو نہیں گئی۔ آپ نے کلپ تو لگا دیا تھا ناں......'' واسع ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہتا چلا گیا۔

''یہ اچھا ہے مما! آپ نے وجیہہ کے کپڑے تو استری کر کے رکھ دیے اور میرے کپڑوں کے لیے ٹھینگا...... یہ کیا بات ہوئی مما!'' وہ کچن تک آ گیا تھا اس کے ماتھے پر ڈھیروں شکنیں ابھر آ ئیں۔

''یہ کیا زبان ہے تمیز ہے تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی...... ٹھینگا...... یہ کیا ہوتا ہے ہیں...... ذرا بتاؤ۔''

''ثمینہ...... ثمینہ...... یار کیا آج سارا دن تم برتن ہی دھوتی رہو گی۔ ایک کپ چائے کا ملے گا، آج چھٹی کا دن غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ اس سے بہتر تو دفتر ہوتا ہے۔''

واجد بھی آگ بگولہ ہوتا کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ ایک لات مار کر خود فنا ہو جائے۔

سارا سارا دن گھر کے کاموں کے لیے بھاگ دوڑ کرنا ایک طرف اور نالی کے بھرنے سے اذیت ناک لمحے ایک طرف ...... گندگی کا وجود کس قدر بھاری ہوتا ہے جو سارے اچھے وقتوں کو کھا لیتا ہے۔

''یہ نالی......'' پسینے کی ایک لکیر سر سے بہتی چہرے سے راستے بناتی گریبان تر کر رہی تھی۔

''مما...... ! آپ سن رہی ہیں ناں......'' واسع اس کے اندر اتھل پتھل سے بے خبر پھر بولا۔

''یار...... میری سمجھ میں نہیں آتا...... اپنی اولاد کے لیے تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے اور میں جو گدھوں کی طرح سارا دن کام کرتا رہتا ہوں۔ ایک کپ تک چائے کا میسر نہیں ہے مجھے...... اور تم ہو کہ یہاں بت بنی کھڑی ہو۔'' واجد اب سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''پاگل ہوں میں...... سنا آپ لوگوں نے...... دماغ خراب ہے میرا......'' وہ چیخ کر بولی۔

''مما...... ! کم آن...... آپ تو ہائپر ہو رہی ہیں۔'' واسع کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا وہ واقعی دیوانی سی

دکھائی دے رہی تھی۔

''ثمینہ...... مسئلہ کیا ہے تمہارا...... بولو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔''

واجد اس کی اس دیوانگی کا عادی تو نہیں تھا لیکن اس پر اس کا اثر بھی نہ پڑا تھا۔ ایسے جیسے وہ واقعی گلی میں بھونکتی کوئی کتیا ہو جو کبھی کبھار بڑے درد سے بھونکتی ہو۔

''کتیا ہوں میں سنا...... مسئلہ یہ ہے کہ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور آپ جو دن بھر آفس میں گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں ناں...... تو میں بھی یہاں آلتی پالتی مار کر یوگا نہیں کرتی...... اپنی ہڈیاں گلا دی ہیں میں نے اس گھر کی خاطر......'' اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

''تو تمہارا یہ مقصد ہے کہ میں...... میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ارے تمہاری خاطر میں نے کیا کیا نہیں کیا...... اور تم مجھے طعنے دے رہی ہو۔'' بیٹے کے سامنے اس نے اُس کی خاصی بے عزتی کر ڈالی تھی۔ مرد ذات کا غرور کیا کم ہوتا ہے۔

''کیا کیا آپ نے میری خاطر...... ارے ایک نالی تو کھلوا نہیں سکتے...... باتیں کرتے ہیں بڑی بڑی......'' وہ بس رو دینے کو تھی۔

''نالی...... دیکھا پپا مما اس نالی کی وجہ سے ٹینشن میں ہیں۔ یہ پھر بھر رہی ہے شاید۔'' واسع کسی حد تک مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مما کی حالت بے وجہ نہ تھی کوئی تو وجہ تھی ناں۔

''اُف یہ نالی...... ابے یار...... کیا مصیبت ہے...... باہر گٹر بھر رہا ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ کہاں سے

جمعدار لاؤں..... یہاں آسان ہے کیا جمعدار کو تلاش کرنا۔'' واجد جھنجلا اٹھا اب تک سارے مسائل کا بوجھ ثمینہ کے کندھوں پر رکھ کر وہ کتنے مزے سے اپنے اندر کا غبار نکال رہا تھا پر اب جب ذمہ داری خود کے شانوں پر پڑتی نظر آئی تو ایک لمحے میں ہی شدید کوفت سوار ہوگئی۔

''پپا..... ہم دونوں چل کر ڈھونڈتے ہیں..... میں سائیکل پر جاتا ہوں آپ اپنی بائیک پر تلاش کریں۔'' واسع نے حل ڈھونڈ نکالا۔

''یہ سب تمہاری ماں کی غلطی ہے..... ارے ذرا سنبھال کر استعمال کیا کرے ناں..... ابھی پچھلے مہینے ہی ڈھائی سو روپے دے کر گٹر صاف کروایا تھا۔ اب پھر بھر گیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے یہ بھرتا رہتا ہے۔'' واجد کا نزلہ پھر ثمینہ پر گرا۔

''اس میں بھی میری برائی..... شام میں بمباری میں نے کروائی، کشمیر کی آزادی میں نے رکوائی' افغانستان پر ڈرون حملے میں نے کروائے۔ میں تو ہوں ہی بری..... پر سن لو واجد علی میں اس صورت حال میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ سنبھالو اپنا گھر، بس بہت ہوگیا۔'' وہ اپنے آنسو بہاتی کچن سے نکلی اور تیزی سے لاؤنج کی جانب بڑھی۔

''کیا ہوا..... کیا ہوا ہے پپا..... مما کیوں رو رہی تھیں۔'' شور سن کر وجیہہ بھی کمرے سے نکل کر آئی۔

''دماغ خراب ہوا ہے تمہاری ماں کا..... آج کل کی عورتوں کا دماغ بڑی جلدی خراب ہو جاتا ہے۔ آزادیِ نسواں کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر بڑا اڑنے کا جی چاہ رہا ہے۔ ارے جائے..... جائے اپنے بھائی کے گھر..... دیکھتا ہوں کون مائی کا لال دو وقت کی روٹی کھلاتا ہے۔''

وہ غصے میں بکتا دھڑام سے بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''کیا ہوا واسع.....!'' وجیہہ نے حیرانگی سے پوچھا ابھی چند منٹوں پہلے ہی گھر کا ماحول بڑا پر سکون تھا۔ پھر اچانک ایسا کیا ہوا تھا آخر..... واسع نے اشارے سے اسٹیل کے بڑے سے سینک کی جانب اشارہ کیا۔ پانی رِس رِس کر جا چکا تھا اب نالی کھانے پینے کی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے چھپ گئی تھی جو پانی میں بھیگ کر اپنا وجود بالکل بدل چکے تھے اسے گھن سی آئی۔

''یہ کیا.....؟'' وجیہہ کی سمجھ میں نہ آیا البتہ دل ذرا متلا گیا۔

''تو یہ مما کیسے کام کرتی ہیں۔''

''ارے بابا..... نالی بھر رہی ہے۔'' واسع نے چڑ کر کہا اور اپنی سائیکل کی جانب بڑھا۔

''نالی.....!'' وجیہہ کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا تھا۔ اس نے بے پروائی سے اپنے کندھے اُچکائے اور دوبارہ کمرے کی جانب بڑھی اس نے گزشتہ رات کا ڈرامہ مس کر دیا تھا دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

باؤ جی..... یہ سب ٹوٹ کر بنے گا۔'' اس نے ماہر انجینئر کی طرح ٹھونک بجا کر گٹر کا معائنہ کر کے اپنی رائے سے نوازا۔

''ٹوٹ کر بنے گا..... ابے یار..... کیوں بے وقوف بناتا ہے..... ایک ڈنڈا چلا..... ابھی نالی کھل جائے گی۔'' واجد کو اس سوکھے سے جمعدار پر سخت غصہ آیا۔ گھر اُس کا..... گٹر اس کا..... ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک ڈنڈا چلانے کے دو تین سو روپے دینے پڑتے ہیں۔ ذرا سا گٹر سے کچرہ نکل جاتا ہے اور نالی رواں ہو جاتی ہے پر یہ موصوف زیادہ ہی لمبا ہاتھ مارنے کی سوچ رہے تھے۔ سفید براق شلوار قمیض میں ملبوس پہلی بار تو اسے جمعدار دکھائی نہ دیا تھا۔

''باؤ جی گل اے ہے کہ..... میں اپنے کام کے

پیسے لیتا ہوں۔ اندر سے آپ کا پائپ ٹوٹ گیا ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما لوہے کا سریا زمین پر زور سے مارا بس فقط یہ ہی اس کے جمعدار ہونے کی نشانی تھی۔

''ابے پاگل ہوا ہے کیا...... پائپ ٹوٹ گیا ہے...... اس گھر کو بنے سال ہی کتنے ہوئے ہیں سب کچھ نیا ہے اور تو کہتا ہے کہ پائپ ٹوٹ گیا ہے۔'' دل میں آیا کہ ایک زور کا ہاتھ رسید کرے پر کیا کرتا...... آدمی تو شریف تھا۔

''باؤ جی...... اے ویکھو...... اے تواڈی ساری دیواروں وچ اے...... اے کی ہے؟'' اس نے اپنی لوہے کی باریک لمبی سلاخ سے باہر کی دیوار کی سیلن کی جانب توجہ دلائی۔

''ابے یہ تو دیواروں میں سیلن آ گئی ہے۔''
واجد کو اس کے اس احمقانہ سوال پر طیش آ گیا۔

''باؤ جی...... اندر سے آپ کا پائپ جو اس گٹر میں آ رہا ہے وہ چیخ گیا ہے۔ تے اُس میں سے پانی رس رس کر تواڈی دیواروں نوں سیلن پیدا کر رہا ہے۔'' اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ واجد سوچ میں پڑ گیا۔ دس بارہ برس پہلے جب ابا مرحوم نے گھر بنوایا تھا تب یہ دیوار ایسی گیلی تو نہ تھی پھر پتہ نہیں کیسے رفتہ رفتہ سیلن آتی گئی اب تو نیچے کے حصے کی جانب کائی بھی جمنا شروع ہو گئی تھی۔

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو......'' واجد نے سوچتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''باؤ جی اے تواڈی مرضی...... پر گل یہ ہی ہے۔'' اس نے اپنے سفید دانت نکالے۔

''پیسے کتنے لگیں گے۔''

''آپ جا کر خود پائپ خرید کر لاؤ...... میں تے مزدور آں...... جو تواڈا دل کرے۔'' اس سے پہلے تو کسی بھی جمعدار نے اتنی فراخ دلی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔

نجانے کیوں واجد کے دل کو اس کی بات بھا گئی۔

پائپ کا وہ ٹکڑا تین سو روپے میں ملا کچھ سیمنٹ اور بجری پر خرچ ہوئے کل ملا کر پانچ سو روپے خرچ ہوئے وہ واسع کے ساتھ واپس لوٹا تو وہ وہیں گٹر کے پاس بیٹھا سگریٹ کے مرغولے اڑا رہا تھا۔ سامان دیکھ کر وہ مطمئن تھا اور پھر اس نے تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ واسع کچھ دیر اس کے ساتھ کھڑا رہا پھر وہ بور ہو کر اندر چلا گیا۔

ثمینہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی ان دنوں وہ نیا نیا اس محلے میں کرائے کے مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں ہی ثمینہ اسے بہت اچھی لگی تھی وہ ان پیار محبت کے معاملوں میں بالکل کورا تھا۔ لیکن ثمینہ کے معاملے میں اسے بالکل خوف نہ آیا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے فوراً اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ ثمینہ بھی اس کی اسی بیبا کی پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ ان دنوں بی اے کر رہی تھی اور وہ نیا نیا نوکری پر لگا تھا دو بڑی بہنوں کو بیاہنے کے بعد اماں ابا اس کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہے تھے۔ بڑی آپا اپنی نند کی بیٹی کے لیے بضد تھیں۔ اُن پر سسرال والوں کی طرف سے خاصا پریشر تھا۔ مدیحہ خاصی قبول صورت کی لڑکی تھی اس میں کوئی کمی نہ تھی بس وہ ثمینہ نہ تھی۔

''دیکھ واجد...... ضد چھوڑ دے۔ ارے تیری بہن کو وہ لوگ تنگ کریں گے۔'' اماں نے روایتی حربہ آزمایا۔

''اماں پلیز آپا کی شادی کو پندرہ برس گزر گئے ہیں۔ اچھی بھلی گزر رہی ہے مجھے نہ آزماؤ۔''

''تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے بیٹا......'' ابا میاں بڑی گہری سوچ میں تھے۔

''کمال ہے ابا...... میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں کیا آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کریں گے۔'' اُس کی ضد کے آگے وہ ہار سے گئے۔

''واجد کی ماں...... ٹھیک ہی تو کہتا ہے پھر تم ہی نے تو کہا تھا کہ وہ لڑکی بری نہیں ہے۔''

''ارے پر ثریا کے سسرال والے......'' انہوں نے عذر پیش کرنے کی کوشش کی۔

''جانے بھی دو واجد کی ماں جو کہتا ہے مان لو۔''

ثریا آپا نے سنا تو اپنا سر پیٹ لیا۔

''اے منے...... کیوں مجھے رسوا کرنے پر تُلا ہے۔''

''آپا پلیز...... کیوں میری خوشیوں میں رخنے ڈال رہی ہو۔ کیا تمہیں اپنے بھائی سے زیادہ اپنی نند کی بیٹی عزیز ہے۔'' اُس نے اُن کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''ارے نہیں میری جان...... میں خوب جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو...... یہ اس ثمینہ کے تعویذ کا اثر ہے۔''

''آپا...... ایسا نہ کہو...... وہ بہت اچھی ہے۔''

یوں تھوڑی حیل حجت کے بعد ثمینہ دلہن بن کر اس گھر میں آ گئی۔

☆......☆......☆

''یہ دیکھو باؤ...... یہ پائپ...... اِدھر سے چیخ گیا تھا، دیکھا......'' سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس نے کالی کیچڑ سی غلاظت سے اَٹے پائپ کو جھاڑتے اس کے سامنے کیا۔ واقعی ایک طویل لکیر پائپ میں پڑی تھی ایک ہلکے سے جھٹکے سے ہی پائپ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

''دیکھ لیا باؤ...... میں نے پہلے ہی کہا تھا ناں...... دیکھو ناں سرکار...... آپ کی ساری دیوار خراب ہو رہی تھی۔ شکر کرو باؤ...... میں نے بچا لیا آپ کی دیوار کو......''

''ہاں...... ہاں ہاں...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔''

وہ بظاہر پائپ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں ثمینہ کا چہرہ گھوم رہا تھا ان پندرہ برسوں میں وہ کتنی بدل گئی تھی، بات بات پر کھلکھلا کر ہنسنے والی، ہنستے ہوئے اُس کے داہنے گال پر ہلکا سا ڈمپل پڑتا تھا اس کا رنگ بہت گورا تو نہ تھا لیکن اس کا اُجلا چہرہ ہمیشہ کھلا کھلا سا لگتا تھا۔ اس کی گہری براؤن آنکھیں...... جس پر لمبی پلکوں کی جھالر......

☆......☆......☆

ابھی اگر یہ پیپ (پائپ) آپ نہ لگاتے ناں سرکار...... تو آپ کی دیوار پوری گیلی ہو جاتی اور گر پڑتی...... میں نے ہلکا کام کر کے رب کے آگے شرمندہ نہیں ہونا باؤ جی! ڈنڈا سنڈا چلا کر تین چار سو روپے میں پھر مہینہ پر آپ کا تو کام خراب ہو جاتا ناں جی۔''

وہ اب بڑی مستعدی سے نیا پائپ لگانے میں جت گیا تھا۔

''نئی نئی نوکری اور نئی نئی شادی...... پڑوی کے دو ایسے سرے جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اماں نے بڑی آپا کی نند کی بیٹی سے شادی نہ کرنے کی پاداش میں ثمینہ کو روایتی ساس کی طرح بن کر دکھایا۔ وہ سب کچھ دیکھتا پر چپ رہتا، رات کی خاموشی میں وہ کبھی سرگوشی میں کوئی شکایت کرتی بھی تو وہ منہ موڑ کر لیٹ جاتا اور وہ رات کی خاموشی میں کہیں کھو جاتی۔

واسع کی پیدائش پر اماں پھولے نہ سماتی تھیں مدیحہ کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی یہ قدرت کی طرف سے ثمینہ کے لیے تحفہ ہی تھا اماں شکر ادا کرتیں کہ اگر مدیحہ اُن کی بہو ہوتی تو وہ پوتے کی نہیں بلکہ پوتی کی دادی بنتیں پوتے کی دادی بننے کا اعزاز بہت خوبصورت تھا' سال بھر بعد ہی اماں کا انتقال ہو گیا اُن کے چالیسویں کے دو تین دن بعد ہی وجیہہ پیدا ہوئی۔

''لڑکی منحوس ہے دادی کو کھا گئی۔'' ثریا آپا نے برا منہ بنا کر کہا تھا اور اس کا دل کٹ کر رہ گیا مدیحہ کا غم

شاید اب بھی دل کے کسی کونے میں تھا۔

''ثمینہ کیا سوچے گی؟'' شادی کے ان چند برسوں میں اس نے ایک اچھی صابر بیوی ہونے کا ثبوت دیا تھا پھر اسی برس ابا نے ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنے گریجویٹی کے پیسوں سے اس دور دراز علاقے میں ایک سو بیس گز کا پلاٹ خرید لیا۔ یہ اُس کی بیٹی کے ہی نصیب تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پلاٹوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ دھڑا دھڑ اس علاقے میں گھر بننے لگے یوں ابا نے اِدھر اُدھر سے پیسے جوڑے کچھ اس نے اُدھار رقم بھی لی تب بھی فرش ڈلوانے کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کی کمی پڑ رہی تھی اس وقت ثمینہ نے اپنا سارا زیور ان کی جھولی میں ڈال دیا۔

''یہ کیا بہو...... یہ تمہارا زیور ہے۔'' ابا بھی اُس کی اس حرکت پر ششدر رہ گئے تھے۔

''تو کیا ہوا ابا گھر بھی تو میرا ہی ہے۔'' وہ خوشدلی سے مسکرائی۔

''وہ تو ٹھیک ہے ثمینہ پر...... یہ سیٹ تو تم جہیز میں لائی تھیں ناں۔'' لال نازک موتیوں کی جھالر والا گلوبند اس پر بہت جچتا تھا اسی مناسبت سے بڑی کٹوری والے جھمکے اچھا بھلا بھاری سیٹ تھا۔

''ہاں...... زیور اسی لیے دیا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت کام آئے اور اب ضرورت ہے...... ویسے بھی آج کل کون سونے کے سیٹ چڑھاتا ہے، اب زمانہ بدل گیا ہے واجد......''

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی ان کی نگاہیں نہ کوئی سوال کر رہی تھیں نہ حیران تھیں۔ ممنونیت کے جذبات سے ابا کی آنکھیں نم ہوئیں اور وہ بھی اپنا آپ نہ روک سکا۔

''ثمینہ ذرا پانی پلانا......'' اس نے جان بوجھ کر اُسے بھیجا وہ چلی گئی تو باپ بیٹے نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔

''میں نے ثریا سے تذکرہ کیا تھا مانگے نہیں تھے پر اس نے اتنے بہانے بنائے کہ جسے میں اس سے سوال کر رہا ہوں۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے اتنی پیاری بہو ملی۔'' ابا کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ بیٹی کے مقابلے میں بہو کی محبت کا پلڑہ بھاری ہو گیا تھا۔

''ٹھیک کہتے ہیں ابا، اب آپ اس کے سامنے نہ رونے بیٹھ جانا۔'' واجد نے باپ کو تسلی دی۔

''اچھا بیٹا......'' انہوں نے اپنے سفید کرتے کے دامن سے اپنی بوڑھی آنکھیں صاف کیں۔ آنسو کب کس کی سنتے ہیں وہ دونوں خاموش تھے کمرے میں گھڑی کے چلنے کی آواز بڑی تیز آ رہی تھی۔

''ٹھک ٹھک ٹھک''

☆......☆......☆

''یہ اتنا آسان کام نہیں ہے باؤ...... میں نے کہا تھا ناں...... بچت ہو گئی آپ کی۔'' پھاوڑے سے زمین کی مٹی برابر کر رہا تھا۔

''آں...... ہاں...... ہاں ہاں...... صحیح کہہ رہے ہو۔'' وہ چونک اٹھا۔

''میں نے پائپ لگا دیا ہے۔ ابھی سیمنٹ تازہ تازہ لگا ہے۔ دو گھنٹے تک کچھ نہ ڈالنا۔ یہ کچرہ بھی نکال دیا ہے میں نے۔''

''دو گھنٹے...... پر...... کیسے پتہ چلے گا کہ گٹر کھل گیا۔ یار سارے کام پڑے ہیں۔ کمال کرتے ہو تم اور اگر نہ کھلا تو ہم تم کو کہاں سے پکڑیں گے۔''

''باؤ جی...... میں نے کدھر جانا ہے...... آپ سے مزدوری بھی تو وصول کرنی ہے۔ میں اِدھر ہی ہوں۔''

''اچھا...... پھر تم اِدھر ہی بیٹھو میں چائے بھجواتا ہوں۔'' وہ اندر دروازے کی جانب بڑھا۔

''ناں باؤ جی...... خود ہی کہتے ہو گھر میں کام

پڑے ہیں پھر بھابی جی سے چائے بنواتے ہو۔ او یار ظلم نہ کر...... مجھے چائے نہیں پینی...... ایویں آپ کی گھر والی پریشان ہوگی۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا اور وہیں گٹر کے پاس منڈیر پر بیٹھ گیا۔

''مجھ سے زیادہ تو اسے ثمینہ کا خیال ہے اور میں...... اتنے برسوں میں کیا دیا اُسے...... اپنے آفس کی ساری ٹینشن...... راستے کی ساری پریشانی...... مہنگائی کا سارا پریشر سب کچھ اس پر ڈالتا رہا اور آج تو حد ہی ہوگئی۔ آج اس نے بھی اپنا منہ کھول دیا۔ میکے جانے کی دھمکی۔ پندرہ برسوں میں پہلی بار...... ہمارے رشتے کو بھی سیلن لگ رہی تھی۔ میری ساری محبت ساری دیوانگی ساری چاہت اس سیلن کی نظر ہو رہی تھی۔ میں نے پہلے کبھی کیوں نہیں سوچا۔

مجھے سوچنا تو چاہیے تھا اگر سیلن سے میرے رشتے کی دیوار گر گئی تو...... اس کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ خود حیران رہ گیا یہ کیا تھا۔ ثمینہ سے دور ہونے کا خوف واسع اور وجیہہ کے مستقبل کے تاریک ہونے کا خوف یا کچھ اور......

''واسع...... واسع......'' ثمینہ کی زوردار آواز نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا دروازے کی اوٹ سے وہ باہر جھانک رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی کھلا لگ رہا تھا اور ناک سرخ ہو رہی تھی شاید وہ رو تی رہی تھی وہ دوڑ کر اس کے نزدیک گیا۔

''حد ہوتی ہے بے پرواہی کی کب سے دھوپ میں کھڑے ہیں ذرا دو گھڑی آرام کر لیتے پھر کہتے ہیں چھٹی کا دن میں نے غارت کیا...... یہ واسع کہاں ہے...... بہت عیش آگئے ہیں اس کے آپ کی وجہ سے اسے ڈھیل ملتی ہے...... یہ لیں چائے...... کب سے آوازیں دے رہی ہوں واسع کو پر یہ لڑکا ہے کہ سنتا ہی نہیں۔''

ٹرے میں چائے کے دو بھاپ اڑاتے کپ دھرے تھے۔

''ثمینہ مجھے معاف کر دو میرے ہی رویے نے اس رشتے میں سیلن پیدا کر دی تھی اور اگر یہ نالی نہ بھرتی اور...... جمعدار آکر نیا پائپ نہ لگاتا تو ہمارے رشتے کی دیوار گر جاتی۔ یہ نالی تو کب سے بھر رہی تھی پر آج تو جیسے غضب ہی ہو جاتا...... تم مجھے معاف کر دوگی ناں......''

''تم سن رہی ہو ناں...... شاید میں اور تم اس پرانے ٹوٹے پائپ کی طرح علیحدہ ہو جاتے۔'' اس کے لب خاموش تھے پر دل سے صدائیں ابھر رہی تھیں۔

''بھوک تو نہیں لگ رہی آپ کو...... کہیں تو پائے رکھے ہیں...... لا کر دے دوں۔'' ثمینہ نے ہمیشہ کی طرح اب بھی پوچھا...... وہی انداز وہی محبت وہی چاہت بھرا لہجہ۔

''نہیں...... نہیں میں بھوکا نہیں ہوں...... میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جلدی سے چائے کی ٹرے تھامی اور پیٹھ موڑ کر چلنا شروع کر دیا اس میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ اُسے اپنی نم آنکھوں سے دیکھتا ثمینہ کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

اِدھر واسع نے بالٹی بھر کر گٹر میں ڈالی وجیہہ نے بھی نالی میں جگ بھر کر پانی ڈالا۔

''نالی کھل گئی پاپا......'' واسع کے چہرے پر اتنی خوشی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی وہ بھی دل کھول کر مسکرا دیا۔

''بول باؤ کتنے پیسے لے گا۔'' اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

جمعدار حیران سا اُسے دیکھ رہا تھا کتنا بھلا مانس ہے خود پوچھ کر مزدوری دے رہا ہے اس کے سفید دانت کھل گئے۔ نالی سے سفید پانی جگر جگر اب گٹر میں گر رہا تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

فرزانہ آغا

کی جاناں میں کون!

خاص نمبر کی سوغات' ایک دل گداز تحریر جو مدتوں یاد رہے گی

زہرہ کو کچے چاول پھانکنے کی لت لگی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد مٹھی کو لبالب بھرتی اور مٹھیاں بھر بھر پھانکتی' کمیاں اُسے ایسا کرتے دیکھتیں تو مسکرا دیتیں۔ مسکرانے کا وقت بڑی دیر بعد جو آیا تھا۔ لمبی گوری چٹی کشمیرن کی بھوری نم آنکھوں میں ٹکے ستاروں کی سی جگمگاہٹ تھی۔ بیاہ کر آئی تھی تو ایک

جگ کی نظر اُس پر سے ہٹتی نہ تھی۔ آدھے کاڑھے گھونگھٹ میں حسن مزید تابناک ہو جاتا۔ بے جی اُلٹے توے کی کالک چمکتے گلابی گال پر لگاتیں تو وہ نازک سے ہونٹوں کو ہلکا سا سکوڑ کر، قدرے شرما کر مسکراتی تو اور حسین لگتی۔ حسن کا تذکرہ ہی کیا؟ حسن کم عمری اور بے فکری کا دوسرا نام بھی تو ہے۔

یہ کچھ برسوں پہلے کی بات تھی۔ اب جو پچھلے پھیکے سیٹھے برس گزرے تھے ان میں کاشت ہوئے زہرناک جملوں نے حسن کو گہنایا تو نہیں تھا پر کچھ گہن زدہ سا ضرور کر دیا تھا۔ جب شام کو مالن ململ کے کناری لگے گیلے کپڑے میں گجروں، پھولوں کی چنگیر تھامے اونچے بیضوی گیٹ کے چھوٹے پھاٹک سے اندر قدم دھرتی اور زہرہ لپک کر بالے اور چنبیا کا ہار اٹھاتی تو صحن میں بیٹھی

کوئی پڑوسن، کوئی دور کی تائی، چاچی محبت سے مسکرا کر دیکھتیں۔ ایسے لمحات میں حقہ گڑگڑاتی بے جی، حقے کی نے ایک طرف کرتی کہتیں۔

''ٹھکانے بھی تو لگیں یہ ہار سنگھار۔'' یہ سنتے ہی چنگیر سے پھول چنتی مخروطی انگلیوں میں فکرمندانہ سا توقف آ جاتا۔ زہرہ بالے چنگیر میں واپس رکھ، بنا پیچھے دیکھے سیدھ میں چلتی چلی جاتی اور دور برآمدے میں بچھے رنگین پیڑھے پر جا بیٹھتی۔

نامراد جہیز کی چیزوں میں ایک خوبی یہ بھی تو ہوتی ہے کہ ان سے لپٹی اپنائیت اُس وقت بھی ساتھ نبھاتی ہے کہ جب...... میکے کی پرچھائیں بھی سر پر باقی نہ رہے۔ تو زہرہ بھی پیڑھے کی اپنائیت بھری پناہ میں بھٹکتی چلی جاتی۔ کہیں دور، بہت دور اذانِ مغرب کی پرسوز مدھم آواز پر

آنکھوں کا پانی بے قابو ہونے لگتا۔ لگتا تھا وقت ٹھہر ہی تو گیا ہے۔

بڑھتے طعنے مینے سنتے کم عمری کا چونچال پنا وقت سے بہت' بہت پہلے فضا کی گھاٹ جا اترا۔ عورت کو بوڑھا ہونے میں کوئی وقت لگتا ہے؟

تو بات ہو رہی تھی کہ مسکرانے کا وقت بڑی مدت بعد آیا تھا۔ زہرہ کی گود بھرائی پر تو اُس پر وہ روپ اترا کہ بے جی نے عرصے بعد صدقِ دل سے بشیرن کو نظر اُتارنے کا کہا۔ آتشی گلابی' گڈی کاغذ جیسی نفیس شنگھائی کے دوپٹے کنارے کا ہی سبز گوٹ کے گوٹے تلے' روشن پیشانی پر چھوٹا سا زمرد کا ٹیکہ اپنی خوش بختی پر جگمگا رہا تھا۔ پر زہرہ کی آنکھوں کی جگمگاہٹ اُس سے سوا تھی۔

کون جانے کہ لمحۂ موجود کی خواہش' وہ خواہش جو آسمان زمین کے بھید بھرے بھیتر کو بھرتی ہو' اُس کی حیثیت مستقبل کے دھندلے گمشدہ زمانے میں محض ایک خلش بن کر سُلگے گی......کون جانے......؟

سعید نے زنان خانے کے برامدے سے گزرتے اطلاعی گنگھورا بھرتے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی رسم گاہ کی طرف' زہرہ نے اُس سمے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا اُس کی نظروں میں...... جانے والا' جاتے سمے کی بپتا سنا پاتا تو سعید زہرہ کو بتاتا کہ تم بھی تھیں......اُس لمحے' بجھتی آنکھوں کی بڑھتی تاریکی میں تمہارا ٹیکے سے دمکتا روشن چہرہ بھی تھا۔ علی مراد...... مصطفےٰ...... بے جی کا لرزتا ہاتھ اور......کیا کیا نہ تھا آنکھ کے پردے پر' تاریکی میں ڈوبتا جاتا تھا پر' تھا' ہاں! میرا چشم آہو، میرا خالد......وہ بھی تو تھا آنکھ کی پتلی پر ٹھہرا ہوا۔

خالد کہاں آسانی سے پیدا ہوا تھا۔ زہرہ نے موت کاٹی تو بنیروں پر گھی کے چراغ جلے تھے۔ اکیلے زبدہ نے کہاں؟ اُس گھڑی سعید میں دم کب رہا تھا۔ جب پیچھے کچے کوٹھوں کے نیم تاریک برآمدے کے سناٹے کی تنہائی میں دائی اماں نے کمرے سے نکلتے نواڑی پلنگ پر بیٹھی بے جی کو کہا تھا۔

''ووٹی کی طبیعت نہیں ٹھیک...... رب خیر کرے کبھی تو لگتا ہے ایک جی ہی بچے گا۔''

اور بے خبر بے جی نے اگلا سانس بھرنے سے پہلے کہا تھا۔

''بچہ بچالینا۔'' سعید کے قدم وہیں پتھر کے ہو گئے تھے۔ وہ تڑکے سویرے ساتھ والے گاؤں گیا تھا کہ پیچھے زہرہ کو درد لگ گئے۔ ستون کی آڑ میں تھم جانے والے قدم واپس پلٹتے بہت بھاری تھے۔ سعید کا دل لمحے بھر کو ڈولا' ڈوبا اور پھر اُس نے سکوت بھرے کھلے آسمان تلے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ وہ تادیر دعا مانگتا رہا۔

بے جی کا زہرہ کے ساتھ یہ رویہ ایک تو رواجاً چلا آ رہا تھا۔ دوسری وجہ سعید کی پسند ہونا تھی اور تیسری اللہ کی رضامندی کی تاخیر تھی پر اب......؟ اب تو......

ستاروں کی لو دم توڑتی تھی کہ ننھی باریک سی رونے کی آواز نے گھر کے بام و در کو اُجال دیا۔ زہرہ دوسرے جہان سے بمشکل ایک قدم دور اس دنیا میں واپس آئی تھی۔

ہزاروں منتوں کی مراد' گھر بھر کی آنکھ کا تارا خالد بے جی کی گود سے اترتا تو کوئی دوسرا لیتا۔ تو یوں دو سوا دو برس گزرے خالد کے اس آنگن میں' جہاں سورج کی پہلی کرن سے بھی پہلے رونق شروع ہو جاتی تھی۔

تحصیلدار صاحب کی زندگی میں بھی اِدھر زنان خانے کی طرف یونہی رحمتوں، برکتوں والی صبح، رات کا سینہ چیر کر بیدار ہوتی تھی۔ چاٹی کی پُرشفیق رڑک کی آواز، سلگتے تنور سے اترتے چھوٹے چھوٹے تلوں والے کلچوں کی خوشبو...... دودھ لسی لینے والوں کے کٹورے، گڑویاں جو چاٹی کے پیچھے قطار در قطار لگی ہوتی تھیں۔ تیز تیز دانہ چنتے مرغے مرغیاں اور چھت پر باجرہ چنتے سرمئی کبوتروں کی غٹرغوں......

مصطفیٰ جو پورے گھر کا چکر لگاتا پھرتا تھا پہلے تو سورج چڑھے ناشتے کے بعد پچھلے صحن میں چارہ کاٹنے والی مشین پر کھڑا کٹائی دیکھتا رہتا تھا پر اب وہ جاتا اور کچے کوٹھوں کے پیچھے بڑے کمرے کی چھوٹی زنجیر والی کنڈی کھڑکاتا تو زہرہ کو پتا چل جاتا کہ مصطفیٰ خالد کو لینے آیا ہے۔

ہنستے کھیلتے دو سوا دو برس گزرے جب یہ سننے میں آیا کہ پاکستان بننے چلا ہے اور جناح صاحب کی سرتوڑ کوششیں رنگ لانے کو ہیں یہ خبر سب سے پہلے سعید سے چھوٹے علی مراد نے دی تھی۔ اِس سے پہلے سننے میں آتا تھا تحریکِ پاکستان کے بارے میں پر، خیال یہی تھا کہ مسلم، ہندو اور سکھ آبادی کا مشترکہ اکثریتی علاقہ ہندوستان میں ہی شامل رہے گا۔ علی مراد کو پولیس کے محکمے میں بھرتی ہوئے چار ماہ ہی ہوئے تھے۔ پر اب اُس کی معلومات گاؤں کی چوپال سے قدرے زیادہ تھیں پر افواہوں، قیاس آرائیوں کے درمیان حتمی فیصلے تو یوں سرے چڑھتے کہ جو اصل فیصلہ تیرہ اگست کو نہ آیا ہوتا تو پار لگنا ہے یا......؟؟؟

پارٹیشن کا نام آتا تو علی مراد کی آنکھوں میں نمک سا گھلنے لگتا۔ ڈھلتی عمر کا ایک دُکھ یہ بھی تو ہے کہ وہ منظر جو سرپٹ دوڑتی جوانی میں گھڑی بھر ٹھہرتے ہیں آنکھ کی پتلی پر، وہ خنجر کی نوک میں ترازو ہو کر زمین کے پردے پر انمٹ نقوش کو گہرا کرنے لگتے ہیں۔ مسلسل گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ...... اب یہ بات کہ اُن بھولی بسری یادوں کی گھسی پٹی پیوند زدہ چادر کی گٹھڑی کو کھولنا، بند کرنا، پھر کھولنا؟ کیا رکھا ہے ان باتوں میں، اور جب ان داستانوں کو سہنے اور سننے والے ہی نہ رہیں تو یہ اور بھی بے کار اور گھن زدہ ہو جاتی ہیں پر ہوتا یہ ہے کہ پھر یہ چپ، گھٹن بن کر سینے کی اندھیر سیلن میں جا چھپتی ہے۔

اکہتر کی جنگ لگی تھی اور علی مراد کے زخم بھی ایسے ہی ہرے ہوئے کھڑے تھے جیسے باقی مہاجروں کے...... نہیں، یہ لفظ نہیں...... یہ لفظ تو اور معنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ تو علی مراد کے زخم بھی ایسے ہی ہرے ہوئے کھڑے تھے جیسے باقی اُن محب الوطن لوگوں کے جو اِس پاک سرزمین کے لیے بڑی قیمت دے کر آئے تھے۔ شاد باد ہوئے یا نہیں...... آباد ضرور ہو گئے کہ اُس وقت پاکستان بننے کے بعد اتنی عزت تھی اس ہجرت کی کہ کوئی بھی اپنی بڑی سے بڑی قربانی گنوانا باعث شرم سمجھتا تھا۔ ترقی کہاں تھی اتنی پر، تمیز و تہذیب اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ وضعداری اپنے مکمل جوبن میں تھی۔ زخم خوردہ قوم نے سنہ 47ء جھیلا۔ سنہ 65ء جھیلا اور سنہ اکہتر بھی...... پر؟

"Short Term Memory Lose" ۔ اس کی اردو کیا ہوتی ہوگی؟ اگر پوری قوم ہی اس میں مبتلا ہو جائے یا دانستہ کر دی جائے اپنے رنگ بدلتے بہروپوں سے تو، اجتماعی طور پر احساسِ زیاں جاتا رہتا ہے اور وہی ہوا۔

وہ تو ایک پرانے سے اخبار کے صفحے پر چھپی

تصویر نے ہاتھ روک لیے تھے۔ پپیتا اخبار سے الگ رکھتے علی مراد نے اخبار کو سیدھا کیا اور بغور تکنے لگا۔ ایک پاکستانی' نہیں ایک مغربی پاکستانی' فوجی یونیفارم سمیت خنجر سینے پر کھائے بلکہ پے در پے کھائے۔ جان' جانِ آفریں کے سپرد کر چکا تھا اور ایک پرانی کھٹارہ سی گاڑی سے عورت کو اس انداز سے کھینچ کر اتارا گیا تھا کہ اس کا بچہ گود سے گر پڑا تھا۔ گول مٹول' معصوم حیرت زدہ آنکھوں والا...... دو سوا دو سال کا بچہ' بالکل خالد کی طرح...... گود سے گرتے ہی خنجر آر پار تھا سینے کے...... نہیں خالد کے آر پار تو کر پان تھی۔ علی مراد نے آنکھ کی نمی کے پیچھے ایک اور طویل سرد آہ اُتاری سینے میں اور اخبار کو موڑ کر رکھ دیا۔ پر آنکھیں موندنے پر منظر بدل جاتے ہیں؟ نہیں نا' وہ تو اور واضح ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی علی مراد سے کھانا نہ کھایا گیا۔ رات کو گرم دودھ کا پیالہ پی کر برآمدے میں پڑے چوڑے نواڑی پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ بجھے بجھے ستاروں کی چادر تانے آسمان بھی گم صم سا تھا۔ چاند اللہ جانے کدھر منہ لپیٹے پڑا تھا۔ رات کی گہری چپ میں خاموشی کا گھپ اندھیرا اترا تو علی مراد کی بجھتی آنکھوں میں کوٹھوں کوٹھوں بھڑکتی آگ روشن ہوئی۔ وہ آگ جو پورے گاؤں' پورے ایک زمانے' ایک عہد کو لپیٹے میں لیے روشن سے روشن تر ہوتی جاتی تھی کہ جس میں بہت کچھ خاکستر ہو جانا تھا۔

چھوٹا سا قافلہ معمولی گٹھڑیوں میں متاعِ زندگی سمیٹے تیزی سے' حتی الامکان تیزی سے کھیتوں سے گزرتے آگے بڑھنے کا جتن کر رہا تھا۔ چار چار کی ٹولیاں بھی اکٹھی چل رہی تھیں۔ بیچ راستے بلوائیوں کے گروہ آن وارد ہوتے کوئی مال سے جاتا کوئی جان سے' اور اکثر تینوں سے کہ اُس وقت عزت جان سے بڑھ کر سمجھی جاتی تھی۔ بلوے میں کبھی کبھار کوئی واقف کار بھی نکل آتا تو جاں بخشی کی امید ہو جاتی اِس صورت کہ' بقیہ قافلے کو آگے چلنے اور نہ رُکنے کے اشارے کے بعد کوئی 'ایک' کھڑا رہ کر بحث مباحثے میں پڑتا۔ اُسی شور وحشت' آگ بے سروسامانی اور بلوائیوں کے ہلڑ میں سعید کو چپکے سے اندھیرا نگل گیا۔ رک رک کر چھپ چھپ کر اُسے حتی المقدور تلاش کیا گیا۔ اُسے نہ ملنا تھا نہ ملا' بے جی اگلا قدم اٹھانے پر راضی نہ تھیں۔ تھوڑی آگے جاتی بیل گاڑی میں خالہ الماس اور ماموں ضیاء تھے۔ علی مراد نے روتی دھوتی بے جی کو اُن کے سپرد کیا۔ مصطفیٰ زہرہ اور خالد کے ساتھ تھا۔ اس بیل گاڑی میں دو بوڑھے رشتہ دار بھی بیٹھے تھے۔ مصطفیٰ علی مراد کو دیکھ کر ٹھنکنے لگا کہ اُسے بے جی کے پاس جانا ہے۔ علی مراد نے دو چار منٹ سمجھایا۔ اُس کے نہ ماننے پر اُس کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلتا' تقریباً بھاگتا اُسے بے جی کے پاس چھوڑ کر آیا۔ اُس کا دل سعید میں اٹکا تھا اور وہ اُن پچھلے راستوں پر واپس جانا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر' اُدھر بے جی بیل گاڑی سے اُتر اُتر جاتیں۔ قافلے والوں نے اپنی جانوں کے واسطے دے کر ہاتھ جوڑ کر انہیں بمشکل روانہ کیا۔ اس امید پر کہ کیمپ پہنچ کر سب مل جائیں گے۔ یہاں رُک کر سب کی جان تو خطرے میں نہ ڈالو یوں اگلے قدم اٹھے پر نگاہیں پیچھے لوٹتی تھیں۔ قیامت کی رات کی آخیر تھی کہ ایک عہد کی آخیر؟ کوئی سمجھ نہ سکا۔

پیچھے سے آنے والے ایک چھوٹے قافلے میں ایک پڑوسی نے بتایا سر جھکائے جھکائے کہ اُس نے سعید کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھی

ہے۔ اُس نے قدرے فاصلے پر کھڑے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو اپنے بیمار بھائی کو کندھوں سے اتار کے سانس بحال کررہا تھا اور کہا۔

''اُس نے اور میں نے اُسے اُٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔علی مراد نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ بات سنی بس اُسے لگا اُس کا سینہ شق ہوگیا اور زبان ساکن ہوگئی۔ اُس نے اندھیرے کی پرچھائیں بنتی۔ آگے جتی بیل گاڑی کی طرف دیکھا اور سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتا بمشکل بولا۔

''بے جی کو نہ بتانا...... میں خود......'' علی مراد کا جملہ ادھورا رہا اور وہ بھی بہت کچھ ادھورا ہونے چلا۔ آگ کی بڑی بڑی شمعیں اٹھائے ایک ہجوم دور سے قریب آتا دکھائی دیا۔ بجرنگ بلی کے گونجدار' باغیانہ نعرے' فضا کے اندھے اندھیرے میں خوف گھولنے لگے۔ وہ خوف جو ریڑھ کی ہڈی کو برفاب کرتا تھا۔علی مراد کے بھاری بوجھل قدم درختوں کے جھنڈ کے قریب رُکی دوسری بیل گاڑی کی طرف بڑھے۔ قدم چونکہ اٹھتے نہ تھے۔ اٹھائے جاتے تھے۔ لہٰذا منوں وزنی محسوس ہوتے تھے۔ علی مراد ابھی کچھ فاصلے پر تھا جب درختوں کے سیاہ اندھیرے سے اُس نے چار آدمیوں کو نکلتے دیکھا۔ اُن کے جارحانہ انداز اُن کے ارادے بتا رہے تھے۔ چاروں آدمی دونوں بوڑھوں سے برسرِپیکار تھے۔ علی مراد اُس سمت دوڑا۔ بھائی کی موت کا صدمہ اپنی بے یقینی میں بے جان کرتا تھا پر وہ دوڑا۔ بیل گاڑی میں گٹھڑی بنی زہرہ نظر آئی اور پھر اُس کی چیخ پکار سنائی دی کچھ زیادہ نہیں۔ تھوڑی سی کہ پھر شاید اُس کے منہ پر قوی ہاتھ آگیا تھا۔ گھٹی گھٹی بے ربط صدا اُن کے پس منظر میں پھٹی پھٹی آنکھوں میں ہراس کی سفیدی تھی۔ وہ چار تھے اور بے انتہا طاقتور' لنگوٹ کسے تنومند جسموں پر ملے تیل اندھیرے میں چمکتے تھے۔علی مراد چلایا تو اُس کی آواز پر پلٹنے والے نے ہاتھ میں پکڑی سلاخ پوری قوت سے اُس کے سر پر ماری۔ خون کی دھاریں اُسے اندھا کرنے لگیں۔ اُس نے دونوں ہاتھ زہرہ کی طرف بڑھانے کی کوشش کی پر نظر دھندلا گئی۔ کاش! پوری تاریکی چھا جاتی کہ دھندلاتی نظر کے سامنے زہرہ کی گود سے گرتا خالد نہ دکھتا اور نہ قہر ابلتی آنکھوں والے کی کرپان' جو اُس کے ننھے سینے کے اندر اتر گئی تھی۔علی مراد کی چیخیں کہیں دور اندر گھٹ گئیں اور وہ ساکت ہوگیا۔ لنگوٹ کسے آدمی نے ٹھڈا مار کر اُسے پرے کیا اور زہرہ کو ایسے آسانی سے اٹھایا جیسے سیلاب میں بہتی کاغذ کی ناؤ کو کوئی اٹھا لے...... ایک انگلی سے...... کہیں دور' بہت دور پھوٹتی سویر میں کوئی اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ تھوڑا پانی منہ کے اندر گیا باقی باچھوں سے باہر بہہ گیا۔

''خالد...... خالد...... دیکھنا...... پکڑنا وہ بھرجائی زہرہ کو اٹھالے گئے ہیں پیچھے' سب آگ ہی آگ ہے اور...... بے ربط' ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتا علی مراد پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوبارہ ہوش آیا تو کیمپ میں تھا۔ بے جی اور مصطفیٰ بھی وہیں تھے۔ سہمے ہوئے خوفزدہ زرد چہرے کہ گزرتے وقت کی خونیں پرچھائیاں چہروں پر رقم تھیں اور اگلی منزل نامعلوم...... بے جی کا سامنا کرنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر تسلی کی من گھڑت باتیں اُس سے بھی مشکل' خالد کے قتل کی خبر نے اُن کی آنکھوں کو پتھرا سا دیا تھا اُن کی آنکھوں کی...... سفیدی' آنکھ کی سیاہی پر غالب تر

تھی۔ اپنے پیاروں کی شہادت، پیچھے زندہ رہ جانے والوں کو غازی بنا دیتی ہے۔ زندہ رہنے کا جتن بھی تو آباد ہی ہے، وہ بارڈر پار سے آتے قافلوں کی طرف دوڑتیں۔ سعید کا کوئی دور پار کا دوست بھی ملتا تو اُس کا اُتا پتہ پوچھتیں اور ہاں زہرہ کا بھی تو......

وقت گزرتا رہا، کچھ عرصے میں کلیم کے کاغذات کا سلسلہ شروع ہوا اور سب قصور کے خاموش اور قدرے مغموم سے شہر میں جا آباد ہوئے۔

پارٹیشن کے بعد کچھ لوگ 'بن' گئے اور کچھ بکھر گئے۔ بکھرنے والے زیادہ تھے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ دوسروں کا حق نہ مارنے والے تھے۔ سو بکھر گئے، وہ نہ رہے جو 'اُدھر' تھے۔ پر غنیمت تھا کہ تہذیب و تمدن ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے تھے۔ وضعداری اپنے چولے میں ہی تھی۔ صفائی نصف ایمان ہی تھی۔ اپنے اور اللہ کے تعلق کو مشتہر کرنے کی روایت نہ تھی۔ ابھی بھائی کے مردہ گوشت کھانے سے کراہیت آتی تھی۔ علماء، اساتذہ، ڈاکٹروں اور وکیلوں کا ایک مقام تھا اور وہ اپنے مقام کو خوب پہچانتے تھے۔ ابھی ایمبولینس کی آواز پر بھیڑ، کائی کی طرح چھٹ جاتی تھی۔ حاجی، بقیہ عمر اس متبرک اعزاز کو باعزت طور پر نبھانے میں گزارتے تھے۔ ابھی ہمسائیوں کے کھلے دروازوں سے کوئی بھی اندر جا کر حال احوال پوچھ لیتا تھا۔ تکلف، تصنع اور بناوٹ نے لوگوں کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تنہا نے کیا تھا۔ ابھی سادگی اور سکون انسانی رگوں میں یکجہتی سے رواں تھے۔ پر بے جی زیادہ جی نہ پائیں۔ پاک وطن کی پاک سرزمین پر صدقِ دل سے بسے اور بے پناہ قربانیاں دینے کے باوجود کبھی کھوئے مال متاع کا تذکرہ نہ کرنے کے باوجود وہ زیادہ جی نہ پائیں۔ سنہ 65ء کی جنگ میں جب ریڈیو پر ملکہ ترنم کے سُر بکھرتے اور وہ نغمہ سرا ہوتیں۔

''اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے، کی لبدی پھرے بازار کڑے۔'' تو بے جی، چھپ چھپ کر اپنی چادر سے آنکھیں پونچھتیں اور انگلیوں کی لرزش کو سر جھکائے تکتی رہتیں۔ اپنے پیاروں کی شہادت کتنی بھی قابل فخر چیز کیوں نہ ہو۔ ضابطۂ حیات کے اس ذریں اصول پر کارفرما ہو کر اس بدن کے عارضی سفر کے خاتمے نے بہترین چناؤ کیا۔ تب ہی پچھلوں کو تب تک ایک خلاء کے ساتھ جینا ہوتا ہے تاوقتیکہ اپنا 'عارضی پڑاؤ' ختم نہ ہو جائے۔ قربانی کتنی بھی فخریہ کیوں نہ ہو۔ دل میں گہرے گھاؤ ڈالے بیٹھی ہوتی ہے کہ کبھی جانے والے بھی لوٹے؟ کہتے ہیں پیسہ جیب میں آ بھی جائے تو شکل پر آتے آتے اُسے وقت لگتا ہے۔ اسی طرح پیسہ ہاتھ سے چلا بھی جائے تو شکل سے جاتے جاتے اُسے وقت لگتا ہے۔ تحصیلدارنی صبر، ہمت و عظمت کا ایسا پیکر تھیں کہ سادہ سفید موٹی ململ کے دوپٹے سے ڈھکے سر پر ماضی کی جاہ و حشمت کا تاج قسمت کی گرد میں دب کر بھی جگمگاتا تھا۔ کافی برس سرک گئے۔

پہیہ الٹا کب چلنے لگا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بھروسہ اندھا ہو تو کچھ پتا چلتا ہے بھی؟ اِس قوم کو بھی پتا نہ چلا کہ غداری کا نیلا زہر، کب کیسے رگ رگ میں اتر گیا۔ سنہ ستر کی دھائی میں مزار قائد پر کھڑے ہو کر تھوکنے والوں کو اگر اُسی دن پھانسی دے دی ہوتی تو...... نسلیں گروی نہ رکھنی پڑتیں۔ کاش! بھروسہ اندھا نہ ہوا کرتا۔ اپنے گھر کے تو دروازوں کی کنڈیوں کی ہلکی سی آواز، آدھی رات کو

بھی چوکنا کر دیتی ہے تو پھر؟ کوئی ذمہ دار ہوتا تو تب نہ پاک سرزمین جاگیرداروں، لٹیروں نے رہن رکھ دی۔ ورنہ یہ دن تو نہ آتے۔ معاشی زوال ہی اخلاقی زوال کا باعث ہوتا ہے۔ اور سب تیار ہی تو بیٹھے تھے اخلاقی طور پر دیوالیہ ہونے کو، بھکاری بننے کو عالمی سطح سے لے کر انفرادی سطح تک، اپنے ملک میں بلٹ پروف گاڑیوں میں بیٹھ کر بیالیس حفاظتی کاروں کا اسکواڈ لیے ہزاروں لوگوں کو سڑکوں پر روک کر شہنشاہیت کا مزہ لوٹنے والے، تاجِ برطانیہ کی عظیم سلطنت کی سرزمین پر پیدل پھرتے دو ٹکے کے رزیل کیوں لگتے تھے؟ وہاں تو فٹ پاتھوں پر بہت سے مقامی لوگ ساتھ چل رہے تھے سر اٹھائے؟

پہلے مقصد تھا انگریز بہادر کی غلامی سے آزاد ہونا۔ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ مقصد ہی غلامی رہ گیا مطلب کسی بھی گورے آقا کی۔

جس سے قوم کی روح آلودگی میں لتھڑتی چلی گئی۔ عدم برداشت، آگے سے آگے جانے کی اندھادھند دوڑ، انسانیت کو نگلتی دوڑ، برینڈز کی فخریہ قید میں مقید نسلیں، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے بے قابو سیلاب، ایک موبائل، ایک موٹر سائیکل کی تکرار اور اخلاقیات کے سارے درس دوسروں کے لیے۔

انصاف نام کو نہیں اور ہر بندہ منصف......

گلی، گلی کھلے 'کنڈرگارٹنز' میں گولڈ میڈلز کی تقسیم اور...... اور پتھر کے زمانے کی طرف لڑھکتی پاک سرزمین جس کی ہر آفت سے نمٹتی فوج، سینے پر زخم کھاتی فوج اور عوامی ویگنوں سے جاتے اُن کے جسدِ خاکی......

ہاں بھئی! وہ زمانے گئے جب اکا دکا شہید ہوتے تھے اور انہیں پروٹوکول دیا جاتا تھا اب اتنے زیادہ شہیدوں کو؟ ہاں...... ہاں فیس بک پر خراجِ عقیدت مل تو جاتا ہے فخر کی صورت...... جہاں کبھی سنہ 65ء کی جنگ کے شہید کی قبر کشائی پر مسحور کن خوشبو اور مسلسل بہتے لہو کی نوید ایمان تازہ کر دیتی ہے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے، شہداء کا بلند ترین درجہ متعین ہے پر معاشرے میں اُن کی بیواؤں سے نکاح، احسن تر کیوں نہیں؟ اور یہ سنہ 65ء کی قصیدہ آرائی کب تک شاندار ماضی بنی رہے گی۔ شاندار مستقبل کے بارے میں صرف بحث ومباحثے تو کافی نہیں ہوتے۔

غیروں کے آلہ کار، غدار، خود اور گالیاں گوروں کو...... اندر خانے غلامی بھی انہی کی، کوئی پوچھے اندر کی کنڈی کس نے کھولی۔ چھوڑو، بہت ہی کوئی اٹھے گا تو نحیف تر لہجے میں اُمت مسلمہ کو طیش دلائے گا۔ پر انہیں طیش آنے کا نہیں، آسائشوں کے غلام اِس سے آزاد ہوا کرتے ہیں اور بند لفافوں میں اپنے مستقبل محفوظ ہوں تو غم کیسا؟

☆......☆......☆

علی مراد کی شادی نہیں ہوئی یا یہ کہہ لیں کہ اُس نے کبھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے تو شادی 'کرنے والی' نہیں 'ہونے والی' چیز ہے۔ خیر بے جی اپنی زندگی میں جب بھی اُس سے شادی کی کوئی بات کرتیں تو وہ خالی خالی نظروں سے اُن کو ایسے تکتا کہ وہ خاموش ہو جاتیں اور دیوار پر پرچھائیں بنے اپنے اور اُس کے سایوں کو تکنے لگتیں اور خوامخواہ سوچنے لگتیں کہ سعید کا سنہری تاروں والا سہرا انہوں نے شیشے والی الماری کے اوپر رکھا تھا کہ اندر؟ پر آنسوؤں کی بڑھتی ہی گھٹتی یادداشت کو دھندلانے لگتی۔

بے جی کی وفات کے بعد مصطفیٰ کام دھندے کے چکر میں اپنے ایک دوست فخر کے ساتھ کراچی نکل گیا۔ کام دھندہ اچھا چل نکلا تو وہیں سیٹ ہوگیا۔ مصطفیٰ اور فخر میں کاروباری ساجھے داری تو تھی ہی، رشتہ داری بھی بن گئی جب فخر کی بہن بانو سے اُس کی شادی ہوگئی۔ وقت کے ساتھ اُس کا کنبہ بڑھا۔ احمد بیٹا تھا اور اُس سے چھوٹی رابعہ، چھوٹی عید پر جب سب قصور آجاتے تو علی مراد نہال ہوجاتا۔ پر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ جب، جب وہ بانو کو دیکھتا تو ایک تشنگی رہتی۔ جو اپنائیت بھرجائی میں تھی وہ اس میں نہیں، پھر خود ہی لاحول پڑھ کر سر جھٹکتا۔

مصطفیٰ جب جب قصور آتا تو علی احمد کو کراچی ساتھ چلنے کا کہتا پر علی مراد ہر مرتبہ ٹال دیتا۔ صبح فجر سے پہلے اٹھتا پھر نماز کے بعد لمبی واک پر نکل جاتا۔ آفس سے واپسی پر کچھ آرام کے بعد شام کو بچوں کو پڑھاتا وہ چلے جاتے تو سنگی ساتھیوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا۔ چوک سے فالودے یا گرم جلیبی کا پیالہ پیتا اور رات کو بے جی کے چھوڑے، تواڑی پلنگ پر لیٹ کر یا سو کر رات تمام کرتا۔ Truma Healing نے تو اس دور میں فروغ نہ پایا جب کسی کو کیا پتا ہونا تھا۔ ویسے تو وہ ہر رات ہی پچھلے گھر میں لگی آگ میں بھسم ہوتا پر اگست کا مہینہ تو بہت ہی کڑا گزرتا۔ حبس بھری سیلی فضاؤں میں سارے منظر جاگ جاتے۔ پرانی باتیں اُس کے لیے سدا 'نئی' ہی رہیں۔ اُس کے دکھ ویسے ہی تازہ تھے۔ کاش! زخموں کے پھل بھی پک کر گر جایا کرتے۔ علی مراد ماضی کی اندھیر بھول بھلیوں میں شعوری، لاشعوری طور پر بھٹکتا رہتا کہ جب اُدھر پولیس میں بھرتی ہوئے اُسے فقط چار ماہ ہی ہوئے تھے پر تحصیلدار سابقہ کا بیٹا ہونے کے ناتے محکمے کے بارسوخ لوگوں سے اُس کی خاصی واقفیت تھی۔ پاکستان بنے کچھ ہی وقت گزرا تھا۔ دونوں طرف لگے کیمپوں تک کسی نہ کسی طور رسائی ہو ہی جاتی تھی۔ ساتھ ہی کلیم کی رجسٹریوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ علی مراد دونوں طرف لگے کیمپس میں بے آسرا لاوارث عورتوں کی لسٹ میں زہرہ کا نام ڈھونڈتا...... چپ چاپ پرانے محلے کا صوبیدار اُسے ایک دو روز سے لسٹیں چھانتے دیکھ رہا تھا۔ ایک روز اُس سے علیک سلیک ہوئی تو اُس نے گھر والوں کی خیریت پوچھی۔ علی مراد گلوگیر لہجے میں بولا۔

''بس بھرجائی زہرہ کا پتا نہیں چلا...... سوچتا ہوں بھا سعید زندہ ہوتے تو کیا سکون سے بیٹھ جاتے۔ اِدھر ایک دو لوگوں سے واقف کاری ہے ہر روز لسٹیں بھی تو بدلتی ہیں اسی امید پر آجاتا ہوں کہ شاید اُن کے بارے میں کچھ پتا چل جائے۔''

صوبیدار علی مراد کو ایک بے خیالی میں بولتے تک رہا تھا۔ علی مراد پلٹنے لگا تو جھجکتے ہوئے بولا۔

''تو تمہیں بھرجائی زہرہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا؟'' علی مراد بولا۔

''یہی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ پتا نہیں زندہ بچی یا شہید ہوگئی۔ میرے بھتیجے خالد کو تو......'' علی مراد کا گلا رُندھ گیا۔ صوبیدار اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر بولا۔

''ابھی پونے گیارہ ہیں، میں پاس بنوا کر آتا ہوں۔ پھر ذرا چلو میرے ساتھ ایک جگہ......''

''کس جگہ......؟'' علی مراد حیرت سے بولا۔

''مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہاری بھرجائی...... میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ مجھے راہداری تو بنوانے دو۔ شاید...... شاید وہ تمہاری بھرجائی ہو۔''

"کہاں؟ کدھر؟ کیا تم کچھ جانتے ہو اس بارے میں؟" علی مراد بے قراری سے بولا۔ صوبیدار دائیں بائیں دیکھتے ہوئے پست لہجے میں بولا۔

"کیوں مجھے مرواتے ہو بھائی؟ ابھی چھوٹی سی بات پر فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ کہا ہے نا کہ انتظار کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

صوبیدار واپس آیا تو کپڑے کے تھیلے میں پولیس کی وردی تھی۔ صوبیدار ویران سے عارضی دفتر کے کھلے، بغیر پٹ کے غسل خانے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"جاؤ کپڑے بدل لو۔" وہ تھیلا مراد علی کے ہاتھ میں پکڑاتا ہوا بولا۔

"یہ نہ ہو کہ نیکی میرے گلے پڑ جائے۔ ذرا محتاط رہنا ہے۔"

"جانا کہاں ہے؟" علی مراد بے قراری سے بولا۔

"قریبی چک تک جانا ہے۔ وہاں کے بارے میں کسی نے بتایا تھا کہ...... یار! تم خود ساتھ چلو، پھر دیکھتے ہیں اصل بات کا تو جا کر ہی پتا چلے گا۔"

"اصلی بات؟" علی مراد کا دل ڈول سا گیا۔

وہ کپڑے بدل کر آیا تو صوبیدار نے برآمدے میں کھڑی دوسری سائیکل اُس کے آگے کر دی۔ دونوں سائیکل چلاتے کافی دور نکل آئے۔ کھیتوں کے بیچ پگڈنڈیوں پر گزشتہ رات کی بارش کا پانی کھڑا تھا چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں انہی میں کہیں کہیں بیر بہوٹیوں کی مخملیں قطاریں تھیں۔

علی مراد نے سوچ میں ڈوبی نظریں اُٹھا کر ارد گرد ہریالی پر نظر ڈالی جو ابھی نامانوس نہ تھی۔ اوپر آسمان بھی وہی تھا جانا پہچانا، نیچے زمین بھی وہی اور فضا میں وہ مخصوص خوشبو بھی، جو پہلے سانس کے ساتھ بدن سے جڑی تھی۔ قدرے حبس بھری ہریاول کے بوجھ سے چور چور، اب صرف اور صرف پیچھے کے دکھ اور آگے کے خوف میں مبتلا ایک تصویر ہوئی کھڑی تھی...... ایک بے جان تصویر......

آگے رُندھی ہوئی آگ لگی فصلوں کے بعد ذرا پگڈنڈیاں ہموار ہوئیں اور دور بائیں جانب چک کے آثار شروع ہوئے۔ کچھ کچے پکے مکانات تھے جن سے ذرا دور ایک چوڑے نالے میں صاف شفاف پانی تیزی سے رواں تھا گھروں سے پہلے، باہر قریب میں ڈھور ڈنگروں کے چھپر تھے۔ صوبیدار چھپر کی اوٹ میں سائیکل روکتا ہوا بولا۔

"میں اِدھر رُکتا ہوں تم آگے اکیلے چلے جاؤ۔"

"اکیلے؟" علی مراد بھونچکا ہو کر بولا۔

"ہاں بھائی معاملہ زنانی کا ہو تو ذرا احتیاط لازم ہے۔ یہ چک سکھوں کا ہے۔ چھوٹی سی آبادی ہے گھبرانے کی بات نہیں لیکن؟"

"لیکن کیا؟" علی مراد نے گھبرا کر پوچھا۔

"سنو تو سہی...... دیکھو وہ سامنے سیدھا جا کر چوڑی پکی گلی میں چوتھا گھر گروپال سنگھ کا ہے۔ کہتے ہیں اس نے ایک مسلمان عورت کو بلوائیوں کے جتھے سے چھڑا کر اپنے گھر پناہ دے رکھی ہے۔ تم خود جا کر پتا کرو، سنی سنائی کا کیا بھروسہ، اپنوں کے پیچھے اپنے تو جانے کا حق رکھتے ہیں۔ میرا ساتھ جانا مناسب نہ ہوگا۔" علی مراد حیرت سے صوبیدار کا منہ تک رہا تھا پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"اور جو وہ زہرہ...... جو وہ بھرجائی زہرہ نہ

ہوئی تو؟''

''او بھلے لوکے! پھر معافی مانگ کر آ جانا تم تو بالکل ہی اپنی بدھی گم کیے بیٹھے ہو۔''

''ہاں! دراصل ...... اچھا ...... جاتا ہوں۔''

''میں اِدھر ہی بیٹھتا ہوں۔ تمہیں واپس بھی تو لوٹنا ہے۔'' صوبیدار کھرے بان کی چارپائی پر دراز ہوتا ہوا بولا۔

''جاؤ اللہ کا نام لے کر...... خدا کرے تمہاری تلاش مکمل ہو جائے۔ بس! صورتحال جو بھی ہو۔ جذبات کو قابو میں رکھنا اِس سے بات بگڑے گی، بنے گی نہیں۔''

''اچھا......!'' علی مراد نے صوبیدار کے پورے وجود پر اک نظر ڈالی۔ بھاری بھرکم ڈیل ڈول اور گھنی بڑی بڑی مونچھیں، پر جیسے دل کی نرمی اور اچھائی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

ہزاروں وسوسوں' اندیشوں کی گٹھڑی کو کھولتے' باندھتے بھاری پر تجسس قدم اٹھاتا علی مراد لکڑی کے چوڑے سیاہ پھاٹک پر کھڑا تھا جس پر کندہ گل بوٹوں کے بیچ لوہے کا کڑا پھنسا تھا۔ ایک گہری سانس بھرتے اُس نے لوہے کا کنڈا کھڑکایا۔ ایک سات آٹھ برس کا گول مٹول سا بچہ کیسری پگڑی باندھے دروازے پر آیا اور استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پلٹ کر بولا۔

''چاچا' کوئی بابو آیا وا۔'' اَدھ کھلے دروازے سے اندر صحن کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا جہاں ٹائلیں لگے فرش پر گاؤ تکیے لگی دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ پیچھے برآمدے میں ایک چوکور لکڑی کی بڑی میز کے گرد چار پانچ چھوٹے موڑھے پڑے تھے۔ بچے کے بلانے پر ایک شخص کپڑے سے ہاتھ پونچھتا ہوا آیا اور علی مراد کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔

''مجھے گروپال سنگھ سے ملنا ہے وہ ہیں گھر پر؟'' ٹھٹکے ہوئے بانکے سجیلے نے کندھے پر پڑی سیاہ چادر کو جھٹک کر دوبارہ کندھے پر ڈالا۔ سیاہ پگڑی کو لاشعوری طور پر ذرا سر پر جمایا اور بھاری آواز میں بولا۔

''گروپال سنگھ میں ہی ہاں۔''

''میں علی مراد ہوں۔ پار سے آیا ہوں۔ مطلب پار سے آیا تھا کیمپ تک کہ......'' گروپال سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کا کہا اور صحن میں داخل ہوتے اونچا بولا۔

''زہرہ بی بی! تہاڈے پچھلے آئے نے۔'' پیلی پھلکاری سر پر جمائے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی زہرہ پتھر کی بن گئی۔ بمشکل قدم بڑھاتی آگے آئی۔

''سلام بھاء جی۔'' خشک حلق سے آواز نکلی تھی کہ صحرا سے بگولا اٹھا تھا۔

''بیٹھو بابو صاحب۔'' گروپال سنگھ کے دھیمے لہجے میں بھی چٹانوں سے سر ٹکراتی سمندری لہروں کی سی چنگھاڑ تھی جس کی بوچھاڑ میں علی مراد اور زہرہ پورے کے پورے بھیگ گئے۔ کچھ لمحے سکوت میں گزرے اجل کے سے سکوت میں...... پھر علی مراد ہمت کر کے بولا۔

''میرا بھائی قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔ پھر پتا چلا کہ شہید ہو گیا۔ میں بھرجائی زہرہ کے لیے مارا مارا پھرا کیمپوں میں...... ہمارا خالد بھی تو فسادات......'' علی مراد کی آواز اُس کے حلق ہی میں فنا ہو گئی۔

''ہاں...... ہاں بتایا سی زہرہ بی بی نے۔'' گروپال سنگھ کی نظریں یوں زمین میں گڑی تھیں جیسے سب کیے دھرے کا وہی ذمہ دار ہو۔ علی مراد

ایک توقف کے بعد بولا۔

''میری خوش قسمتی ہے کہ یہ مجھے مل گئیں...... میں چاہتا ہوں کہ میرا مطلب ہے کہ آپ اور آپ کے گھر والے اب اجازت دیں تو ہم ...... مطلب کل' پرسوں کاغذی کارروائی مکمل ہو جائے تو؟'' گروپال سنگھ نے قریب گھڑے پر دھرے کٹورے میں پانی ڈالا اور علی مراد کو دیا۔ علی مراد نے اَدھ بھرے کٹورے سے دو گھونٹ لیے۔ ایک زرد پڑتی بے چینی بھری دھوپ مٹی سے لپی دیواروں سے لپٹی پڑی تھی۔ دیواروں کے لمبے سائے کو گھورتا گروپال سنگھ بولا۔

''اے ہن میری گھر والی ہے۔'' علی مراد کے ہاتھ سے کٹورا گر گیا۔ زہرہ کے بہتے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ وہ مسلسل چادر سے آنسو پونچھتی جا رہی تھی۔ پر وہ رُکتے تھے بھلا؟

گروپال سنگھ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خونیں سرخی اُتری کھڑی تھی۔ جیسے ستلج میں بہتی گاجر مولی کی طرح کٹی پھٹی لاشوں کا سارا خون اُس کی آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ جو چہرے کی دم بدم بڑھتی سفیدی میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھیں۔

گروپال سنگھ نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے سیاہ دھوتی کی ڈب کو ذرا سیدھا کیا۔ یقیناً کرپان اندر کپڑوں میں ہی چھپی ہوگی۔ علی مراد کے ڈوبتے دل میں خیال آیا۔ گروپال سنگھ موڑھے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں گل کراں گا' تے علی مراد صاب تسی کتے شکوک اچ نہ پے جاؤ۔ آؤ زہرہ بی بی! اپنے ویر دی آپ تسلی کراؤ۔ تسلی تے کی ہونی اے؟ پر فیر وی' ڈرو نئیں ایتھے سارے اتھاڈے اپنے نے۔'' گروپال سنگھ بولا تو اُس کی آواز میں قدرے نرمی تھی۔ وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا اندر کمرے میں چلا گیا۔ علی مراد کو تھوڑی ڈھارس ہوئی۔ زہرہ مرے مرے قدموں سے چلتی قریبی موڑھے پر بیٹھ گئی، ذرا رُخ موڑے۔ علی مراد نے ایک نظر اُس پر ڈالی اور دوسری کا یارا نہ رہا۔ اُس نے ایک گہری سانس بھری اور سوچا کہ زمین پر لکیریں کھینچنے سے جب رشتے تڑختے ہیں تو کرچیاں سمیٹ کر سالم بت بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

پھولدار چھینٹ کی شوخ ڈھیلی قمیض اور سیاہ دھوتی میں پھلکاری کو ماتھے تک کاڑھے وہ کون تھی؟ جو بھرجائی سے اب صرف' عورت ہوئی کھڑی تھی بظاہر بیٹھی تھی۔ علی مراد نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

''بھرجائی میں تو تمہیں گھر لے جانے کے لیے آیا تھا۔ پر گروپال سنگھ؟...... تو؟'' زہرہ کچھ لمحے خاموش رہی پھر پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتی دھیمے سے بولی۔

''بھاء جی' روندی ہوئی عورتوں کے گھر نہیں ہوا کرتے۔ اُن کے لیے تو چار دیواری بھی غنیمت ہے جو مل جائے تو...... موت صرف مرنے کا نام تو نہیں ہوتا۔ زندگی کہاں سے لاؤں؟ واپس کیسے جاؤں؟'' علی مراد سر نیچے کیے بیٹھا آنسوؤں کو حلق میں اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زہرہ گھٹنوں پر سر نیہوڑائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ علی مراد گھبرا کر بولا۔

''تم رونا تو بند کرو۔''

''بھاء جی! رونا تو عمر بھر کا ہے۔'' اُس نے بھیگا چہرہ اٹھایا تو اُس کے ماتھے پر پڑا چھوٹا سا ٹیکا جگمگایا۔ مسلسل ہچکیوں میں ماتھے پر لرزتا ٹیکا ایسے چمک رہا تھا جیسے پرانی قبر کے کتبے پر کوئی کرنوں

سے گندھا سہرا سجا جائے اور تب بھی قبر کی ویرانی جوں کی توں رہے۔

''تو؟ بھرجائی تم سکھنی ہو گئیں مطلب؟''

زہرہ کے زرد چہرے پر ایک لہر رنگ۔ بدلتی گزری۔ وہ قدرے توقف سے بولی۔

''نہیں سردار گروپال سنگھ جی مسلمان ہو گئے۔'' وہ بلوائی تو سات آٹھ تھے کہ نو؟ کیا پتا اگلے روز جب گروپال جی نے اُن کے جتھے سے چھڑوایا اور گھر لائے تو علاقے میں بڑا فتنہ اٹھا، نہ، مطلب پھر سے...... اندر اُن کی بے بے جی نے مجھے اپنی بڑی چادر میں کر کے لکڑی کے گودام میں چھپا دیا پر' پنچائتی ہتھے سے اکھڑے جاتے تھے تو' سردار جی سمجھو کفن سر کو باندھ کر نکلے اور مولبی جی کو گھر پر ہی لے آئے ان کی بڑی دھاک ہے جی! مطلب تھی...... اب بھی ہے پر: ب یہ اپنی بے بے جی سے چک بدلنے کی بات کرتے ہیں تو سب......''

''کیا سب؟''

''کچھ نہیں۔''

''اچھا۔'' علی مراد منہ کھولے زہرہ کو تکتا تھا جو منہ نیچے کیے روتی تھی تو ہچکیوں میں ٹیکا بے دلی سے دائیں بائیں جھولتا تھا۔ جیسے ماتھے کی لکیروں پر ماتم کناں ہو۔ علی مراد کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔ سارے لفظ گونگے ہو کر سرحدی پٹی سے جا لپٹتے تھے شاید۔

ایک اُدھیڑ عمر کی عورت سر سے بڑی چادر اوڑھے اُن کی طرف آنے لگی۔

''یہ بے بے جی ہیں۔'' زہرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ علی مراد بھی ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو...... بیٹھو بچو...... بیٹھے رہو۔'' لمبی چوڑی خوش شکل عورت کے چہرے پر عزم و ہمت کے پیچھے دکھ اور اندیشوں کے لرزتے سائے بھی تھے۔

جو ڈھلتی دوپہر کی چمکیلی دھوپ میں نمایاں ہوتے تھے۔ وہ بڑے موڑھے پر بیٹھی ہوئی بولی۔

''پتر میں جاندی آں...... اے سب سہنا تواڈے واسطے آسان نہیں ہونا۔ پر' تسی شکر کرو اس نیک بندی دی جان بچ گئی۔ واہگرو مہاراج دی کرپا نال...... اینوں اپنے کر رکھن دی ہور کوئی صورت نہیں ہے گی سی۔ تسی اپنے اللہ دے بعد اینوں گروپال سنگھ دی امان اچ محفوظ سمجھو۔ باقی جو ایدھا مقدر جو نصیب' بندہ تے عاجز اے۔ کوشش ای کر سکدا اے...... ہن اے میری دھی اے...... واہگرو دی کرپا نال چار شیر جوان پتر سن' ہن اوھنے دھی وی دے دتی...... پر اے دُکھیاری اے' کدی اولاد دا غم وی ماں توں دور ہویا؟''

(بیٹے میں جانتی ہوں یہ سب سہنا تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا۔ پر تم شکر کرو کہ اس کی جان بچ گئی واہگرو کی کرپا سے' اس کو اپنے پاس پناہ دینے کی اُس وقت کوئی اور صورت نہ تھی۔ تم اپنے اللہ کے بعد اسے گروپال سنگھ کی امان میں محفوظ سمجھو۔

باقی جو اس کا مقدر' جو اس کا نصیب' بندہ تو کمزور ہے کوشش ہی کر سکتا ہے۔ یہ اب میری بیٹی ہے۔ واہگرو کی کرپا سے پہلے چار جوان بیٹے تھے اب اُس نے بیٹی بھی دے دی۔ پر یہ دکھی ہے' کبھی اولاد کا غم بھی ماں سے دور ہوا۔'' سب پھر سے چپ کے گہرے کنوئیں میں اتر گئے۔ دو چھوٹی لڑکیاں ایک ٹرے میں چائے اور میٹھی ٹکیاں تپائی پر رکھ کر چلی گئیں۔

''پتر! چاء پیو۔'' علی مراد نے ماندے دل سے پیالی اٹھائی۔ زہرہ کے ہاتھوں کی لرزش تھمتی

تو پیالی اٹھاتی۔ بے بے جی دھیرے دھیرے اُس
کی کمر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں پر اُس کا کپکپانا نہ رُکتا
تھا۔علی مراد نے چند گھونٹ زہر مار کیے اور ایک دم
سے کھڑا ہوتا بولا۔
''چلتا ہوں۔''
''کیوں پتر؟ چاء تے پیو۔''
''دل بہت بوجھل ہے اماں جی! غم سے
پھٹ ہی نہ جائے۔ بھرجائی آؤ بھاء سعید اور خالد
کی فاتحہ پڑھ لیں۔'' بے بے جی نے پرنم آنکھوں
سے اپنے ہاتھ ساتھ اٹھائے۔ زہرہ کی اٹھی
ہتھیلیوں کی لکیریں نمکین آنسوؤں میں ڈوبی
راستہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر
علی مراد نے منہ پر ہاتھ پھیرے۔ پھر جیب سے
چھوٹی ڈائری نکال کر گھر کا پتا لکھ کر زہرہ کو تھمایا۔
''سنبھال کر رکھنا بھرجائی...... اگر کبھی ضرورت
پڑی تو......'' یہ کہتے ہوئے جیب میں جتنے نوٹ
تھے وہ زہرہ کی جھولی میں رکھ دیے۔
''نہ بھاء جی اِس کی ضرورت نہیں۔'' علی مراد
نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ رکھو اور اونچا سا
بولا۔
''اچھا چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔ چپکے سے پاس آن کھڑی
دونوں چھوٹی لڑکیاں بھی بلکنے لگیں۔
''جاؤ کڑیو اندر جاؤ۔'' گروپال سنگھ کیس پر
ہاتھ پھیرتا باہر آیا اور علی مراد کے کندھے پر ہاتھ
رکھتا بولا۔
''حوصلہ کرو جوان۔ واہگرو کی یہی مرضی
تھی۔ مطلب اللہ جی نے ایسے ہی بھاگ لکھے
ہمارے۔'' علی مراد نے قدم بڑھاتے زہرہ کے
سر پر ہاتھ رکھا تو وہ رُخ موڑے بولی۔
''بھاء جی بے جی کو کہنا زہرہ فساد میں ماری
گئی۔'' یہ کہہ کر سسکتی ہوئی اندر پلٹ گئی۔
بڑے دروازے تک ساتھ آتا گروپال سنگھ
علی مراد کے کندھے پر ہاتھ رکھتا۔ دور افق پر
نظریں جمائے بولا۔
''مجھے اپنے بھائی ہی سمجھو۔'' یہ کہہ کر علی مراد
کو اپنا سینے سے لگالیا۔
اوپر کھلے آسمان کی وسعت میں پرندے اپنی
اپنی اڑانوں میں آزاد تھے۔ زمینی حد بندیوں
کے بوجھ سے آزاد...... علی مراد کے قدم بوجھل
اٹھتے تھے اور گلی میں کھڑے اجنبیوں کی نگاہیں
بھالے تھے جو دل میں ترازو ہوتے تھے۔
علی مراد اُس وقت میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔
جیسے ہنستے بستے شہر پر اچانک زلزلہ نازل
ہو جائے۔ اور سب کچھ وہیں تھم جائے۔ رُکی ہوئی
گھڑی کی طرح۔

☆......☆......☆

علی مراد کو دل کا دورہ پڑا۔ آس پڑوس والوں
نے مصطفیٰ کو خبر کی۔ وہ خود تو شاید اُس کی پریشانی
کے خیال سے اُسے نہ ہی خبر کرتا۔
مصطفیٰ گاڑی پکڑ کر جیسے تیسے قصور پہنچا۔ علی
مراد اُسے بہت ہی کمزور اور ناتواں لگا۔ مصطفیٰ
نے اُس کی بہت خاطر خدمت کی۔ سارے چیک
اپ دوبارہ سے کروائے۔ اُس کا اصرار تھا کہ وہ
ساتھ کراچی چلے اور علی مراد کی وہی نہ تھی۔ یہی
کہتا۔
''اِدھر کی آب و ہوا پچھلے گھر جیسی ہے۔ مجھے
چین رہتا ہے ان فضاؤں میں سانس لیتے' بس
میری یہی خواہش ہے کہ اِدھر ہی دم نکلے اور اس
قیمتی مٹی میں دفن ہو جاؤں۔ بڑی قیمت دے کر
پائی ہے یہ مٹی۔'' پھر سر نیہوڑا کر بولا۔
''اباجی کی قبر چھوڑ کر آنا آسان تو نہیں تھا اور

کچھ کو تو قبروں سے باہر ہی چھوڑ آئے۔'' مصطفیٰ نے غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر گزرے وقت کی گہری دھول جمی تھی۔ سفید پتلے قمیض شلوار میں وہ ہو بہو اپنے باپ کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ وہ تصویریں جو دھندلی اور زرد ہو چلی تھیں۔ علی مراد کی زندگی بھی اپنے باپ کی طرح سادہ تھی۔ برآمدے میں چوڑے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے پر اطمینان سا بیٹھا تھا۔ اُس نے تکیے کے نیچے ایک کتاب سرکائی اور اپنے گھر کی دو تین نیم اندھی سی تصویریں مصطفیٰ کو تھمائیں۔ مصطفیٰ نے یہ پہلے بھی دیکھی تھیں شاید بہت سال پہلے...... مصطفیٰ نے برآمدے کی بڑی بتی جلائی اور غور سے تصویریں دیکھنے لگا پر بولا کچھ نہیں۔ اگرچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ علی مراد مزید ڈپریشن میں جائے پر یہ سوچ کر خاموش تھا کہ مجھ سے دل کی بات نہیں کریں گے تو کس سے کریں گے۔

یادوں کی اندھیر نگری میں بھٹکتے پھر سے پچھلے گھر کی، فسادات کی باتیں کرتے کرتے اُس نے زہرہ سے متعلق تمام داستان الف سے ے تک مصطفیٰ کو سنائی تو کپڑے کی آرام کرسی پر بیٹھا مصطفیٰ سرد ہو گیا۔ اُس نے حیرت سے علی مراد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بھائی جی اُس وقت تو سب کہتے تھے کہ بھرجائی زہرہ فسادات میں ماری گئی؟'' علی مراد حقے کی چلم میں راکھ کریدتا بولا۔

''بتایا تو ہے اُس نے کہا تھا واپس جا کر یہی کہنا۔'' پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

''ویسے وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔''

''تو پھر؟ تو اگر آپ کو پتا تھا کہ وہ زندہ ہیں تو آپ نے اُن سے رابطہ نہیں کیا؟''

''کیا تھا، شروع شروع میں تو حالات بہت خراب تھے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ڈاک کا نظام کچھ بہتر ہوا پر خط سنسر شدہ ہوتے تھے۔ دو تین ماہ میں خط ملتے تھے وہ بھی کٹے پھٹے، میں نے دو تین بار اُسے چٹھی بھیجی تھی پر کبھی جواب ہی نہ آیا۔ پھر میں یہ سوچتا کہ شاید وہ بھی رابطہ ہی نہ رکھنا چاہتی ہو۔ ہیں نا؟''

''شاید' کیا کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے تو عجیب ہی بات سنائی۔''

''کہتے ہیں
کشتی
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے۔
تو بوجھ اتارا کرتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے علی مراد کے چہرے پر ایسا پھیکا پن اترا کہ مصطفیٰ ہولا کر بولا۔

''نہ بھائی جی، ایسے تو نہ کہیں آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔ تھوڑی کمزوری دور ہو تو دوستوں میں چلے جایا کریں۔ اتنا اکیلا پن اچھا نہیں۔''

''کہاں اکیلا ہوتا ہوں، دیکھتے نہیں کوئی نہ کوئی بیٹھک میں آیا رہتا ہے۔'' کشادہ آنگن میں چٹکی چاندنی مولسری کی مہک میں ڈوبی تھی اور بیرونی دروازے پر لگی چنبیلی کے بڑے جھاڑ سے اِکا دُکا پھول ہلکی ہوا میں بے آواز آنسوؤں کی طرح گرتے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد علی مراد بولا۔

''مصطفیٰ میں سوچتا ہوں۔'' یہ کہتے کہتے علی مراد چپ ہو گیا۔

''کیا بھائی جی! کیا سوچتے ہیں؟''

''مصطفیٰ میں سوچتا ہوں کہ...... کیا زہرہ نے سچ کہا تھا کہ گرو پال سنگھ جی مسلمان ہو گئے ہیں؟'' مصطفیٰ کی اٹھتی آنکھوں میں تحیر تھا اور علی مراد کی بجھتی آنکھوں میں خائف سا استفسار، گزرے

وقت نے ہنکارا بھرا اور...... ساحرہ رات ہولے سے مسکرائی۔

☆......☆......☆

مصطفیٰ کا بیٹا احمد میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تھا جب اُس کے رنگ چالے ذرا مختلف ہونے شروع ہوئے۔ مصطفیٰ کے لیے احمد کا راتوں کو دیر سویر آنا اور تسلی بخش جواب نہ دینا اتنا پریشان کن نہ تھا جتنا اُس کا مستقل اُلجھا اُلجھا رہنا اُسے کھلتا تھا۔ حتیٰ کہ رابعہ کے ساتھ چونچال پنا اور چھیڑ چھاڑ بھی بتدریج ختم ہونے لگی۔ وہ ویسے بھی کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی حد درجہ سادہ مزاج، بہت ہوا تو کچھ کوٹ کاٹ کے بالوں میں لگانے بیٹھ جاتی۔

جب وہ اپنے بالوں کی دیکھ ریکھ کرتی تو مصطفیٰ کو بے جی یاد آ جاتیں۔ احمد کے رویے کے متعلق مصطفیٰ نے دو ایک بار بانو سے بھی بات کی اور کہا کہ احمد سے بات کر کے دیکھے، عمر بھی ایسی ہے کہیں کوئی عشق عاشقی کی روگ، جوگ نہ پال بیٹھا ہو۔ بانو نے اپنی سی کر کے مصطفیٰ کو تسلی دے دی پر اُس کی تسلی ہوئی نہیں۔ اگرچہ احمد نے میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کر کے داخلہ بھی اپنی پسند کے کالج میں لے لیا تھا پر رفتہ رفتہ وہ بہت بدل سا گیا تھا۔ شروع میں ایک سہم اتری تھی جو بعد میں بے بسی کی تصویر بنی صورت پر برستی رہتی اور پھر، اس کے چہرے پر ٹھہراؤ آ گیا۔ مکمل ٹھہراؤ، اُس کا چہرہ تھا کہ بند دروازہ!

ایک روز رات کے کھانے پر وہ مصطفیٰ کے کمرے میں لگی پارٹیشن سے قبل حویلی کی تصویر جو علی مراد کے انتقال کے بعد اب مصطفیٰ کے پلنگ کے عین اوپر دیوار پر آویزاں تھی۔ اُس تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا فائدہ ہوا یہ سب کچھ تیاگ کر آنے کا؟'' احمد کی بات سن کر مصطفیٰ کی آنکھیں قہرا گلنے لگیں وہ تڑخ کر بولا۔

''گزرا زمانہ جن پر گزرا ہوتا ہے فائدہ نقصان بھی وہی جانتے ہیں سنی سنائی والے کیا جانیں اصل حقیقت۔''

''اُدھر پتا تو ہوتا تھا کہ دشمن کون ہے؟ یہاں کیا پتا چلتا ہے کہ کس کے بھیس میں کون پھر رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کا لہجہ بہت ہی عجیب تھا۔ مصطفیٰ اُس کو غور سے دیکھتے ہوئے قدرے دھیما پڑا اور بولا۔

''بیٹا یوں مایوس نہیں ہوتے ہم اپنی مرضی......''

''چھوڑیں ابو گزر گئے زمانے اپنی مرضی کے۔'' مصطفیٰ نے اُٹھ کر جاتے ہوئے احمد کی پشت کی طرف غور سے دیکھا جس کے اوپر شانے جھکے جھکے سے تھے۔ احمد نے دانستہ پلٹ کر باپ کی طرف نہیں دیکھا یہ سوچتے ہوئے کہ رہنے دو انہیں ان کی خام خیالیوں کی جنت میں، یہ اس قوم کے فخریہ باسی ہیں جو توپوں کے جشن مناتے ہیں، سر رہیں نہ رہیں ان کی بلا سے۔''

وقت گزرتا رہا اِدھر بھی اُدھر بھی، فرق صرف اتنا ہوا کہ اِدھر والے گھر بنا کر لاپروا ہو گئے۔ غیر ذمہ دار ہو گئے۔ اگرچہ یہ الفاظ چھوٹے ہیں اور اُدھر والے بھولے نہیں کہ اُن کا گھر برباد کیسے کرنا ہے بلکہ کیسے کیسے کرنا ہے۔''

اپنی بے حمیتی تو دیکھیے دشمن پڑوسی کا کلچر اپنا لیا۔ چین جیسے پڑوسی سے کچھ سیکھنے کی زحمت نہیں گوارا۔ جب بین الاقوامی تنقید نگار کہتا ہے کہ مسلمان عیاش قوم ہیں تو اُس پر ہزار نفرین، واقعی سچ سننا آسان نہیں۔

عظیم غزوۂ ہند کی بات کرنے والا کہا کہتا ہے کہ ''دنیا کا معرکہ پاک سرزمین سے شروع ہوگا اور اُن کے حسابوں اور خون کی سرخی تو ابھر کر کناروں تک آچکی ہے۔ سرخی ضروری نہیں پانی کی ہو وہ صرف خون کی بھی تو ہوسکتی ہے۔ وہ بھوک' بے انصافی' ظلم اور بے گناہی کی بھی تو ہوسکتی ہے دیکھنے والی آنکھ تو ہو۔

دن رات کی قصیدہ آرائی ہے کہ اپنے وطن کے لیے شہید ہونا باعث سعادت ہے۔ کیا شک ہے اس میں؟ ہاں پر' یہ شہادت اور بھی باعث افتخار ہوگی اگر چار سو کے قریب کیڈٹس کی حفاظت کے لیے صرف ایک چوکیدار نہ ہوتا۔ نہیں اس پر بھی صبر آجاتا اگر بکاؤ نکموں کے پروٹوکول کے لیے پانچسو سنتری اور بیالیس بلٹ پروف گاڑیاں نہ ہوں تو...... عیدیں' سکیورٹی ہائی الرٹ!

کرسمس...... سکیورٹی ہائی الرٹ!

محرم' جنازے' نمازیں سکیورٹی ہائی الرٹ!

ٹھیک بات ہے۔ بیرونی دشمن سے تو لڑا جاسکتا ہے اپنوں کے بھیس میں پرایوں سے کون جیت پایا۔

☆......☆......☆

مصطفیٰ ڈاکٹر سے واپس آیا تو بانو باہر بالکونی میں کھڑی تھی۔ اُس نے بتایا کہ رابعہ کالج سے اب تک گھر نہیں آئی۔''

''اب تک؟'' مصطفیٰ وال کلاک کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ اُس کے فون کرنے پر احمد بھی گھر آگیا ایسے کہ اُس کا چہرہ لہو سے عاری دکھتا تھا۔ اِدھر' اُدھر' یہاں' وہاں سب جگہ فون کر لیے رابعہ کا کچھ پتا نہ چلا۔ بانو نے چادر سر پر اوڑھی اور احمد سے بولی۔

''چلو' مجھے ربیعہ کے لے چلو میں تسلی سے اُس سے پوچھ کر تو آؤں۔ دونوں صبح اکٹھی نکلتی ہیں بس پر' رابعہ کبھی فون بند نہیں کرتی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا' اٹھو احمد۔'' مصطفیٰ نے جوتے پاؤں میں ڈالے احمد نے اُسے تیار ہوتے دیکھا تو بولا۔

''ابو آپ گھر پر ہی رُکیں اور یہ فون جیب سے نکال کر پاس سامنے رکھیں' میں امی کو موٹر سائیکل پر لے کر جارہا ہوں۔ آپ بس اسٹاپ تک چلے تو خدانخواستہ......''

''ہاں! ٹھیک کہہ رہا ہے احمد' دو ہفتے بھی نہیں ہوئے آپریشن کو۔'' مصطفیٰ کا دماغ پہلے ہی سائیں سائیں کررہا تھا وہ اونچی دھڑکنوں میں پانی کا گلاس منہ سے لگائے قریبی کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اٹھا اور بالکونی سے باہر سڑک پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ گھنٹہ بھر کھڑے رہنے کے بعد اندر کمرے میں آگیا۔

دھیمی آواز میں ٹی وی اللہ جانے کب سے لگا ہوا تھا۔ وہی چل رہا تھا جو دن بھر چلتا ہے۔ روپ' بہروپ' نئی بساط' پرانے مہرے' ہزاروں ماؤں کی گودیں اجاڑ کر تائب ہونے والے حلیم الطبع چہرے نرم لہجے' ہاتھ رنگے ہوئے' پیچھے ہزاروں نوجوانوں' جوانوں کی روحوں کا کورس کی شکل میں ماتم کہ ''سارے شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے'' پڑھے لکھے Hostages کی عالم نزع میں معافی' چلو چھوڑو۔ اسکول میں دھماکہ ہوگیا۔ پر اسکولوں کے گرد تو باڑیں لگی ہوتی ہیں اب' جیسے مسجدوں کے باہر' تھانوں کے باہر' فوجی علاقوں کے باہر اور...... اور اسکولوں کے باہر گن مین بھی تو ہوتا ہے جس کے چہرے اور اسلحے کی ساخت ایک سی ہے پژمردہ اور Out Dated پر' رابعہ کیوں نہیں آئی؟ ہیں؟ اور یہ باہر آوازیں

کیسی ہیں؟ شاید ماتم کی عبادت ہو رہی ہے یا...... عبادت کا ماتم؟ کچھ نہ کچھ ہوتا تو رہتا ہے بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ ہوتا ہے پر کیسی بے روح عبادتیں ہیں کہ انسانیت کو نگلتی جا رہی ہیں۔ پر رابعہ؟ اور احمد فون کیوں نہیں اٹھا رہا؟ مصطفیٰ کو لگا اُس کے دماغ میں سوجن بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس نے دراز کھولی اور لرزتے ہاتھوں سے دو تین رنگ برنگی گولیاں نگلیں۔

مصطفیٰ کی آنکھیں بے جی کی تصویر پر ٹک گئیں۔ بے جی کی تصویر ہے یا بھاء سعید کی؟ جن ماؤں کے جگر کے ٹکڑے کارزارِ حیات میں کسی موڑ پر اچانک اوجھل ہو جائیں وہ 'آپ رانجھا' ہی تو ہو جاتی ہیں۔ زمین میں ایک چہرہ روشن ہوا جیسے ایک تیز جھکڑ سے دروازے کے دونوں پٹ کھل جائیں۔ بھاء سعید بھی تو پہلے گم ہوا تھا پھر...... اُف......!''

بانو اور احمد واپس آ گئے۔ رابعہ ساتھ نہیں تھی۔ مصطفیٰ سے کچھ بھی پوچھا نہیں گیا۔ اُن کے زرد ستے چہرے اُس کے نہ پوچھنے والے سوال کا جواب تھے۔

احمد مسلسل فون سن رہا تھا۔ یا پھر ایک کے بعد ایک نمبر ملا رہا تھا۔ بانو اضطراب میں بار بار کہتی۔

'میری بچی تو اور کہیں جاتی بھی نہیں گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔'' مصطفیٰ تھوڑی دیر بعد پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتارتا اور بے بسی سے کہتا۔

''احمد تم ہی کچھ پتا کراؤ۔'' احمد کے فون کی بیل بجی۔ اُس نے فون اٹھایا۔ بات کی اگر اُس کا چہرہ مزید زرد ہو سکتا تو ضرور ہوتا۔ وہ بات کرتے کرتے اپنے کمرے میں گیا۔ الماری سے کچھ نکالا اور شلوار کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھتا باہر آیا۔ مصطفیٰ کے کاندھے پر ہاتھ تھپتھپایا اور بانو کی طرف دیکھتا بولا۔

''میں ولید کی طرف جا رہا ہوں' آپ فکر نہ کریں۔'' مصطفیٰ اور بانو کے واویلا کرنے کے باوجود صرف اتنا بولا۔

''کہا ہے نہ کہ آتا ہوں۔''

سیاہ رات سرخ انگارہ بن کر بانو اور مصطفیٰ کی آنکھوں میں سلگ رہی تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ مصطفیٰ لپک کر اٹھا۔ باہر ولید کھڑا تھا آدھا منہ لپیٹے۔

''احمد کدھر ہے؟'' مصطفیٰ بے قراری سے بولا۔ ولید ہونٹوں پر انگلی رکھتا ہوا اندر آیا اور آہستہ سے بولا۔

''قریب ہی ہے رابعہ اُس کے ساتھ ہے، آپ بے فکر ہو جائیں۔ کیا؟ کیوں؟ کب؟ کیسے کے سوالیہ بھتنوں کے بیچ سے اُٹھا کر ولید مصطفیٰ کو اندر کمرے میں لے گیا کچھ پیسے پکڑاتا ہوا بولا۔

''انکل جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں آپ سب کی جان کو خطرہ ہے۔''

''کیوں' کیا پاکستان پھر سے بننے چلا ہے؟''، مصطفیٰ حواس باختہ ہو کر بولا۔

''انکل ہوش کی دوا کریں اور جو کہہ رہا ہوں ویسے کریں اتنا وقت نہیں ہے۔'' فق چہرہ لیے دروازے میں کھڑی بانو کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''آپ نے زیور نقدی جو اٹھانا ہے گھر سے اٹھالیں۔ باقی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہاتھ میں پکڑے بیگ میں مصطفیٰ کی دوائیاں اور قریب پڑی کچھ چیزیں ڈالتا ہوا بولا۔

''میں نے احمد کو سمجھایا بھی تھا کہ جس دلدل میں ہم پھنس گئے ہیں ہم چاہیں بھی تو اب پاؤں

پیچھے نہیں نکال سکتے۔ پر وہ کہتا تھا میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ آپ شکر کریں کہ اُن دونوں کی جانیں بچ گئی ہیں ورنہ یہاں تو......''

''آپ لوگ اب نکل جائیں یہاں سے‘ جان ہوگی تو جو بچا ہے اسے بھی بچا لیں گے۔''

نیچے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی اسٹارٹ کھڑی تھی۔ ولید نے مصطفیٰ اور بانو کو اُس میں پہلے بیٹھنے کو کہا پھر خود کچھ دیر بعد بیگ لے کر آیا۔ ولید کے بیٹھتے ہی گاڑی قریبی گلی میں مڑ گئی اور گلیوں میں گھومتی ایک دکان کے بند شٹر کے پاس رُک گئی۔ ولید نے شٹر کا دروازہ کھولا اور مصطفیٰ کو سہارا دے کر ذرا جلدی سے اندر کر دیا۔ اندر دیوار کے ساتھ ایک کاؤچ پر احمد اور رابعہ بیٹھے تھے ایسے کہ احمد کے ماتھے اور بازوؤں پر پٹیاں تھیں اور چہرے پر گہرا زخم تھا بانو غش کھا کر گرنے کو تھی جب مصطفیٰ نے اُسے مقام کر موڑھے پر بٹھایا۔ ولید سرگوشی میں بولا۔

''آپ لوگ شکر کریں کہ یہ دونوں سلامت ہیں۔'' احمد اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''معمولی زخم ہیں امی‘ کچھ دن میں بھر جائیں گے آپ لوگ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رابعہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دم سادھے چپ بیٹھی تھی۔ چیخیں‘ بے آواز بھی تو ہوتی ہیں۔ رابعہ جیسی لڑکیاں عورتیں اسپتال جاتی ہیں تو مرہم پٹی کروا کر اور روح کے زخم ادھڑوا کر واپس آتی ہیں۔ سوالوں میں شاذ و نادر ہمدردی ہو تو ہو ورنہ پہلے کھوج‘ پھر حقارت‘ اور بعد ازاں ’استفسار‘ کی تکرار میں چھپی سوسائٹی کی بخشی تاحیات نفرین تنہائی کا ایک ایسا جزیرہ آباد کرتی ہے جو کبھی بے آباد نہیں ہوتا۔

قصور کی مغموم موسمی فضاؤں میں بس کے اڈے پر کچھ مسافر اترے۔ ان میں مصطفیٰ‘ بانو‘ احمد اور رابعہ بھی تھے۔ مصطفیٰ کو لگا وہ کراچی سے نہیں ابھی ابھی کیمپ سے یہاں آیا ہے۔ پر اب سرسبز فصلوں کے اوپر فیکٹری Waste کے طفیل آلودہ دھند کی دبیز تہہ دکھائی دیتی تھی جو نظر کو دھندلاتی تھی۔ صبح کی سویر میں اندرسوں کی مہک بھی تو تھی اور کھنک اُن چوڑیوں کی جن کو نفیس ٹوکروں میں عورتیں سر پر اٹھائے گلی گلی بیچتی پھرتی تھیں۔

مصطفیٰ نے سوچا جب تک علی مراد زندہ تھا سارے منظر‘ پس منظر میں رہے۔ اور آج؟ احمد کو مصطفیٰ نے سہارا دے کر گاڑی سے اُتارا۔ بانو نے آگے بڑھ کر گھر کا بڑا دروازہ کھولا تو ہوا سے چنبیلی کے کچھ پھول اکٹھے گرے۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں ایک سجاؤ کے ساتھ مصطفیٰ نے دیکھا کہ ایک پھول رابعہ کے بالوں میں اٹکا تھا۔ رابعہ جو دروازے میں بت بنی کھڑی تھی۔ رابعہ تھی کہ بیل گاڑی سے کھینچ کر اُتاری زہرہ؟

پیچھے ذرا فاصلے پر بلھے شاہ کے دربار کے بیچ کچھ ٹنڈ منڈ شاہکار درختوں کے بیچ سے اٹھتی سارنگی کی المیہ دھن زمانے گزرنے پر بھی پوچھ رہی تھی۔

''کی جاناں میں کون؟'' بلوائی‘ مکتی باہنی‘ طالبان‘ نامعلوم افراد اور ان کی بھینٹ چڑھتی اداس نسلیں بھی اُس کی ہمنوا تھیں۔

بارشیں روٹھ گئیں۔
جھیلیں سوکھ گئیں
پر آنکھیں ابھی بھیگی ہیں
کہ سب دریا لہو رنگ ہیں

☆☆..........☆☆ ☆ ☆ ☆

افسانہ

تسنیم منیر علوی

ریشمی باتیں

''آپ جیسی فاتح عالم کے منہ سے یہ لفظ بے معنی لگتا ہے......اس کی باتیں میرے دل پر برچھی کی طرح جا لگیں۔ اُف یہ میں کیا کہہ گئی۔ اپنی بزدلی پر نادم سی ہو کر میں نے کہا اصل میں امتحان سر پر آ گئے اور بیرون اور غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے تیاری بھرپور نہیں ہے۔ اب آپ دیکھیں نا......

میں نے کمرے میں پہنچ کر دریچہ وا کیا۔ تو اریو کیریا کی نازک بیل نے جھوم کر میرا استقبال کیا۔ اور میرے بکھرے بالوں میں اُلجھ کر کمرے میں آ گھسی۔ وہ ہوا کے دوش پر ہولے ہولے جھول رہی تھی اور مجھے صبیحہ خانم پر فلمایا گیت یاد آیا۔

''لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم۔''

اس سہانے موسم سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے باہر جھانکنے کی کوشش کی لش پش کرتا لان دھوپ میں لشکارے مار رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر اس خواب آگیں منظر میں کیا گم ہوئی کہ جیسے اچانک بھونچال آ گیا۔ گھبرا کر پلٹی۔ پلٹ کی چھٹی کہ پٹ بند کردوں اسی جدوجہد میں لڑکھڑا گئی۔

''کہاں ہو؟ اتنی دیر سے آوازیں دے کر تھک گئی۔ فون کی گھنٹیاں دم توڑ گئیں اور اب ڈور بیل چنگاڑ رہی ہے اور یہاں تو بیگم 'حورعین ارسلان' 'مصورِغم' کی تصویر بنی کسی خیالی دنیا میں گم ہیں۔''

اس وقت امی کا جلالِ اکبری دیکھنے لائق تھا۔

''اوہ ہو...... کیا ہو گیا ابھی تو کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی۔ دروازے پر تو کوئی راہرو ہوگا چلا جائے گا۔'' میں نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔

''کیا مطلب روح ہوگی؟'' امی کے عینک کے پیچھے سے گھورا۔

''اچھا چلیں اب بتا بھی دیں فون کس ظالم کا تھا اس دوپہر میں۔''

''کوئی مسز بلگرامی تھیں تم سے کالج کے فنکشن کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔'' اور وہ واپس جانے کو پلٹ گئیں۔

''اوہ ہو مسز بلگرامی...... ہاں...... آج کل ریہرسل چل رہی ہے' ضرور ڈرامہ کا ہی کوئی سلسلہ ہوگا۔''

میں حورعین ارسلان اپنے کالج کی ذہین اور ایکسٹرا ایکٹیوٹیز کی روح رواں سمجھی جانے والی ایک عام سی لڑکی...... جس کا تعلق ایک روایت پسند گھرانے سے ہے۔ مگر یہ میری ذہانت تھی جس سے گھر والے مجبور ہوگئے۔ ورنہ اس خاندان میں کم ہی لڑکیوں نے کالجوں کا منہ دیکھا۔ آج کل یونین الیکشن کے بعد پہلی بار' ہفتہ طلبا منایا جا رہا ہے میں تین سال سے یہ الیکشن جیت کر V.C کی پوسٹ پر پہنچی۔

مسز بلگرامی میری بہت مہربان استاد ہیں۔ انہوں نے ازراہِ کرم مجھے اپنا موبائل نمبر بھی دیا ہوا تھا مگر میں احتراماً کبھی ان کو ڈسٹرب نہیں کیا۔ آج مجھے موبائل پر مخاطب کرنا ہی پڑے گا۔

''ہاں...... بات کرو۔ لٹل گرل۔''

''جی میڈم آپ نے یاد کیا۔'' (وہ مجھ سے بہت میٹھی اور ریشمی لہجے میں بات کرتیں)۔

''ہاں سوئٹ گرل ایک پرابلم ہوگئی ہے۔ ڈرامے کا مین رول کرنے والی تھرڈ ایئر کی اسمارہ انور بیمار ہوگئی ہے وہ معذرت کر رہی ہے۔''

''اوہ نو میڈم......'' میں گھبرا گئی۔

''اوہ ہو اب کیا کرنا ہوگا۔'' انہوں نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فرمایا۔ (میری تو جان پر بن گئی مگر اِدھر بڑا اطمینان بھرا لہجہ تھا۔

''حورعین ڈیئر میری بچی...... اب دو ہی کام ہوسکتے ہیں یا تو ڈرامہ کینسل...... یا پھر یہ پارٹ تم...... میرا مطلب لٹل گرل سرانجام دے تم ایک مہینے سے ریہرسل پر ہو۔ بہرحال سوچو...... لڑکی...... سوچو......''

ڈرامے کے مہمانِ خصوصی کوئی معمولی شخصیت نہیں انور مقصود صاحب سے بڑی تگ ودو کے بعد ٹائم ملا اب 24 گھنٹے پہلے ان کو انفارم کرنا۔ بڑی بری بات ہوگی۔ اس سچویشن میں اپنی بھی بے عزتی کا عنصر موجود تھا۔ میں نے جلدی سے دراز کھولی۔ اسکرپٹ نکالا اور ٹہل ٹہل کر اسمارہ والا (یعنی اپنا رول) ایکٹ کرنے لگی۔

''اُف خدایا...... میری تو ساری چوکڑی ہرن

ہوگئی۔ آئینہ میں ہونق جیسا چہرہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ اوہوں بڑی چیمپئن بنی پھرتی ہو۔ لعل گرل، سوئی......

ہماری نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں صرف 'آج' کی کہانی نہیں ہے یہ معاملہ کوئی اور ہے۔ اسکول ہی میں تھے کہ بیرونی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اپنی شاندار کارکردگی کی وجہ سے ٹیچروں کے بھی خوب سر چڑھے طالب علم تھے۔ ہم اور ہمارے گروپ کی شرارتوں کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔

ہمارا اسکول ایک مخیر خاتون نے اپنی کمیونٹی کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے کھولا تھا۔ جہاں تعلیم کی شدید کمی تھی۔ کم عمری میں شادیاں کردی جاتی تھیں۔

غربت اور کثرت اولاد کی وجہ سے والدین تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ایسے میں ہم لوگ 'مثالی طالب علم' کے طور پر گاہے بگاہے والدین سے ملانے کے لیے بلائے جاتے۔ (ہم جو گروپ لیڈر تھے) تو ہمارے کالر اونچے ہوجاتے۔ ہر پروگرام میں سرفہرست ہمارا ہی نام ہوتا......بس حورعین...... یہاں سے ابھر کر فضاؤں کو چھو لینے کی تمنا میں کالج جا پہنچتی ہے ہاں آپ کو لعل گرل کا ٹائٹل کی مسٹری بھی کھولنی ہے۔ ابا بتاتے ہیں۔ نرسری میں بچوں کا ٹیسٹ اور انٹرویو ہوا...... باہر نکل کر ابا نے پوچھا۔

''حور بیٹی ٹیچر نے آپ سے کیا سوالات کیے۔''

جانے ہم نے انگلش اردو میں کیا افلاطونی بھگاری باہر بڑی شان سے برآمد ہوئی۔ ہم سے کچھ بھی نہیں پوچھا' بس کہا۔

''ویل ڈن لعل گرل......'' ہم نے جواب میں اوکے مس کہا۔ بس اس دن سے ابا نے ہمیں پیار سے لعل گرل کہنا شروع کردیا۔ اسکول کو ایجوکیشن تھا۔ سو بات پھیل گئی شنائی کی...... مگر ہم نے کالج میں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ مگر اللہ بھلا کرے کمبخت 'رقیہ افسر علی' جو ہماری پڑوسی تھی۔ اس نے ہماری دوستوں کے سامنے اُگل دیا۔ بس نہ پوچھیے۔ منٹ میں جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہوگئے۔ (بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا) اب ہماری یہاں کی فضاؤں میں بھی حورعین ارسلان کا نام گونجنے لگا۔

کوئی استاد اگر پوچھتا بھی کہ بھئی کہ حورعین ارسلان کون لڑکی ہے؟ سامنے والا جواب دیتا۔

''ارے تھرڈ ایئر کی لعل گرل......''

''اوہ وہ اچھا اچھا جو اپنے سنہرے بالوں کو لمبی پونی میں سمیٹے اِدھر اُدھر ڈولتی نظر آتی۔'' ہمیں ان تبصرے' تذکروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمارے کمرے کے کونے کونے میں تمغے' ٹرافیاں' سرٹیفکیٹ اس بات کا ثبوت تھا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے بلکہ دوڑ رہا ہے۔

اب یہ بغیر تیاری کے ڈرامے میں انٹری مارنا بھی ایک کمالِ فن تھا سو وہ بھی ہم کر گزرے یعنی ''کود پڑے آتشِ نمرود میں ہم۔'' اور تادیر بجتی تالیاں اس بات کا ثبوت تھا کہ کام تسلی بخش ہوگیا ہے مہمان خصوصی نے اسپیشل انعام الگ سے ہمیں عنایت کیا۔ بس اس کے بعد ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

آج یہ لعل گرل یونیورسٹی میں بھی اپنی دھاک بٹھا رہی ہے اب تو بڑی بڑی شخصیات کے انٹرویو بھی ہم کرنے لگے ہیں۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ لوگ پہلے ہی سے کچھ پریشان ہوجاتے جب ان کو معلوم ہوتا کہ ان کا مکالمہ حورعین سے ہے تو ہمارے معصومانہ سوالات

سے گھبرا کر پہلو بدلنے لگتے اور ہم کو وقفہ لینا پڑ جاتا۔

آپ لوگ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ کالج اور یونیورسٹی میں دھاک بٹھانے والی اور جھنڈے گاڑھنے والی اسٹوری کچھ بورسی لگتی ہے کیونکہ ابھی تک اس میں کسی ہیرو کی انٹری نہیں ہوئی۔ بھئی ہم غیر نصابی سرگرمیوں کے علاوہ پڑھتے بھی ہے اور ہر سیمسٹر میں پوزیشن بھی لاتے تھے۔

نظامت آپ جانے کوئی آسان کام نہیں پورے پنڈال کا موڈ دیکھ کر نازک آبگینوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔

''عالیان اکبر'' ایک سنجیدہ متانت سے بھرپور نوجوان تھا۔ اُس کا یونیورسٹی میں فائنل ایئر تھا۔ اب وہ اکثر ہمارے پروگراموں میں پیش پیش ہوتا۔ کیونکہ وہ میگزین سیکریٹری تھا۔ اور ہم ایڈیٹر اس لیے اس (امدادِ ستائش باہمی کی وجہ سے عالیان نامی لڑکے سے واسطہ پڑنے لگا۔ یہ اندازہ ہمیں ہو چلا کہ خطرے کی گھنٹی سر پر بجنے والی ہے۔ یہ لڑکا ایک آندھی اور طوفان کی طرح آتا اور غائب ہو جاتا ہم نے تو 'چھلاوہ' نام رکھ دیا تھا۔ اس میں 'جیفری آرچر' جو انگلینڈ کا مشہور ناول نگار تھا جیسی جلد بازی تھی۔ اُس کا مشہور ناول 'رکومت' 'نکل جاؤ' کا وہ جیتا جاگتا شاہکار تھا۔ جب کسی آرٹیکل پر بات کرتا تو لگتا اس کو اگلے اسٹیشن پر اترنا ہے بات جلدی ختم کریں۔

ہاں تو مس حورعین اس پر میں نے کچھ نوٹ لکھ دیے ہیں آپ دیکھ کر تسلی کرلیں۔ کل سر افضال فائنل کریں گے۔ میگزین پریس جانے کو تیار ہے۔ پلیز...... جلدی...... ہری اپ...... ایک مشاعرہ بھی جلد ہے۔ جس میں نظامت کے لیے مجھے اور عالیان کو منتخب کیا گیا۔ میں تو حیرت زدہ رہ گئی مجھ سے تو

میزبانی کے لیے صرف میرا ہی نام لیا گیا تھا۔ ساتھ میں 'عالیان اکبر' کا دم چھلہ مجھے بالکل نہیں بھایا۔ میں نے تو انکار کر دیا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ ذرا بھی برہم نہ ہوا۔ ڈونٹ وری...... میں تو ذرا تبدیلی چاہتا تھا۔ دو تین شعرا کو مع تعارف کے آپ دعوتِ سخن دیں پھر میں...... اس طرح یک رنگی کے بجائے ذرا جدت آ جاتی۔ چلیں کوئی بات نہیں وہ پھر جانے کہاں روانہ ہو گیا۔

عالیان اکبر ایک متوسط طبقے کا ہونہار اور قابل نوجوان تھا۔ جو اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ضعیف ماں اور بیوہ بہن کا سہارا بھی تھا۔ اسی لیے وہ زندگی کی دوڑ میں تیزی سے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ راشدہ جو اس کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی نے بتایا کہ اس کے آفریش بلند ہیں۔ رات کو کسی کوچنگ سینٹر میں بھی پڑھاتا ہے۔ وہ اکثر اسکوٹر پر آتا اور بغیر کام کے ایک منٹ یونیورسٹی میں نہ رُکتا۔ اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے چرچے تھے۔ تو بیرونی سرگرمیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ میگزین سیکریٹری' مقرر نظامت اور اس پر کیمسٹری جیسا مضمون...... بس اب آدھی کیمسٹری میں جان گئی اور بقیہ بھی جلد جان ہی جاؤں گی۔

یونیورسٹی کے جواں سال نوخیز شعراء میں موصوف نظامت کے علاوہ میزبان کی حیثیت سے پہلا نام عالیان اکبر کا دیکھا۔ تو یہ حیران کن اطلاع تھی کہ موصوف شاعری بھی فرماتے ہیں۔

عشق میں ٹھوکریں اب ہم نہیں کھانے والے
ریشمی باتوں میں جانم نہیں آنے والے
(وہ بھی دربارِ ضرورت میں ملے سر بہ سجود اس مصرعے کو یوں لکھیں)
وہ بھی دربارِ ضرورت میں ملے سر بہ سجود
عزیت جن کی تھی دنیا کو جھکانے والے

اس دوسرے شعر نے تو گویا آگ لگا دی۔ داد وتحسین کے ڈونگرے برس پڑے۔ وہ تسلیمات اور کسرِ نفسی سے جھک جھک کر داد سمیٹتا رہا۔

پھر یونیورسٹی کے شعراء نے اپنا کلام نذر کیا۔ ایک سماں سا بندھ گیا۔ جامعہ کے شعراء نے بھی معیاری کلام پیش کیا یعنی ناامید نہ ہوان سے اے رہبر فرزانہ'' کیونکہ اسٹیج پر نامور شعراء بھی داد وتحسین بڑے بھرپور انداز میں دے رہے تھے۔

ہم لوگ خوش تھے کہ ہمارا پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ مگر میرے ذہن میں عالیان کا کلام ہی رس گھول رہا تھا۔

ہم ہوئے باغی مگر داد کے قابل وہ ہیں
ہم کو دیوار سے ہر بار لگانے والے

کیا اندازِ تکلم ہے اُس لڑکے کا' اتنی متاثر کن سخن وری کے بعد تو جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی' بقول لوگوں کے کہ عالیان نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ مگر اس کا احساس تو آگے جا کر ہوا کہ کون لٹ گیا'

میں نے بھی تو پہلی بار ہی اس پر بھرپور نظر ڈالی۔ بہترین تراش خراش کے سفید شلوار سوٹ پر بلیک واسکٹ میں مجھے کتابوں میں مجاز کی رکھی تصویر کی جھلک نظر آئی۔ امی بتاتی تھیں کہ سارا لکھنؤ مجاز پر مرتا تھا۔ بہرحال یہ شاعرِ دل نواز تو چھا گیا۔ فراخ پیشانی پر خمدار بالوں کے ریشمی لچھے جن کو وہ ایک ادائے خاص سے جھٹکتا تو مانو جانے کتنوں کے دل ہچکولے کھانے لگے۔

پروگرام کے اختتام پر اس کو مہ جبینوں میں گھرے دیکھ کر میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے...... اور نظامت میں مجھے اپنا چراغ گل ہوتے دکھائی دیا۔ جب میں نے اس کو مبارکباد دی تو وہ شکریہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا کئی شہد کی مکھیاں اس کے آس پاس اڑ رہی ہیں۔ مجھے اپنی بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ میں ذرا صبر کر لیتی کل مبارکباد دیتی تو زیادہ اہمیت ہوتی۔ وہ کتنی ادائے بے نیازی سے اپنی بیاض دل سنبھالے اسکوٹر کی طرف لپکا اور دھواں بن کر غائب ہو گیا۔ صرف میں نے دیکھا کہ ایک دودھیا روشنی میں اُس کا ہیولا رہ گیا۔ مگر...... میں کیوں اس کے متعلق اتنا سوچ رہی ہوں...... مجھے کیا...... کہ وہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے۔ غزلیں' نظمیں پڑھے۔ یوں بھی بقول اسمارہ وہ جلد ملک چھوڑ جائے گا۔ اس کو آسمان چھو لینے کی بڑی جلدی ہے اسی لیے کمند ڈال دی ہے۔ اماں اس کی شادی کر کے باہر جانے کی اجازت دے رہی ہیں جو وہ شاید ایسا نہیں چاہتا (دلِ ناداں کو ذرا تسلی ہوئی) میں نے اسمارہ کے سامنے مذاق میں کہا کہ آئیڈیا تو اماں کا برا نہیں اس کو فوراً شادی کر لینی چاہیے۔ ورنہ بہت سے دیوانے شمع کی مانند پھر رہے ہیں جنگ وجدل کا خطرہ ہو جائے گا میرا مطلب ہے قتال کا ڈر ہے۔ میں نے جلدی سے بات سنبھالی کہ دل کا چور نہ پکڑ لے۔

آج اسٹوڈنٹ ویک کا آخری دن تھا۔ یونیورسٹی میں رنگین پیرہن نیلے پیلے آنچل جلوے بکھیر رہے تھے۔ تتلیاں اِدھر اُدھر ڈولتی پھر رہی تھیں۔ مگر مجھے آج کے ایونٹس میں ذرا دلچسپی نہ تھی۔ مگر جانے کس آس میں چلی آئی تھی۔ نگاہیں اس ستم گر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ گو کہ اُس کو تلاشنے کی ضرورت تو نہیں تھی وہ دشمنِ جاں تو دور سے نظر آ جاتا۔ اس وقت نہ پھولوں کے تختے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مجھے تو ہر پھول بھی پُر ملال لگا کہ جیسے پھولوں کے بھی اپنے دکھ ہوتے ہیں۔ مرجھا جانے کے دکھ......

''اُف خدایا مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے میں حورعین ارسلان جو دنیا فتح کرنے چلی تھی۔ ایک...... ایک

معمولی سے شاعر سے ہار رہی ہے...... اونو...... میرا فائنل ایئر شروع ہونے کو ہے۔

رات ڈھل رہی ہے۔ تارے کہیں کہیں جھلملا رہے تھے جیسے جلتے بجھتے دیپ ہواؤں اور بادلوں میں چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ ان دنوں ہوا کا رنگ ڈھنگ اور مزاج میرا دل بنا ہوا ہے۔ کبھی تندو تیز جھکڑ کی طرح پکڑ دھکڑ اور کبھی ہولے ہولے...... نیند آنکھوں سے دور تھی میں نے ذہن میں بکھرے بہت سے سوالوں کو دور جا پھینکا۔ مگر کیا کروں کچھ دکھ ہیں دل میں سمندر جیسے' اُف حورعین ارسلان یہ تم ہو...... تم...... جس کی ذہانت' قابلیت متانت اور بولڈنیس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ یونیورسٹی میں کسی کو خاطر میں نہ لانے والی ایک شوخ و شنگ خوش اطوار جو برق و شرر بنی ساری جامعہ میں آگ لگاتی پھرتی خود ایک اپنی ساری قابلیت سمیت بکھرے بالوں والے آتش جواں شاعر پر مرمٹی...... بقول کسی کے دھند اور محبت میں سب کچھ سامنے ہوتا ہے پر نظر کچھ نہیں آتا۔

یہ سوچ کر کہ مجھے تو سب صاف نظر آ رہا ہے ہمت باندھی اور ملک کے اس پار جھلملاتے تاروں کو اپنی جھولی میں بھرنے کو بے قرار ہوئی۔ دل پر بند باندھا۔

''نہیں تمہیں...... آگے...... اور آگے جانا ہے۔ بس اب رُک جاؤ...... فائنل کے بعد ایم فل پی ایچ ڈی پروفیسری اس میں کہیں دور دور شادی کا سین نہیں...... مگر تم تو شاید کولمبس کی طرح نئی دنیا دریافت کرنے چلی تھیں۔ لعل گرل واپس اپنے محور پر آ کر مدار میں شامل ہو جاؤ۔ تم تو برف کے پاٹ لیے بیٹھی تھیں جو ذرا سی تپش سے پگھل ہی گئیں۔''

''اونہو اٹھو...... بہادر بنو...... یہ تو ابھی پہلا پتھر ہے۔ اور اس نے دل کا کہا مان کر آنکھیں موند لیں۔''

صبح بڑی تابدار اور روشن تھی۔ جھکڑ چلنا بند ہو چکے تھے۔ ماحول پُرسکون تھا۔ آج کل امتحانات کی وجہ سے یونیورسٹی میں سناٹا ہے سارہ اور اسمارہ نے کہا کہ رول نمبرز آ گئے ہیں آج آ جانا...... خلافِ توقع جامعہ میں چہل پہل نظر آئی۔ کچھ طالب علم نوٹس کے چکر میں کچھ رول نمبر کے حوالے سے اور کچھ بچھڑے اور جدائی کے لمحے امر کرنے آن پہنچے تھے جدائی میں بھی ملنے کے بہانے مانگے...... جب ہی میرے قریب آہٹ ہوئی وہ گھونگھریالے بالوں والا شاعرِ دل نوا...... مجسمہ سراپا حسن مجھے مردانہ وجاہت کا نمونہ لگا۔ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں متانت کے دیپ لیے میرے قریب آ چکا تھا۔ میں نے انجان بن کر دور کہیں افق کے اُس پار دیکھنے کی اداکاری کی۔ اس نے ہولے سے میرے کندھے پر دستک دی۔ اب میں نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

''اوہ لعل گرل!'' سیاہ چشمہ اُتار کر ہاتھ میں بڑی ادا سے گھمایا۔

''رول نمبر لے لیا یا ابھی مرحلہ باقی ہے۔'' میں نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس نے میری مسکراہٹ پر توصیفی انداز میں بھنویں اُچکا کر جیسے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟ اب صرف مسکراہٹ سے کام نہیں چل سکتا تھا۔''

''نہیں ابھی صعوبتیں باقی ہیں بڑی مشکل سے میں نے ردِعمل ظاہر کیا۔''

''کیا مطلب...... آپ اور صعوبتیں...... معاف کیجیے گا یہ لفظ آپ پر سوٹ نہیں کرتا۔'' اس کی بات پر میں ٹپٹا کر رہ گئی۔

''آپ جیسی فاتح عالم کے منہ سے یہ لفظ بے

معنی لگتا ہے...... اس کی باتیں میرے دل پر برچھی کی طرح جا لگیں۔ اُف یہ میں کیا کہہ گئی۔ اپنی بزدلی پر نادم سی ہو کر میں نے کہا اصل میں امتحان سر پر آگئے اور بیرون اور غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے تیاری بھرپور نہیں ہے۔ اب آپ دیکھیں نا یہ غیر نصابی سرگرمیاں جہاں کو ہم کو انتہائی متحرک رکھتی ہیں۔ ہاں کچھ جاں کا زیاں بھی ہو ہی جاتا...... اس نے میرا جملہ اچک لیا۔ مثلاً ...... میں تذبذب میں پڑ گئی۔ یعنی ابھی میرے پاس بہت سے اہم نوٹس کم ہیں۔ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا ہوگی۔ بس اور تو کچھ خاص نہیں میں نے کہا تو یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں نے بے بسی سے اطراف میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اب چلنا ہوگا۔ سارہ اور اسمارہ جانے کہاں رہ گئی ہیں۔ میں نے زیرِ لب گفتگو کی۔ وہ تو میرے ساتھ ہی آتی تھیں۔ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آیئے کینٹین...... آج اس کو بھی الوداع کہنا ہے۔ چلیے آپ بھی شریکِ غم ہو جائیں۔'' رات تک مجھے نوٹس مل چکے تھے۔

''اُف میرے خدایا...... اس شخص کو آج ہی کھلنا تھا۔ یعنی ہمیں مسمار کر کے...... چاہت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بلیو جینز پہ ڈارک بلیو چیک کی شرٹ اس کی اسمارٹنس میں اضافہ کر رہی تھی۔ او ہینڈسم نوجوان تم کیوں اتنی دیر سے ملے، اور اب ملے تو جا کیوں رہے ہو۔ دل نے ہولے سے دستک دی۔

کینٹین میں آج تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ علم کے پروانے آج گرم گرم سموسوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ سامنے ہی سارہ اور اسمارہ سے بھی ٹکراؤ ہوا جو ہمیں ڈھونڈتی ادھر آ نکلیں۔

عالیان کے ساتھ بیٹھ کر میں نے بھی زندگی کے کورے کاغذ پر اس سے ایک سوال داغا۔ تو اب آپ کا فائنل کے بعد کیا ارادہ ہے آپ ایسا کیوں نہیں کرتے ایم فل کریں۔ پی ایچ ڈی کریں اور یہاں اپنے ملک کی شان بڑھائیں اگر آپ جیسے جینئس نوجوان باہر ہی جا کر اپنا ہنر آزمائیں گے تو یہاں کون رہ جائے گا۔ وطن کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ (جانے مجھے کیا ہوا گھسے پٹے سوال کر رہی ہوں) اس وقت سارہ نے جن نگاہوں سے مجھے گھورا وہ مجھے سنبھلنے کے لیے کافی تھا۔

''یس...... رائٹ...... آنسہ حورعین ارسلان صاحبہ...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... مگر میں اور سب کی طرح سبک رفتار نہیں۔ بلکہ آپ کہہ سکتی ہیں برق رفتار مسافر ہوں زندگی کی راہوں میں قطعیت سے بھرپور...... اور بظاہر بے ضرر سا تبصرہ...... جانے میری جاں پر تیر سا چلا گیا ہے۔ شاید اسے میرا ردِعمل محسوس ہونے والا تھا۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی...... مادام میں آؤں گا...... پلٹ کر...... ہر دل ایک بنجارہ ہوتا ہے...... وہ پلٹ کر اپنا گھر ضرور دیکھتا ہے...... میں وطنِ عزیز...... میں اپنا حصہ ڈالنے ضرور آؤں گا۔ اس وطن کی آبیاری میں شریکِ کار بنوں گا۔ اور پھر آپ جیسے لوگ جہاں ہوں...... وہاں تو آنا بنتا ہے اس وقت تک آپ کے کاندھوں پر باگ دوڑ چھوڑے جا رہا ہوں۔ او کے...... لعل گرل...... انشاءاللہ...... کمنگ سون...... اور پھر وہ چلا گیا۔

بچپن سے لے کر آج جیون کی اتنی بہاریں گزار کر سوچتی ہوں۔ مجھے زندگی نے ہمیشہ بہت سراہا میری قدم قدم پر پذیرائی ہوئی۔ تو مجھے اور حوصلہ ملا...... اور میں آگے اور آگے قدم بڑھاتی چلی گئی ابا کہتے ہماری یہ بیٹی ہمارا نام روشن کرے گی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں ذہانت کے دپ

جلتے ہیں۔ یہ ان ہی کی حوصلہ افزائی اور بڑھاوا تھا کہ میں تپتے سورج، جلتا ساون، بادِ سموم یخ بستہ ہواؤں سب سے لڑتی چلی گئی۔ اور واہ واہ کے ڈونگرے برستے چلے گئے اسکول کے بے حساب انعامات، ٹرافیاں سرٹیفکیٹ اور کالج میں پہنچ کر بامِ عروج کو چھونے والی ایک لڑکی...... یونیورسٹی کے عام سے لڑکے سے ہار جائے...... جانے یہ کیسے ہوگیا ہر طرف ریشمی لہجے میرا استقبال کررہے ہیں۔ ابھی دنیا ختم نہیں ہوئی...... بقول ابا......

ایاز قدر خوش شناس

ایاز اپنی حیثیت خود پہچان

میرے ساتھ تو ایک زمانہ، ایک دنیا ہے جو میرے اردگرد ہالہ کیے مجھے اوپر بلندیوں پر لے جارہی ہے۔

عالیان موبائل پر مجھ سے رابطے میں ہے۔ کہتا ہے اگلے سال آجاؤں گا تم نے ہی تو کہا تھا کہ وطن کی ہوائیں بلاتی ہیں۔ مگر تم بھی تو بلاؤ...... مگر تم افق کے پار جانے کی تیاری میں سب بھول گئی ہو۔ سی ایس ایس کی تیاری میں تمہیں کچھ یاد ہی نہیں۔

میری یونیورسٹی کی دوستیں پیا دیس سدھار ہیں۔ اماں کو میری شادی کی جلدی ہے مگر میرے دل وساز پر دھڑکتا دل اسی محرم ہمدم کا دم بھرتا ہے۔ اماں بھی میری مردوں کے معاشرے میں بے خوف وخطر کود پڑنے سے کچھ خوف زدہ ہیں...... کیا میری تعریفیں اور کمال کی انتہائیوں تک دیکھنے والے لوگ مجھے اپنا بھی لیں گے؟ لیکن وہ لوگ دولت کے پجاری لگتے ہیں۔ یہ بڑا سا گھر...... اور بڑا سا سرکاری عہدہ...... دریچہ گل تو صرف عالیان ہی کے لیے وا ہوسکتا ہے۔

مگر حالات نے کروٹ بدلی۔ پھر کچھ یوں ہوا...... کہ اُس کو آنے میں دیر ہوئی۔ وہ جو ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے اب اس کو دیر ہورہی ہے۔ کبھی ...... جاب کا مسئلہ...... کبھی چھٹی کا مسئلہ...... میں جو بساطِ دل میں اس کو بسائے بیٹھی تھی۔ سب کچھ ہی رائیگاں ٹھہرا...... اور بے مہری یاراں کی ماری کلکٹری کی آفیسری...... اور آفیسروں کی آؤ بھگت جا بے جا حکم کی بجا آوری پر مجبور ہوئی...... اور آخر شب کا مسافر بنی سر جھکائے باداب کھڑی رہ گئی۔ ہم کو دشمن بھی صاحبِ کردار ملے۔ وہ ایک حبس زدہ دن تھا میں فائل لے کر افسر اعلیٰ کے کمرے میں جانے کو مڑی کیونکہ میٹنگ بھی تھی...... مگر...... اندر ہونے والی گفتگو نے میرے قدموں کو جکڑ دیا۔

''سر یہ مس حورعین...... اتنی جفاکش، محنتی، خود کفیل مگر تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ بہت سوبر خاتون ہیں...... میرا خیال ہے شاید ایسے ذہین لوگوں کو اپنا جیسا انسان روئے زمین پر نظر ہی نہیں آتا...... سنا ہے یونیورسٹی میں بڑا شہرہ تھا اور وہ...... مگر مسٹر افتخار کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ یقیناً اب انہوں نے گھومنے والی کرسی پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ میں نے راہداری میں سناٹا دیکھ کر شکر کیا۔

اب سر کی آواز آئی...... آپ نے کبھی ان کے سراپے پر غور نہیں کیا۔ ذہانت، متانت، خوبصورتی عارضِ گل اپنی جگہ...... یار انہوں نے ساری زندگی ہمدردی سمیٹنے میں ہی گزار دی۔ اور اپنی پستہ قامتی کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوجاتیں تو لوگوں نے سر پر بٹھالیا۔ اُس لڑکے کو بھی ان سے ہمدردی ہوگئی ہوگی...... جناب افتخار صاحب حوصلہ افزائی اور محبت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اچھا آپ بتائیں...... اس سے آپ شادی کریں گے۔ آپ تو بہت بڑے فین ہیں مس حور عین کے...... بولیں۔

اس سے آگے مجھ میں سننے کی تاب نہ تھی۔ یہ

الفاظ میرے لیے سوہانِ روح بن کر مجھے زمین بوس کر گئے۔ اور اپنا قد واقعی بونا سا لگا...... اور آج سرو قد لوگوں کے آگے ہار گئی۔

اب عالیان کا گریز بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ریشمی باتوں میں جانم نہیں آنے والے...... اُف اس قدر ظالمانہ سوچ...... یخ بستہ رویہ...... میرا سارا فسوں زور توڑ گیا۔ مگر بقول عالیان اکبر عشق میں ٹھوکریں اب ہم نہیں کھانے والے...... ''قدرت نے عزت، شہرت، دولت سے نوازا اگر شریکِ سفر نہ ملا۔ تو...... کیا...... ہوا......

میں نے پرنم آنکھوں اور بکھرے بال سمیٹے اور گھر میں ایک نئے عزم سے داخل ہوئی مگر سامنے رکھے میڈلز ٹرافیاں، کپ، سرٹیفکیٹ، تمغے سب میرا مذاق اڑانے لگے۔ اور جو حکومتِ پاکستان نے ایوارڈ دیا وہ بھی ہمدردی کی وجہ سے ملا۔ یا میری حوصلہ افزائی کے لیے سب کچھ تھا۔ میری محنت ذہانت، خوش کلامی، ستائشی تالیاں، شفقت سب میری کوتاہ قامتی کی بدولت مجھے ملتی رہی۔ کیا مجھے اپنا یہ ادھورا پن معلوم نہ تھا۔ مگر میں نے کبھی اس کو آڑے آنے نہیں دیا۔ بلکہ اپنے قد سے بلند ہو کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ مایا انجیلو بن گئی جس نے کہا تھا کہ ''Still Rise''۔

''اٹھو اور چھا جاؤ'' میں تمام کرفرماؤں کی مشکور رہوں جنھوں نے میرا ساتھ دیا۔ (روسٹرم) کو میرے سامنے رکاوٹ نہ بننے دیا اے میرے سرو قد انسانوں...... خوش گماں احباب...... کوتاہ قامتی نے مجھے ہمٹی ڈمٹی نہیں بننے دیا۔ بلکہ میں ایک سب میرین بن گئی جو جتنی گہرے سمندر میں ہوتی ہے اتنی اوپر بھی ہوتی ہے اور آنے والے طوفانِ بلاخیز کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ میں نے بھی ایک دنیا کو سرنگوں کیا۔

میری سوچوں میں اچانک ارتعاش پیدا ہوا...... میں تو کبھی بادِ صبا ہے...... مگر دروازے پر لگی گھنٹی نے مجھے دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میرے سامنے کوئی اور نہیں...... مسٹر افتخار پورے قد کے ساتھ پھول لیے ایستادہ تھے۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔ اور میں نے راستہ روکا بھی نہیں۔ گر قبول فرمائیں۔ میں نے بڑھ کر سارے پھول سمیٹ لیے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ جب کوئی پھول لے کر ملنے آئے تو زخمی جسم و جاں کو بھول جانا چاہئے۔ اور پھر اس مہرباں کی دستک کو تو میں نے کئی بار محسوس کیا تھا۔

''کل سر فرہاد کے چیلنج نے شاید آپ کو بھڑکا دیا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''اوہ نو...... پھول تو محبت کا استعارہ ہیں تو اس لیے اس کو قبول کرنے میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ افتخار نے دو قدم آگے بڑھائے...... پھر قدرے جھکا...... آپ تک آنے میں دیر ہوئی...... معذرت...... بے انتہا معذرت

میرے اچھے اور پیارے قارئین...... آپ نے میری کہانی کا یہ رخ دیکھا...... ابھی کچھ روشنی باقی ہے گرچہ کم ہے۔ جب چاہتوں کے گلاب ہاتھ میں اور آنکھ میں ستارے ہوں...... تو مجھے کیا کرنا چاہیے سوچیے...... میں ہوں...... جواب کی منتظر...... آپ کی اپنی...... حورعین ارسلان......

(مایا انجیلو سیاہ فام امریکی شاعرہ، مصنفہ اداکارہ اور ہدایت کارہ)

تم مجھے اپنے لفظوں سے مار سکتے ہو
تم مجھے اپنی آنکھوں سے کاٹ سکتے ہو
تم مجھے اپنی نفرت سے قتل کر سکتے ہو
لیکن میں ہوا کی مانند پھر سے اٹھوں گی

☆☆......☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

افسانہ

عقیلہ حق

تین انگلیاں

''کیا بات ہوگی' رضا ہی کا مسئلہ ہے لڑکیاں دکھا دکھا کر تھک گئی لیکن صاحبزادے کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ آج بھی فاروقی صاحب کی بیٹی کو دکھایا ماشاءاللہ امریکہ سے ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کر کے آئی ہے رنگ ایسا ہاتھ لگاؤ تو......

سردیوں کی شامیں بہت جلد رات کے اندھیرے میں بدل جاتی ہیں۔ شام کی بارش کے بعد سردی کی شدت میں اضافے نے سب کو بہت جلدی دروازے بند کر کے بستروں میں دبکا دیا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ بارش کے بعد خنکی' شدید سردی اور بجلی کی غیر موجودگی عجیب خوف اور پُراسراریت کا تاثر دے رہی تھی۔ پھر ایک گھر کا دروازہ کسی نے کپکپاتے ہاتھوں سے ذرا سا کھولا' ڈری سہمی' خوفزدہ آنکھوں نے دروازے کی جھری سے گلی کی خاموشی اور سناٹے کا اندازہ لگایا' پھر اندر پلنگ پر پڑی عورت کو انتہائی نفرت سے دیکھتے ہوئے زمین پر تھوکا' اور پھر چادر میں چھپی گٹھری کو دیکھا......اور آہستگی سے باہر قدم رکھ دیا۔ ہڈیوں میں اترتی خنکی اُس کی ہڈیوں میں موجود گودے کو بھی جما رہی تھی' لیکن وہ چادر میں لپٹا وجود تیز تیز کچرہ کنڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہمیشہ گھر کے پاس ہونے والی کچری کنڈی کی شکایت کرنے والے وجود کو......آج کچرہ کنڈی دنیا کے دوسرے کونے پر لگ رہی تھی۔

اس نے کچرہ کنڈی میں سردی سے ٹھٹھرتے کچھ سوئے کچھ آنکھیں بند کیے کتوں کو دیکھا اور پھر چادر میں چھپی گٹھری کو......ایک لحہ کو اُس کا دل کانپا' اُس کا ارادہ بدلا......لیکن پھر اُس نے کچرہ کنڈی میں پیر رکھا ہی تھا کہ دور سے سائیکل پر سوار علاقے کے چوکیدار کی سیٹی پر وہ وجود اُچھل پڑی اور اُس کا پیر کتے کی دم پر جا پڑا اور پھر پورا علاقہ کتوں کے بھونکنے اور ایک عورت کے بری طرح چیخنے سے گونجنے لگا۔

☆......☆......☆

''اے لو خدا کی قسم......میں نے خود اپنی اِن گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے مولوی صاحب کی بیٹی اللہ توبہ توبہ......'' خالہ زبیدہ نے انگشت شہادت اور انگوٹھے کی پوروں سے کانوں کی لوؤں کو چھوا' اور پھر کلے پیٹنے لگیں۔

''یا اللہ مجھے معاف کردے' میں گناہ گار میری آنکھیں گناہ گار......لیکن یہ نام نہاد شریف زادیاں'

یہ اماموں کی بیٹیاں...... اللہ تو دیکھ رہا ہے نا۔'' خالہ زبیدہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر زور...... زور سے نفی میں سر ہلانے لگیں۔

''ارے ہوا کیا خالہ زبیدہ جو اِس قدر توبہ تلا کیے جارہی ہو۔ اور بتا کچھ ہو نہیں رہی۔'' رشیدہ نے پان کے ٹکڑے پر کتھا چونا لگا کر اُن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ارے بہن میں نہیں بتا سکتی، یا اللہ رحم...... '' خالہ زبیدہ نے پھر کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''دیکھو خالہ زبیدہ...... یا تو تم شوشے مت چھوڑا کرو...... اور اگر شوشہ چھوڑتی ہو تو بتایا کرو۔ اب بات بتانی ہے تو بتاؤ' ورنہ ختم کرو یہ توبہ تلا...... '' رشیدہ حقیقت میں جھنجلا گئی۔

''اری چل سن...... مولوی صاحب کی حافظہ بٹی راتوں کو بڑی سی گاڑی میں گھر آتی ہے۔ گاڑی کے شیشے بھی کالے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت جھانکنے کی کوشش کی ایک دن کہ دیکھوں تو سہی موا ہے کون؟ یہ گاڑی والا...... ''

''تو نظر آیا؟'' رشیدہ نے بے تابی سے زبیدہ خالہ کی بات کاٹی۔

''خاک...... خاک نظر آیا...... '' زبیدہ خالہ نے بند مٹھی ایسے ہوا میں کھولی جیسے سچ مچ کسی پر خاک پھینک رہی ہوں۔

''واقعی...... '' پیٹ کی ہلکی رشیدہ کولہوں کے بل

کھسکتی ہوئی خالہ زبیدہ کی قریب ہوئی۔

''اے لو بی بی..... تو کیا میں جھوٹ بولوں گی، میں نے ایک دفعہ دیکھا، پھر کئی بار دیکھا۔ پتہ چلا یہ تو روز کی کہانی ہے۔''

''مولوی صاحب اللہ معاف کرے..... منوں مٹی تلے جا سوئے..... اور بیٹی رنگ رلیاں مناتی پھر رہی ہے۔ اللہ معاف کرے بہت ہی بدلحاظ آدمی تھے مولوی صاحب.....''

''میاں آپ مجھ کو کھانے پر بلا رہے ہیں، معاف کیجیے گا آپ سود پر رقم کا لین دین کرتے ہیں، سود کھانا حرام ہے، جس نے سودی کاروبار کیا۔ اُس نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ کی۔'' مولوی عبدالقدوس نے رجب علی (خالہ زبیدہ کا شوہر) کے گھر کھانے کی دعوت سے معذرت کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا۔

''ارے مولوی صاحب میں کیا کام کرتا ہوں، کس طرح کماتا ہوں یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ آپ مولوی ہیں اور آپ یہ نہیں جانتے کہ دعوت کو منع کرنا ہمارے دین میں اچھا نہیں سمجھا گیا۔'' رجب علی نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''صحیح کہتے ہو میرے بھائی، لیکن جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے حالتِ جنگ میں ہو، اُس سے دوستی رکھنا، تعلق رکھنا، کیا صحیح ہے، بلا جواز دعوت منع کرنے کو پسند نہیں کیا۔ لیکن میرے پاس تو جواز ہے، ویسے بھی جس نے ایک لقمہ بھی حرام کھایا وہ جسم جنت میں نہیں داخل ہو سکتا۔''

''حرام کھایا.....'' خالہ زبیدہ بڑبڑائیں۔

''کیا ہو گیا خالہ..... کن سوچوں میں غرق ہو، کس نے حرام کھا لیا۔'' رشیدہ کی آواز اُن کو حقیقت میں واپس لے آئی۔

''ارے کچھ نہیں، پتہ نہیں یہ دماغ کن کن سوچوں میں اُلجھتا رہتا ہے۔'' خالہ زبیدہ کھسیانی سی ہو گئی۔

''خیر چھوڑو، خالہ ویسے ایک بات ہے مولوی صاحب یوں تو امام مسجد تھے اور بیٹی کو کالج، یونیورسٹی تک پڑھایا۔'' رشیدہ کے اندر کی اَن پڑھ بغضی عورت نے بلبلا کر، ایک اور بات کہی۔

ارے ہاں، جبھی تو دیدوں کا پانی مر گیا ہے، ارے میں تو کہتی ہوں لڑکی کو گھر کی چار دیواری میں رکھو، بس اتنا لکھنا پڑھنا سکھا دو کہ دھوبی کا حساب لکھ لے اور جو پردیس میں نصیب کھلے تو چار لائن خیریت کی لکھ بھیجے..... اِس کے علاوہ کیا ضرورت ہے۔ اب ہماری بچیاں بھی ہیں، کبھی گھروں سے نکلیں، تمہاری سنجیدہ اور میری زاہدہ اپنے گھروں سے نکلتی ہیں جو یہ برقعہ پوش حسینہ صبح ہوتے ہی نکل جاتی ہے اور پھر شام ڈھلے بڑی سی گاڑی میں آتی ہے۔'' خالہ زبیدہ کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی۔

''خیر خالہ بچیاں تو سارے ہی محلے کی اچھی ہیں۔''

''بس بی بی، بس چپ ہی رہو، میرا منہ مت کھلواؤ، مجھے معلوم ہے سارے محلے میں کیا ہو رہا ہے، کس کے گھر میں کون، کس سے ملنے آ رہا ہے۔ ارے وہی دیکھ لو..... نکڑ والے..... وکیل صاحب ہر اتوار کو اُن کے گھر، ایک خوبصورت سوٹڈ بوٹڈ وکیل آتا ہے۔ اور پھر سارا دن اُس کی گاڑی اُن کے گھر کے باہر کھڑی رہتی ہے۔'' خالہ نے اپنی دانست میں ایک اور راز کھولا۔

''ارے ہاں خالہ زبیدہ وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ وکیل صاحب کا شاگرد ہے۔'' رشیدہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو شاگرد ہے تو گھر میں کیوں پڑا رہتا ہے، ارے وکیل صاحب کی بڑی بڑی آنکھوں والی

بیٹی ہے نا...... ارے کوئی لاکھ چھپائے...... میں سب سمجھتی ہوں، اُن کی بیٹی سے چکر ہوگا۔ بلکہ ہوگا کیا چکر ہے...... میری بنو......'' خالہ نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ رشیدہ کو دیکھتے ہوئے پان کی پیک اُگلدان میں تھوکتے ہوئے کہا۔

''اچھا لیکن خالہ زبیدہ تم کو خوب خبر رہتی ہے سارے محلے کی۔'' رشیدہ کا لہجہ خوشامدی ہوا۔

''ارے نہیں پتہ چلنے کے لیے کسی کا بتانا ضروری نہیں ہوتا' ارے یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ ایک زمانہ دیکھا ہے' خیر میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی۔'' خالہ زبیدہ کھڑی ہوکر پیر چپل میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو نا خالہ......'' رشیدہ نے اُن کے دوپٹے کا کونا پکڑا۔

''نہیں بہت دیر ہوگئی پھر آؤں گی۔ ذرا غفورے کی بیوی کی خبر لے لوں۔'' خالہ زبیدہ نے دروازے سے نکلتے نکلتے پلٹ کر کہا اور سر پر دوپٹہ جماتی باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

ایک لوئر مڈل کلاس محلہ تھا جہاں لوگوں کے مسائل ہمیشہ وسائل سے زیادہ ہوتے ہیں جہاں تفریح کے لیے عورتیں ایک دوسرے کے گھر کے بھید کھوجتی اور پھر دوسری کو بتاتیں اور مرد چبوتروں پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے۔

مسائل اور وسائل کے درمیان سارے محلے میں گردش کرتی خالہ زبیدہ بھی تھیں' وہ بیوہ تھیں' اُن کی ایک ہی بیٹی تھی جو سات جماعتیں پڑھ کر گھر بیٹھی تھی اور خالہ زبیدہ اُس کو سودا سلف دے کر جو محلے کی خبر گیری کو نکلتیں تو پھر بھی گھر آتیں جب اُن کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے۔

☆......☆......☆

اور تمہاری اماں B.B.C لندن اپنے ٹور پر سے کب واپس آئیں گی۔'' خرم نے روبی کے چہرے پر جھولتی لٹ کو چھوتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

''اب ایسے تو نہ کہو......'' روبی کو برا لگا۔

''لو میں کیا' سارا محلہ ہی کہتا ہے' کوئی B.B.C لندن کوئی C.N.N اور کوئی دھوم چینل کہتا ہے' میں نے کہہ دیا تو تم کو برا لگ گیا۔ خیر چھوڑ امیری جان اِن حسین لمحات کو میں تمہاری اماں کے ذکر سے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

ویسے یہ تمہاری قمیض کی فٹنگ بہت زبردست ہے۔'' خرم نے روبی کے جسم کے نشیب و فراز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے لوفرانہ انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہٹو...... تم تو......'' روبی نے شرماتے ہوئے اپنی کمر پر پھسلتا ہوا اُس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ارے میری جان...... بس تم...... اِن دونوں ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں دے دو......'' خرم نے اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ایک ہاتھ میں پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اُس کے بالوں کی لٹوں کو چھیڑتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا۔ اور پھر روبی کو ایسا لگا' جیسے اُس کی زبان گنگ ہوگئی ہو۔

☆......☆......☆

''یہ کون ہے؟'' ہاشمی صاحب گھر میں داخل ہوئے تو برقعہ میں لپٹی' اُس لڑکی کو جس کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھتے دیکھ کر اپنی بیگم ہما سے پوچھا۔

''صبا کو قرآن پڑھانے کے لیے آتی ہے۔ بہت پیاری اور نیک لڑکی ہے' آپ کو تو معلوم ہے صبا کسی سے بھی قرآن پاک نہیں پڑھ پا رہی تھی۔ اس دفعہ جب میں اُس کے اسکول پیرنٹس ٹیچر میٹنگ میں گئی اور صبا کی ہمیشہ کی طرح بہت شاندار اکیڈمک

رپورٹ ملی۔ تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کاش صبا قرآن پاک بھی اتنی ہی توجہ سے پڑھ لے' بس میرے دل کی تڑپ اللہ نے سن لی اور پرنسپل صاحبہ نے مجھ کو قاریہ آمنہ سے ملوا دیا۔''

''الحمدللہ...... الحمدللہ...... قاریہ آمنہ سے ہماری بیٹی نہ صرف خوش ہے بلکہ بہت دلجمعی سے پڑھ بھی رہی ہے۔ قاریہ آمنہ نیک اور سلجھی ہوئی ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ اور عالمہ بھی ہیں۔'' مسز ہما نے ہاشمی صاحب کو تفصیلاً بتایا۔

ہاشمی صاحب شہر کے معروف بزنس مین تھے۔ دولت اُن کے گھر کی لونڈی تھی' لیکن اُن کے گھر میں دین کی بہت اہمیت تھی۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ ہاشمی صاحب اور اُن کی بیگم ہما کیونکہ اعلیٰ حسب نسب والے خاندانی رئیس تھے۔ لہٰذا مال و دولت کی کثرت کے باوجود اُن کے مزاجوں کی سادگی مثالی تھی۔

''بہت خوب تو کیا آپ پک اینڈ ڈراپ کرتی ہیں۔'' ہاشمی صاحب نے ملازمہ کے ہاتھوں سے کافی کا کپ لے کر سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خیر بلواتی تو نہیں' لیکن ہمارے گھر سے اسٹاپ بہت دور ہے اور راستہ سنسان بھی ہے تو میں اسٹاپ تک ڈراپ کروا رہی ہوں۔ اور......''

''نہیں جوان بچی ہے...... آپ گھر تک ڈراپ کروایا کریں۔'' ہاشمی صاحب نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تو ہما بیگم مسکرا دیں کہ میاں کی بات اُن کے دل کو بھی لگی تھی۔

☆......☆......☆

ہم لوگ کہاں کھڑے ہیں۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے ایک عالمہ اور ایک قرآن پڑھنے والے اللہ کے احکامات کو کیسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بغیر جانے بوجھے جس کو جو دل چاہا کہہ دیتے ہیں' ہم کیوں بھول جاتے ہیں' اللہ سب دیکھ رہا ہے وہ تو روزِ حشر بھی اپنے بندوں کا جب حساب کرے گا تو راز داری کا خیال رکھے گا اور ہم...... ہم نہ جانے کیوں بھول جاتے ہیں کہ

زَبر نہیں زِیر ہو جا

کیونکہ آگے 'پیش' ہونا ہے

☆......☆......☆

خرم دوائیوں کی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا' پنجاب کے کسی گاؤں سے آیا تو اتنے بڑے شہر میں رہنے کو' کوئی جگہ نہ ملی تو پھر اُس نے خالہ زبیدہ کے گھر کے اوپر والا دو کمروں کا پورشن اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر لے لیا' اور پھر ایک دن اُس کی اور روبی کی راستے میں مڈبھیڑ ہوئی تو......

''اری کب سے دروازہ پیٹ رہی ہوں' کہاں تھی؟'' خالہ نے روبی کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''وہ اماں......'' روبی نے پچھلے دروازے کے بند ہونے پر اطمینان کی گہری سانس لی۔

''نماز پڑھ رہی تھی۔'' اُس کا لہجہ حد درجہ پُراعتماد تھا۔

''اللہ میری توبہ...... قیامت کی نشانی ہے قیامت کی۔'' خالہ نے دروازہ بند کر کے گلی میں جھانکتے ہوئے خود کلامی کی۔

''کیا ہوا اماں کیا نماز پڑھنا' قیامت کی نشانی ہے۔'' روبی نے اپنی کٹی ہوئی لٹ کو انگلی سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں مولوی صاحب کی بیٹی' دیکھو تو ذرا روز کیسی لمبی گاڑی میں آتی ہے۔ اللہ جانے کس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔'' خالہ زبیدہ نے روبی کو دروازے کی اوٹ سے دکھاتے ہوئے کہا۔

''نصیبوں والی ہے کیا مالدار پھنسا ہے' ایک یہ خرم ہے کبھی تحفہ تک نہیں دیتا۔'' روبی نے جلتے دل

کے ساتھ سوچا اور پلٹ گئی۔

☆......☆......☆

میری پھول جیسی بچی سارا دن دردر پھرتی ہے، میرے مالک برحق میں تو سوکھی روٹی کے دو نوالوں پر شاکر ہوں۔ لیکن میرے مالک تو ہی بتا' میں بن باپ کی بچی کے ہاتھ کیسے پیلے کروں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں کہ میں اس گوہر نایاب کی حفاظت کرسکوں تو ہی حفاظت کرنے والا ہے۔ میرے مالک میری آخری سانس سے پہلے تو اِس کے لیے اِس کا محرم بھیج دے' تُو نے جہاں اِس کا نصیب لکھا ہے اُن کو بھیج دے میرے مالک ہمارا تیرے سوا کوئی آسرا نہیں۔ تُو کن فیکون کا مالک ہے' تُو کُن کہہ دے۔ میرے آقا 'کُن' کہہ دے۔'' رقیہ بیگم تہجد کے نفل کے بعد سجدے میں گری مالک کائنات سے سرگوشیاں کررہی تھیں اور سجدہ بھی کیا اللہ کی نعمت ہے کہ زمین پر سرگوشی کرو تو آسمان پر سنی جاتی ہے۔

اور پھر ماں کی دعا اولاد کے حق میں تہجد کے وقت......''

☆......☆......☆

''میں رضا کی طرف سے کافی فکرمند ہوں۔'' ہما بیگم نے الماری میں سوٹ ہینگر کرتے ہوئے ہاشمی صاحب سے کہا جو بہت توجہ سے اخبار پڑھ رہے تھے۔

''آپ سن رہے ہیں نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' انہوں نے ہاشمی صاحب کی مسلسل خاموشی سے جھنجلا کر پوچھا۔

''جی سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں کہ آج آپ کو بہت غصہ آرہا ہے۔ خیریت! کیا ہوا......'' ہاشمی صاحب اپنے مخصوص اور ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

''کیا بات ہوگی' رضا ہی کا مسئلہ ہے لڑکیاں دکھا دکھا کر تھک گئی لیکن صاحبزادے کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ آج بھی فاروقی صاحب کی بیٹی کو دکھایا ماشاء اللہ امریکہ سے ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کر کے آئی ہے رنگ ایسا ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔ لڑکی' تعلیم' گھرانہ ہر چیز پرفیکٹ، بیٹے سے پوچھا تو ہمیشہ کی طرح اُن کی گردن نفی میں ہلنے لگی۔'' ہما بیگم بہت غصے میں تھیں۔ بیٹے کی شادی کے خواب ماں بچپن سے ہی دیکھنے لگتی ہے اور بیٹا بھی سب سے بڑا اکلوتا اور انتہائی قابل ڈاکٹر......''

''اچھا آپ غصہ نہ کریں میں بات کروں گا۔'' ہاشمی صاحب نے اُن کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''کروں گا نہیں ابھی کریں......'' ہما بیگم کا لہجہ ضدی ہوا اور ہاشمی صاحب بے ساختہ ہنس دیے۔

☆......☆......☆

''یہ آپ کی والدہ ہیں؟'' ڈاکٹر رضا جو بہت انہماک سے اُن خاتون کی آنکھیں ٹیسٹ کررہے تھے پلٹ کر اُن کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی سے پوچھا۔

سفیدی میں گھلا گلابی رنگ' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' ستواں ناک' خمیرہ ہونٹوں کے کنارے حسن کا نگہبان تل' تھوڑی پر پڑا ڈمپل' وہ جو چہرے پر نقاب اٹھائے پانی پی رہی تھی۔ اُس نے گھبرا کر پُرشوق نظروں سے تکتے......ڈاکٹر کو دیکھا اور گھبرا کر جلدی سے چہرے پر نقاب گرالی۔ ڈاکٹر رضا کو لگا جیسے چاند بدلی میں چھپ گیا ہو۔ جیسے فضاء میں سے آکسیجن آہستہ آہستہ ختم ہورہی ہو...... جیسے اُس کا وجود ہوا میں تحلیل ہوکر......خلاؤں میں ڈول رہا ہو۔

یہ شہر کا ایک غریب علاقہ تھا جہاں ایک بین الاقوامی این جی او نے فری آئی کیمپ لگایا تھا اور ڈاکٹر

رضا کیونکہ اُس این .جی اوز سے وابستہ تھے لہٰذا وہ بھی مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن اب ڈاکٹر رضا کو لگ رہا تھا جیسے اِن آنکھوں کو دیکھنے کے بعد وہ خود بیمار ہو گئے ہوں...... محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے' اُن کو یقین ہو گیا تھا۔ وہ نازک سی انجانی سیاہ برقعہ میں لپٹی' ہاتھوں کو دستانوں اور پیروں کو موزوں میں چھپائے...... جس کا نام ...... اَتہ پتہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک قیمتی نگینہ کی طرح تھی۔ رضا اُس نگینہ کو اپنی انگوٹھی میں جڑنا چاہتے تھے۔ اُس کا وجود سیاہ برقعے میں ملبوس اُن کو اپنے آس پاس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نہ جانے کب کی جا چکی تھی۔ اور ڈاکٹر رضا' کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو گھور رہے تھے۔ اور پھر رضا کی ہر دعا میں اُس کو دیکھنے...... اُس سے ملنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

رضا جو ہمیشہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہا جس کے اردگرد خوبصورت' ماڈرن' تعلیم یافتہ لڑکیاں رہتیں۔ وہ اُس انجان' سہمی ڈری سیاہ برقعے میں لپٹی لڑکی کو اللہ سے تہجد کی نمازوں میں مانگتا۔

اور جب مالک برحق پہلے آسمان پر موجود پکارتا ہے مانگو...... میں دوں گا...... اُس نے رضا سجدہ میں گرا اللہ سے اُس کو مانگتا جس کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن اللہ تو جانتا تھا۔

☆......☆......☆

''نہیں ...... بخدا میری بچی...... تو قرآن پڑھانے جاتی ہے۔'' رشیدہ کی باتیں سن کر رقیہ بیگم رو ہی تو پڑیں۔

''ارے ہاں...... ملانی جی...... میں جانتی ہوں' آپ عزت دار لوگ ہو بس یہ تو خالہ زبیدہ کی عادت ہے نا...... رائی کا پہاڑ بنانے کی......'' رشیدہ نے من وعن ساری کہانی رقیہ بیگم کو سنانے کے بعد خوشامدی لہجے میں کہا۔

رقیہ بیگم خاموش رہیں۔ لیکن آنسو اُن کی آنکھوں سے نکل کر اُن کے سینے میں منہ چھپا کر دھاڑیں مارنے لگے۔

جب سہنے والا خاموش ہو جائے اور پلٹ کر بدلہ نہ لے تو اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ پھر اُس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لیتا ہے اور اللہ کا بدلہ......''

☆......☆......☆

''اللہ تمہاری اماں کو خوش رکھے۔ بہت ہی مواقع فراہم کرتی ہیں۔'' خرم نے روبی کو اپنے قریب کرتے ہوئے لوفرانہ انداز میں کہا۔

''خیر اُن کو تو پتہ نہیں کہ تم اُن کے جاتے ہی آ جاتے ہو۔'' روبی نے خرم کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے لہجے میں حد درجہ معصومیت لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تو ظاہر ہے' مفت کا مال سمیٹنے کے لیے میری نظریں لگی رہتی ہیں۔'' خرم دل میں ہنسا۔

''سب باتیں چھوڑو...... یہ بتاؤ تم اپنی اماں کو کب بلا رہے ہو۔'' روبی نے سینکڑوں بار کیا ہوا سوال پھر دہرایا۔

''یار...... بلالوں گا' جلدی کس بات کی ہے ذرا میری نوکری تو پکی ہونے دو......'' خرم نے ہمیشہ کی طرح ٹالا۔

''پتہ نہیں تمہاری نوکری کب پکی ہوگی اتنا تو کماتے ہو۔'' روبی جھنجلائی

''اور جو اماں نے میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیا تو......''

''اونہہ...... تمہارا رشتہ ناک پکوڑا' منہ چوڑا' ایک بار دیکھ کر بندے کو دوبارہ دیکھنے کو دل نہ چاہے...... اُس پر کریکٹر...... ڈرامہ باز......'' خرم دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔

"ارے میری جان' میری چاند سی گڑیا' اماں کی فکر چھوڑو۔ اماں بھی آ ہی جائیں گی بلکہ آج تو میرا موڈ ہے تم کو ہی اماں بنادوں۔" خرم کی بازوؤں کی سخت گرفت محبت میں چور' جذبات میں جھومتی روبی کو پھولوں کا ہار لگی۔

☆......☆......☆

"ارے قسم کھاتی ہوں غفورے جو جھوٹ ہو تو' جوتوں کا ہار ڈالنا میرے گلے میں' روز آتی ہے مولوی کی بیٹی لمبی سی گاڑی میں اور یہ گاڑی والے' ایسے ہی کسی کو نہیں بٹھاتے گاڑی میں' بس میں بیٹھو تو بس والا بھی کرایہ مانگتا ہے اور یہ بڑی بڑی گاڑیوں والے اپنی گاڑی میں مفت میں بٹھالینگے' ارے عقل کی باتیں کر بھائی عقل کی...... خالہ زبیدہ نے دال چاول تولتے غفورے سے کہا۔

سارا محلہ' چاہے وہ گھر میں بیٹھی عورتیں ہوں' یا دکان سجائے مرد' خالہ زبیدہ جہاں جاتیں کسی نہ کسی کے گھر کو لے کر' باتیں شروع کر دیتیں' وہ ہمیشہ خالی گلاس دکھاتیں اور مولوی صاحب کے گھرانے سے تو اُن کی ازل سے دشمنی تھی۔

عبداللہ (مولوی صاحب) اور زبیدہ نے سارا بچپن ساتھ کھیلا تھا' اور پھر مدرسے میں قرآن بھی ساتھ پڑھا تھا۔

زبیدہ کو عبداللہ ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا منہ پھٹ اور بے باک وہ ہمیشہ سے تھی' محلے کے لڑکوں سے چکر چلانا' تحفے تحائف لینا اُس کا معمول تھا' لیکن عبداللہ کو وہ سچے دل سے چاہتی تھیں وہ جانتی تھیں کہ عبداللہ اُس کو نظر اُٹھا کر کبھی نہیں دیکھتا' تو رشتہ کیا بھیجے گا' سو وہ اپنی اماں کے پیچھے لگ گئی کہ وہ اُس کے رشتے کی بات عبداللہ سے چلائیں اور پھر زبیدہ کی ماں نے محلے کی ایک سمجھدار عورت کے ذریعے اپنی خواہش عبداللہ کی والدہ تک پہنچائی۔

"ہم سید ذات ہیں جدی پشتی امامت کرتے آرہے ہیں۔ زبیدہ جیسی لڑکی ہمارے گھرانے کے لیے موزوں نہیں' میرے بیٹے کے لیے ایک بہت باکردار اور پاکیزہ لڑکی میں نے پسند کررکھی ہے اور وہیں ہم اُس کی شادی کریں گے۔" مولوی صاحب کی والدہ کا جواب آج بھی جب خالہ زبیدہ کو یاد آتا تو اُس کو لگتا جیسے تھپڑ اُس کے چہرے پر اپنے نشان چھوڑ گیا ہے۔

"کہاں کھو گئیں خالہ زبیدہ......" غفورے نے دال چاول کی تھیلی پکڑواتے ہوئے خالہ زبیدہ کو پکارا۔

"اور چھوڑو خالہ...... کیوں سارے محلے کی فکر میں گھل رہی ہو' بس اللہ سب کا پردہ رکھے۔"

"اونہہ اللہ پردہ رکھے...... مغرور لوگ...... اللہ اِن کے غرور کا منہ کچلے...... باکردار...... سید ذات...... نیک...... پاکیزہ...... انشاء اللہ' اللہ چوبارے پر ہنڈیا پھوڑے گا......" خالہ غفورے کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہی رہیں۔

☆......☆......☆

"غیبت وہ ہوتی ہے کہ کسی کی ایسی بات جو ہم اُس کے منہ پر کہیں تو اُسے برا لگے چاہے وہ صحیح ہو...... اور بہتان وہ ہوتا ہے کہ کسی میں وہ عیب نہ ہو اور ہم اُس کو بیان کریں۔ بہتان کی بہت سزا ہے۔ جو کسی پر بہتان لگاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس شخص کو اُس وقت تک موت نہیں دیتا۔ جب تک اُس پچھ نشین میں نہ لا کر کھڑا کرے جو وہ دوسروں کو کہتا پھرتا ہے۔ اور کبھی غور سے دیکھو تو پتہ چلے جب ہم کسی کی طرف ایک انگلی اٹھاتے ہیں تو تین انگلیاں خود بخود ہماری طرف ہو جاتی ہیں' ہم دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو بخوبی دیکھ لیتے ہیں لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر ہم کو نظر نہیں آتا۔"

''لیکن مس...... میری کلاس فیلو انعم بہت تیز ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے آتی ہے۔' صبا نے سنجیدگی سے سمجھاتی آمنہ کی بات کاٹی۔

''پھر تجسس، پھر غیبت' صبا میری گڑیا میں آپ کو کیا سمجھا رہی ہوں۔''

''وہ کون؟ کہاں سے آتی ہے؟ آپ کا کیا تعلق، تجسس نہیں کرنا...... تجسس کرنا' تو وہ لگانا کسی کے ایسے راز کو جاننے کی کوشش کرنا جس کو وہ چھپا رہا ہے گناہ ہے۔ روزِ حشر جب اللہ اپنے بندوں کا حساب کرے گا' اعمال نامہ کھولے جائیں گے تو اللہ اُس دن بھی راز داری رکھے گا۔ تم جانتی ہو اللہ پردے میں حساب کرے گا۔ وہ اپنے گناہگار بندوں کی عزت اُس وقت بھی رکھے گا۔ جب سارا عالم اُس کے طیش اور غضب سے لرز رہا ہوگا۔

اور ہم لوگ جب کسی کی اچھائی دیکھتے ہیں تو اُس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور جب کوئی خامی نظر آ جائے تو اُس کو اچھالتے ہیں۔ یہ غلط ہے بہت غلط......''

''ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ گناہ گاروں کی جتنی چاہے رسی دراز کر دے سرا اُسی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے وہ جب چاہے رسی کھینچ لیتا ہے۔''

''اور......''

رضا جو صبا کے لیے گفٹ لایا تھا اور نہ جانے کب سے کمرے سے باہر کھڑا صبا اور اُس کی مس کی باتیں سن رہا تھا' اور جب اُس کی نظر سیاہ دوپٹے میں لپٹے اُس چاند سے چہرہ پر پڑی تو اُس کا دل چاہا...... وہ ناچنے لگے...... اُس کو اپنا وجود چاند تاروں کے درمیان محسوس ہوا...... اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر خوشی کا ایک آنسو اُس کی دائیں آنکھ سے نکل کر...... اُس کے چہرے پر پھسلتا ہوا چلا گیا۔

☆......☆......☆

''ارے بس کیا بتاؤں تم کو...... سارے محلے پر عذاب آئے گا۔ سارے محلے پر تم دیکھ لینا......''

خالہ زبیدہ نے نسیمہ دائی کو پان کی گلوری دیتے ہوئے سرگوشی کی۔

نسیمہ دائی تھی...... اور اُس کی نظریں' کچن میں کام کرتی روبی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''کوئی رشتہ ہو تو بتاؤ میری بچی کے لیے......''

خالہ زبیدہ دائی نسیمہ کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

دائی نسیمہ رشتے بھی کرواتی تھیں۔ اس لیے خالہ زبیدہ اُس کی اچھی خاصی للو چپو کرتی تھیں۔

''اے ہے کیا ہوا؟ اِس قدر خاموش کیوں ہو'' خالہ زبیدہ نے دائی نسیمہ کے کندھے ہلائے۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔'' دائی نسیمہ کو اپنی طرف متوجہ کر کے خالہ زبیدہ پھر شروع ہوئیں۔

''مولوی صاحب خود تو مر گئے اور اِن ماں بیٹی نے چکلہ کھول لیا گھر میں روز بیٹی کالا برقع اوڑھ کر صبح ہی صبح نہ جانے کہاں نکل جاتی ہے۔ صبح جاتی بس میں ہے اور آتی لمبی سی کالی گاڑی میں ہے اور آج تو کئی گھنٹوں سے گاڑی دروازے سے لگی کھڑی ہے۔ آج تو میں رنگے ہاتھوں پکڑنے کے موڈ میں تھی میں تو گھر چلی جاتی وہ تو خیر سے تم آ گئیں...... میرا تو دل کہتا ہے کوئی بہت موٹی آسامی پھانس لی ہے لیکن بھئی یہ شریفوں کا محلّہ ہے' یہاں بہو بیٹیاں رہتی ہیں میں اِن کا دھندہ نہیں چلنے دوں گی۔'' خالہ زبیدہ پھنکارتے ہوئے بولیں۔

''سارے محلے کی خبر رکھتی ہو اور گھر سے بے خبر ہو...... تمہاری بیٹی کا کون سا مہینہ چل رہا ہے۔'' دائی

نسیمہ کا لہجہ خوفناک حد تک سرد تھا۔
''کیا مطلب پاگل تو نہیں ہوگئی ہو میری بچی کنواری ہے۔'' دائی نسیمہ کی کھوجتی آنکھوں اور سرد لہجے نے خالہ زبیدہ کو بوکھلا سا دیا۔
''میں جانتی ہوں تمہاری بیٹی بن بیاہی ہے لیکن میں یہ پوچھ رہی ہوں۔ اِس کا کون سا مہینہ چل رہا ہے۔'' دائی نسیمہ کے پُر یقین لہجے نے خالہ زبیدہ کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔

☆......☆......☆

''تھپڑ...... لاتیں...... گھونسے...... زبیدہ نے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔
''بتا کمبخت یہ کس کا گناہ ہے۔ مجھے اُس کا نام بتا۔'' مارتے مارتے خالہ زبیدہ ہانپنے لگیں تھیں۔
''بتا...... بتاتی کیوں نہیں......'' انہوں نے اُس کے بال پکڑ کر سر دیوار پر دے مارا۔
''اماں......'' پیٹ میں اُٹھتی درد کی لہر نے اُس کو ادھ موا کر دیا۔ تو اُس کے منہ سے کپکپاتا ہوا نکلا۔

☆......☆......☆

''تم کو میرا پتہ کس نے دیا۔''
''تم مجھ کو اندر تو آنے دو۔ اس طرح کیوں چیخ رہے ہو۔'' اپنے وجود کو چادر میں چھپائے اُس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِرد گرد دیکھتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔
''اندر آنے دوں...... تم کو...... کیوں؟'' خرم کا لہجہ اتنا اجنبی تھا کہ اُس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ اور وہ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اندر آ گئی۔
روبی کئی ماہ سے خرم کو کھوج رہی تھی، وہ جو اپنی اماں کو لینے گیا تھا تو کبھی پلٹ کر ہی نہیں آیا، اور ایک ایک کر کے اُس کے سارے ہی دوست چلے گئے۔ کوئی اتہ پتہ نشان کچھ نہیں چھوڑا...... فون بند......

پھر خرم کے ایک دوست نے اُس کی آہ و زاری اور اللہ رسول ﷺ کے واسطوں سے گھبرا کر اُس کو خرم کا پتہ بتا دیا کہ وہ کراچی کے ایک دوسرے علاقے میں رہ رہا ہے...... اور آج روبی کے سامنے وہ کھڑا تھا۔
''کیا بکواس کر رہی ہو، مجھے کیا پتہ یہ کس کا بچہ ہے؟'' خرم نے اُس کو دھتکارا۔
''خرم خدا کا خوف کرو، یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔ اتنے ظالم نہ بنو۔ اللہ کے واسطے میری عزت بچا لو۔ میری ماں مر جائے گی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ تم جانتے ہو...... میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور یہ تو ہماری محبت کا......''
''بکواس بند کرو...... محبت...... محبت تم جیسی لڑکیاں کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے؟ اور عزت...... عزت کس چڑیا کا نام ہے...... یہ بات تم پہلے سوچتیں...... ارے جب بغیر کسی رشتے کے تعلق کے، تم میرے ساتھ ساری حدیں پھلانگ سکتی ہو۔ تو مجھے یقین ہے نا میں پہلا ہوں اور نہ ہی آخری......''
''اور نہ جانے یہ کس کا گناہ جو تم پیٹ میں پال رہی ہو...... اُس کو میرے سر پر تھوپنے کی کوشش نہ کرو...... یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے...... اِس کو تم ختم کرو...... یا خود ختم ہو جاؤ...... چلو...... چلو دفع ہو...... اپنے گناہ سمیت باہر نکلو۔ زمانے بھر کے ساتھ عیاشی کر کے...... اب معصوم بنی کھڑی ہو۔'' خرم نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔
''مجھے تم سے بہت محبت ہے میری جان...... میں تم کو ایسا لگتا ہوں...... کہ تم کو دھوکا دوں گا...... ہائیں...... ارے میری جان جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی...... ہاں...... ہاں کہہ تو رہا ہوں اماں کو بھی لے کر آ جاؤں گا۔ بس میری جان...... اب منع مت کرنا خدا کی قسم تمہارے بغیر اب رہا نہیں

جاتا...... خرم کے بازوؤں کا گھیرا اُس کی کمر کے گرد تنگ ہو رہا تھا۔ تم اتنی نازک ہو دل چاہتا ہے اپنے سینے میں چھپالوں، تم کو گرم ہوا بھی نہ لگنے دوں۔ ''خرم کی گرم سانسیں اُس کو اپنی گردن پر محسوس ہوئیں۔

''کیا ہوا؟ دفع کیوں نہیں ہو رہیں...... اور یہ بھی سن لو اگر آئندہ میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو وہ ساری ویڈیوز جو تم بہت چہک چہک کر بہت شوق سے میرے ساتھ بنوائی تھیں وہ سب میں سوشل میڈیا پر ڈال دوں گا۔'' خرم کا سرد لہجہ روبی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

''اماں...... بہت درد ہو رہا ہے......'' وہ پیٹ پکڑ کر اوندھی ہوگئی۔

''نام بتا...... نام......'' خالہ زبیدہ نے اُس کی دوہری ہوتی کمر پر ایک لات مارتے ہوئے پھنکارتے لہجے میں پوچھا۔

''اماں نام بتاؤں گی...... تو اماں...... ہم کہیں کہ نہیں رہیں گے۔ اماں ہم کہیں کے نہیں رہیں گے......'' روبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اماں اُس نے میری ویڈیوز بنا رکھی ہیں۔ اماں...... اماں......'' وہ رو رہی تھی۔ اور خالہ زبیدہ ساکت آنکھیں لیے یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھیں۔ تین انگلیاں اُن کی طرف اٹھ چکی تھیں۔

☆......☆......☆

شہادت میں پڑی جگمگاتی ہیرے کی انگوٹھی کو اُس نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''بہن ہم جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی ایک قیمتی گوہر نایاب ہے...... ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔'' ہاشمی صاحب نے حیران بیٹھی رقیہ بیگم سے کہا۔

اتنا اعلیٰ خاندان کئی شوگر اور کپڑے کی ملیں۔ آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر، گڈ لکنگ ہینڈسم...... ایسا شاندار رشتہ یہ تو اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''آپ بہت بڑے لوگ ہیں ہماری آپ کی کیا برابری......''

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہم سب برابر ہیں۔ اور آپ جانتی ہیں کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں بجز تقویٰ کے...... الحمدللہ...... آمنہ ایک دیندار اور نیک لڑکی ہے۔ ایک ایسی لڑکی...... جس کے میرے گھر میں آنے سے ہماری نسلیں سنور جائیں گی۔ ویسے بھی لڑکی کا انتخاب جن چار باتوں پر کرنا چاہیے اُس میں دینداری کو فوقیت ہے اور الحمدللہ میرے بیٹے کی خواہش ایک دیندار لڑکی تھی۔''

''دیکھیے آپ منع مت کیجیے گا...... پلیز...... ہم بڑی آس سے آئے ہیں۔'' ہما بیگم نے قیمتی انگوٹھیوں سے سجے ہاتھوں سے رقیہ بیگم کے سادے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''یا اللہ تو کتنا رحمٰن ہے...... میں تیرا کیسے شکر ادا کروں......'' رقیہ بیگم کی آنکھ سے بہتا خوشی کا آنسو، ہما بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔

☆......☆......☆

''آپ میرے لیے اس روئے زمین پر اللہ کا انعام ہیں۔'' رضا کی سرگوشی یاد آئی تو اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اُس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا تو زیور سے لدی...... پھولوں سے مہکتی سرخ عروسی جوڑے میں، رضا کے پہلو میں بیٹھی آمنہ نظر آئی...... جو بہت آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

''قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔'' رضا کا اسپتال انگلینڈ میں تیار ہوگیا تھا اُس کا Inogration ہونا تھا۔ رضا، آمنہ کو ساتھ لے

جانا چاہتے تھے۔ لہٰذا آج چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں آمنہ اور رضا کا نکاح ہوا تھا' تا کہ پیپرز تیار ہو سکیں۔ مہمان جا چکے تھے آدھی رات بیت چکی تھی۔ نیند آمنہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

زندگی یوں بھی بدلتی ہے وہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ قیمتی زیورات' ملبوسات' قابل گڈ لکنگ ڈاکٹر رضا خاندانی شرافت دین اور دنیا' ہر چیز تو اللہ نے اُس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ رضا کا وجود' اُس کی مسکراہٹ اُس کی وارفتگی' اُس کو سونے نہیں دے رہی تھیں۔ رقیہ بیگم شکرانے کے نفل پڑھ کر کھڑی ہی ہوئی تھیں کہ گلی میں مچتے شور نے اُن کو چونکا دیا۔

''الٰہی خیر......'' رقیہ بیگم نے گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھا اور دروازے کی طرف بڑھیں۔

☆......☆......☆

''اوئے کیمرے کی طرف دیکھ۔''

''خواتین و حضرات دیکھیے یہ ہے وہ سفاک عورت جو اِس ننھی سی جان کو...... کچرہ کنڈی میں پھینک رہی تھی۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ آپ کا کون ہے؟'' منہ مت چھپائیں گناہ کرتے ہوئے آپ لوگ منہ نہیں چھپاتے اور جب گناہ چھپانا مشکل ہو جائے تو کچرہ کنڈی میں کتوں کے آگے پھینک جاتے ہیں۔''

''میں اربابِ اعلیٰ سے گزارش کروں گی کہ اِس سفاک بڑھیا اور اُس کی بیٹی کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔''

وہ کوئی ٹی وی اینکر تھی جو اپنے چینل کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے اُس بوڑھی عورت کے منہ پر سے بار بار دوپٹہ ہٹا کر اُس کا چہرہ کیمرے کے سامنے کر رہی تھی۔

''شریفوں کے محلے میں زنا کاری...... محلے کے کسی فرد نے کانوں کو چھوا۔''

خالہ زبیدہ دوپٹے میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اخباری رپورٹر دروازہ کھول کر بستر پر نڈھال لیٹی روبی کی تصویریں لے رہے تھے۔

''بدنامی...... ذلت...... لعنت' ملامت' عیب کا لک کیا تھا جو خالہ زبیدہ کے منہ پر نہیں ملا گیا تھا۔ پولیس کی گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے خالہ زبیدہ نے ایک نظر محلے کے گھروں کے باہر کھڑے مردوں' دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانکتی عورتوں کو دیکھا س اور پھر غیر ارادری طور پر اُن کی نظر مولوی صاحب کے گھر کے بند دروازے پر پڑی۔ تو پتہ نہیں کیوں وہ بلک بلک کر رو دیں۔

''کیا ہوا اماں۔'' صحن میں خاموش کھڑی رقیہ بیگم سے آمنہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹا...... بس اللہ کسی کا پردہ نہ کھولے۔'' جب کہنے والا کہہ کر اور سہنے والا سہہ کر خاموش ہو جاتا ہے تو پھر معاملہ اللہ کی عدالت میں چلا جاتا ہے' اور جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے تو وہ بے انصافی نہیں کرتا' اللہ گناہ گاروں کی رسی دراز تو کر دیتا ہے لیکن رسی کا سرا اپنے ہی ہاتھوں میں رکھتا ہے' جب مناسب سمجھتا ہے رسی کھینچ لیتا ہے بس اللہ کسی کی رسی نہ کھینچے۔'' رقیہ بیگم نے آہستگی سے کہا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' آمنہ حیران تھی' محلے میں مچا شور آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

''بس بیٹا...... دوسروں کی طرف انگلی اٹھانے والوں کی طرف تین انگلیاں اٹھ گئیں۔''

رقیہ بیگم نے آہستگی سے کہا اور پھر دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی کہ استغفار کے نفل پڑھ کر اُن کو خالہ زبیدہ کے حق میں دعا کرنی تھی۔

☆......☆......☆

مِنی ناول

نسرین اختر نینا

سپنے سہانے

''مجھے تو ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ میرا دماغ کیوں اُلٹ گیا جو میں نے تم جیسی عام سی لڑکی سے نا صرف اتنے سالوں تک دوستی برقرار رکھی بلکہ اپنی اچھی خاصی بیوی کو چھوڑ کر کنگال ہو کر تم سے شادی کا فیصلہ کر بیٹھا۔'' حارث نے اپنی بات مکمل کی اور پھر......

معاشرے کے اُتار چڑھاؤ سے جڑا ایک بہت خاص ناول **آخری حصہ**

☆......☆......☆

سعدیہ بیگم پارلر میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ آج وہ بڑے دنوں بعد کچھ دیر کے لیے آئی تھیں۔ کیونکہ گزشتہ کچھ دنوں سے اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

اور ویسے بھی اُن کی دلچسپی بھی آہستہ آہستہ اس کام میں کم ہو رہی تھی۔ ایک تو صحت اجازت نہیں دیتی تھی دوسرے سامیہ کی وجہ سے وہ مختلف قسم کے اندیشوں میں غلطاں رہتی تھیں۔

شوہر کا رویہ بھی اُن کے ساتھ بہت تلخ ہو چکا تھا وہ ہر وقت انہیں الزام دیتے تھے کہ انہوں نے بچیوں کی تربیت اچھی نہیں کی۔

سعدیہ بیگم پارلر میں اپنی سیٹ پر بیٹھی اسی طرح کے خیالات کے تانے بانے بن رہی تھیں کہ اچانک پارلر کا دروازہ کھلا اور حرا اندر داخل ہوئی۔ اتنے عرصے بعد سعدیہ بیگم نے اُسے دیکھا تھا پہلے تو چند لمحوں کے لیے وہ اُسے پہچان ہی نا سکیں۔

''السلام علیکم آنٹی جی کیسی ہیں آپ، پہچانا مجھے میں حرا ہوں سامیہ کی دوست'' تو فوراً ہی سعدیہ بیگم سامیہ کی اس پیاری سی گڑیا جیسی سب سے زیادہ گہری بچپن کی دوست کو پہچان گئیں۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئیں اور حرا کو گلے سے لگاتے ہوئے بولیں۔ وعلیکم السلام ...... کیسی ہو حرا بیٹی میں بھلا تمہیں کیوں نا پہچانوں گی۔ تم تو میرے لیے سامیہ جیسی ہی ہو۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ البتہ آپ کچھ کمزور لگ رہی ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے، نا آپ کی۔'' حرا نے ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ بس بی پی اکثر ہائی رہتا ہے۔ شوگر کا پرابلم بھی ہو گیا ہے۔ دوائیاں کھانے اور پرہیز کرنے کے باوجود کنٹرول نہیں ہوتا۔'' سعدیہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، آنٹی...... مگر آپ اپنا خیال رکھا کیجیے۔ آپ کے بچوں کو بھی آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ میں کافی دنوں سے آپ سے ملنے کا سوچ رہی تھی۔ عرصہ ہی ہوا ملاقات کو آپ تو مجھے بہت ہی یاد آ رہی ہیں۔ آج سوچا کہ آپ سے مل ہی آؤں۔ تو بیٹا تم گھر آتیں نا۔ جب سے سامیہ گئی ہے اُس کی فرینڈز نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ پہلے ہمارے گھر میں ہر وقت اُس کی دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا

تھا۔'' سعدیہ بیگم نے گہری سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔

''دیکھیے نا آنٹی جس گھر کے دروازے حقیقی بیٹی پر بند ہو جائیں تو وہاں اُس کی فرینڈز کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی تو سوچیے آپ۔'' حرا نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی...... مگر اس کے پاپا کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سارا قصور سامیہ کا ہے۔''

حرا نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے شوہر کو سامیہ کو گھر میں آنے کی اجازت دینے پر آمادہ کریں گی۔ حرا کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک سعدیہ بیگم سامیہ کو یاد کر کے روتی رہیں۔

☆......☆......☆

''کیا ہوا؟ ملاقات ہوئی سامیہ کی امی سے؟ کیا کہا انہوں نے؟'' جب حرا سعدیہ بیگم سے مل کر گھر واپس آئی تو عدیل جو کہ لان ہی میں چہل قدمی کرتے ہوئے بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا حرا کو دیکھ کر تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے۔ حرا اُس کی اس قدر بے قراری دیکھ کر قدرے متحیر تو ہوئی مگر اُس نے اپنے رویے سے اُس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ لان چیئر پر بیٹھ کر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''سعدیہ آنٹی بے چاری تو بیٹی کی جدائی کے غم میں خود بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ کافی کمزور لگ رہی تھیں۔''

یہ سن کر عدیل کچھ دیر تک گہری سوچ میں مستغرق رہا اور پھر حرا سے کہنے لگا۔

''حرا تم یوں کرو کہ سامیہ کو فون کر کے گھر بلا لو۔ آج ویسے بھی ویک اینڈ ہے۔ وہ دورا تیں یہیں رہے تو ہم سب مل کر اُسے سمجھاتے ہیں۔ ایاز اور صوفیہ کے علاوہ انکل آنٹی سے بھی کہیں گے کہ اُسے کسی طرح اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے والد سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو جائے۔ شاید اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے۔''

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔'' حرا نے قدرے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کس بات کی؟'' عدیل نے چونک کر پوچھا۔

''یہ آپ سامیہ کے معاملے میں اس قدر انٹرسٹ کیوں لے رہے ہیں آپ سے کیا تعلق اُس کا؟'' حرا نے گہری نظروں سے عدیل کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی وہ تمہاری دوست ہے۔ اس لیے میری بھی دوست ہوئی پھر اتنے عرصے سے اُس سے ملنا جلنا ہے۔ تو ظاہر ہے اُس کی مدد کرنی چاہیے۔ اور کیا بات ہو سکتی ہے؟'' عدیل نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں؟'' حرا نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ایک اور وجہ بھی ہے؟'' عدیل نے کہا۔

''وہ کیا؟'' حرا نے اپنی دل کی بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکن پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے اس ساری سچویشن سے دوچار ہونے کی کچھ ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔''

''خیر چھوڑو یہ سب شکی انسان کا کوئی علاج نہیں تم ایسا کرو کہ...... سامیہ کو فون کر کے گھر بلا لو نا۔ کہیں وہ کسی اور کام میں نا مصروف ہو جائے۔'' عدیل نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ تو ناچار حرا نے اپنے ہینڈ بیگ سے موبائل نکالا اور سامیہ کا سیل نمبر پش کرنے لگی۔

''ہیلو......'' دوسری طرف بیل ہونے پر حرا نے کہا۔

''سامیہ آج ویک اینڈ ہے۔ اگر تم فری ہو تو یہاں آ جاؤ' عدیل بھی آئے ہوئے ہیں انجوائے کریں گے۔'' حرا نے سامیہ کے کال ریسیو کرنے پر کہا۔

''کیا...... شاپنگ پر جا رہی ہو؟''

''نہیں شاپنگ ہم کل مل کر کر لیں گے بس تم یہاں آ جاؤ تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے سامیہ نے کہا کہ وہ آ رہی ہے۔ تو حرا بولی۔

''تم خود آ جاؤ گی کہ ہم لینے آ جائیں۔''

''او کے بائے...... جلدی آ جاؤ نا۔'' یہ کہہ کر حرا نے کال منقطع کر دی۔

☆......☆......☆

''شکریہ حرا جو تم نے امی سے میرے مسئلے کے

بارے میں خود جا کر اس قدر تفصیل سے بات کی۔ اب یقیناً امی ضرور پاپا کو قائل کرلیں گی۔'' سامیہ نے حرا سے کہا۔

''نہیں یار اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ دوست تو وہی ہوتا ہے۔ جو مشکل میں کام آئے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تمہاری مدد کریں۔'' حرا نے اپنے لیے چائے بناتے ہوئے کہا۔ لیکن سامیہ اب تمہیں بھی اس سلسلے میں لچک کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ تمہاری امی کی تمہاری وجہ سے صحت خاصی گر چکی ہے۔ وہ ہر وقت تمہیں یاد کرتی ہیں بھئی کم از کم اپنی ماں اور بہنوں سے تو مل لیا کرو۔ اس قدر بھی سنگدلی کا مظاہرہ کم از کم میں تم سے ایکسپیکٹ نہیں کر سکتا تھا۔'' عدیل نے ایک سموسہ اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں عدیل واقعی میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔''

''بس اب تم پہلی فرصت میں پہلے اپنی امی سے رابطہ کرو۔ اگر تم کہو تو میں انہیں کل یہاں بلوا لیتی ہوں۔'' حرا نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ یہاں گھر کے ماحول میں زیادہ اچھی طرح بات ہو سکے گی۔ پارلر میں تو کسٹمرز بھی آتی رہتی ہیں ورکر لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔'' عدیل نے ٹشو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

حرا نے سعدیہ بیگم سے فون پر بات کی اور انہیں کہا کہ وہ ہانیہ اور سمعیہ کے ہمراہ کل دوپہر کے کھانے پر اُس کے گھر آجائیں۔ اس طرح گیٹ ٹوگیدر بھی ہو جائے گا اور مل کر سامیہ کے مسئلے کا کوئی مناسب حل بھی تلاش کرلیا جائے گا۔ دوسری طرف سے سعدیہ بیگم نے بخوشی حامی بھر لی۔ تو سامیہ فرطِ مسرت سے حرا کے گلے لگ گئی۔ اور عدیل خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُسے تکنے لگا۔ اُس کے اس طرح مسلسل دیکھنے سے جہاں ایک طرف سامیہ نروس ہوگئی۔ دوسری طرف حرا کچھ چونک سی گئی اور اُس کے چہرے پر ایک سایہ سا رینگ گیا۔

عالی کی لاہور ٹرانسفر ہوگئی اور اُس کے لاہور شفٹ ہونے کے دو ہفتے بعد پنکی نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ بچی اگرچہ کافی کمزور سی تھی۔ کیونکہ پنکی اپنی ذہنی الجھنوں کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی تھی۔ جس کا اثر لازماً بچی پر پڑتا تھا۔ ڈاکٹرز نے دو ہفتے تک بچی کو انکوبیٹر میں رکھا تو پھر وہ اس قابل ہو سکی کہ اُسے گھر لایا جا سکے۔ پنکی خود بھی خاصی کمزور تھی۔

ننھی منی سی بچی خاصی خوبصورت تھی۔ اُس نے رنگ روپ اور نین نقش باپ کے چرائے تھے۔ دانیال کے اگرچہ نقوش باپ جیسے تھے۔ مگر اُس کا رنگ ماں پر گیا تھا۔ گہرا سانولا...... مگر بچی تو باپ کا پرتو تھی۔ اتنی پیاری سی گڑیا جیسی بیٹی پا کر عالی بے حد مسرور تھا۔

اُس نے پنکی سے متعلق اپنے دل میں پیدا ہونے والی منفی احساسات کا گلہ گھونٹ دیا تھا۔ اور اب سوچ لیا تھا کہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے اب اُس کے بچوں کی ماں ہے اور وہ اُس کی تنک مزاجی اور بدزبانی کے باوجود ہر صورت میں اُس سے نبھاہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے اُس نے پنکی کی خواہش کے مطابق اُس کے والدین کے گھر کے قریب ہی ایک کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔

گھر کی رینوویشن اور نئے فرنیچر وغیرہ پر عالی کی ساری جمع پونجی خرچ ہوگئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھا کہ اُس کی فیملی مکمل ہوگئی ہے۔ دو مہینے تک ماں کے گھر میں آرام کرنے کے بعد پنکی مکمل طور پر صحت یاب ہوگئی تو پھر وہ اپنے نئے سجے سجائے گھر میں فخر سے داخل ہوئی تھی۔ اور عالی کی اس قدر محبت اور لگن پر اُس کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا تھا۔

''شکریہ مائی ڈیئر عالی...... تم نے مجھے بہت خوبصورت تحفہ دیا ہے۔'' سارے گھر کو دیکھ کر پنکی نے خوشی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا ہے کہ تم نے اس قدر تکلیف سہہ کر اس قدر پیاری گڑیا کا انمول تحفہ مجھے دیا ہے۔'' عالی نے پنکی کو اپنے ساتھ لگا کر پیار بھرے لہجے میں کہا تو پنکی نے اپنا گھنے بالوں والا سر عالی کے کندھے پر رکھ کر سکون اور طمانیت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''کافی دن سے عالی بیٹے نے چکر نہیں لگایا۔'' مبارک احمد نے گھر میں داخل ہو کر عفیرہ بیگم سے کہا۔

''ہاں اُس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کسی دن پنکی اور بچوں کے ساتھ چکر لگائے گا۔''

''اور ہاں عالی کے ابا شہاب بیٹے کا فون آیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ وہ اگلے ماہ پاکستان آ رہا ہے۔ اور اُس نے ایک بہتر علاقے میں دس مرلے کے ڈبل اسٹوری گھر کی اپنے ایک دوست پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے بکنگ کروالی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی وہ آئے گا تو ہم نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔'' عفیرہ بیگم نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

''شکر ہے میرے مالک کا اتنے عرصے بعد اُس نے دوبارہ اپنی چھت عطا کی۔'' مبارک احمد نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''اور ہاں وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ صباحت کو ایم اے میں داخلہ دلوادیں۔ ابھی تین سال تک اُس کی شادی کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے جو وہ مناسب سمجھے کرے۔ اُس کی یہ سوچ اچھی ہے کہ اپنا گھر پہلے ہونا چاہیے۔'' اللہ کا شکر ہے کہ میرا ایک بیٹا تو ایسا سعادت مند ثابت ہوا کہ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے۔''

''امی عالی بھائی نے گڑیا کا نام کیا رکھا ہے؟'' اچانک صباحت نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''پتہ نہیں اُس نے نہیں بتایا بس وہ جب بھی فون کرتا ہے گڑیا ہی کہہ کر اُس کا ذکر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے ابھی اُس کا نام نہ رکھا ہو۔''

''عالی کی ماں اب عالی کا فون آئے تو بچی کا نام بھی پوچھ لینا اور اس سے کہنا وقت نکال کر گھر کا چکر بھی لگالے کافی دن ہو گئے ہیں۔'' مبارک احمد یہ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

''پنکی، گڑیا، دانیال اور اپنے لیے کل شام کو ضروری شاپنگ کر لینا۔ پھر اس سنڈے کو گڑیا کی پیدائش کے سلسلے میں فنکشن کریں گے۔ میں نے آفس سے لون لے لیا ہے۔ میرا خیال ہے، آواری میں چھوٹے ہال کی بکنگ کروالیں گے۔ زیادہ سے زیادہ سو مہمان ہی ہوں گے۔ غیر متعلقہ لوگوں کو انوائٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' عالی نے نہایت تفصیل سے پنکی کو فنکشن کے بارے میں بتایا۔

''ٹھیک ہے جو آپ مناسب سمجھیں ویسے پاپا کہہ رہے تھے کہ اُن کا چونکہ وسیع و عریض لان ہے۔ وہاں زیادہ مہمانوں کی گنجائش بھی ہوگی اور سستا بھی رہے گا۔'' پنکی نے حسبِ عادت عالی کے بنائے ہوئے پروگرام میں اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''سنو پنکی یہ بات ہم لوگوں کے درمیان طے ہو چکی ہے کہ آئندہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی ایسی بات نہیں کرے گا جس سے آپس کے اختلافات بڑھ جائیں۔'' ایک لمحے کے لیے تو پنکی کے چہرے پر خفگی کی شکنیں نمودار ہو گئیں مگر پھر کچھ سوچ کر اپنا موڈ تبدیل کرتے ہوئے بولی۔

''او کے باس جو آپ کی مرضی وہی ہماری بھی مرضی۔ کیوں میری پیاری گڑیا......'' پنکی نے پاس ہی اپنی کاٹ میں لیٹی انگوٹھا چوستی گڑیا کو دیکھ کر کہا۔

''ارے بھئی اس کا اصل نام لیا کرو کیا تم لوگوں نے ہر وقت اس کو گڑیا گڑیا کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر رکھا ہے۔ اس طرح تو اس کا یہی نام پڑ جائے گا۔'' پنکی کی امی نے کچن سے نکل کر کہا۔

''او...... ہاں عالی اب ہم گڑیا میرا مطلب ہے کہ عائشم کو اس کے اپنے نام سے پکارتا ہے۔ پاپا نے اتنے شوق سے اس کا اس قدر پیارا نام رکھا ہے۔'' پنکی نے اترا کر کہا تو کچھ دیر کے لیے عالی خاموش سا ہو گیا۔

☆......☆......☆

صباحت کا منگیتر ایک سنجیدہ سا سلجھا ہوا نوجوان تھا اگرچہ وہ اُس کے گھر کے اوپر کے پورشن میں رہتی تھی۔ مگر اس کے باوجود اُس نے کبھی بھی یہ کوشش نہیں کی کہ بہانے بہانے سے صباحت سے ملنے یا اُس کی ایک جھلک دیکھنے یا اُس سے باتیں کرنے کی غرض سے اُس کے گھر کے چکر لگاتا رہے۔ وہ لوگ بہت شریف اور مذہبی رجحان رکھتے تھے۔

دوسری طرف صباحت بھی بہت سادہ مزاج اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ صباحت اپنے منگیتر سے پردہ تو نہیں کرتی تھی۔ اگر کبھی اپنی ماں کے ساتھ بازار یا محلے میں کسی کے ہاں آتے جاتے اُس سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو جاتی۔ جب تک ماں اُس سے حال احوال پوچھنے میں مصروف ہوتی اور وہ بھی عام چھچھورے لڑکوں کی طرح نا اُسے گھور گھور کر دیکھتا نا اُس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ذومعنی باتیں کرتا۔

☆......☆......☆

عالی کی بیٹی کی پیدائش کے سلسلے میں فنکشن بڑا کامیاب رہا۔ تقریباً سبھی قریبی رشتے دار اور دوست احباب مدعو کیے گئے تھے۔ عالی کے والدین اور صباحت کے ساتھ صباحت کے ہونے والے ساس سسر اور سعدیہ بیگم اور عظیم صاحب بھی بطورِ خاص آئے تھے۔ سبھی لوگوں نے بے حد خوبصورت اور قیمتی تحائف پنکی اور بچی کو دیے تھے۔ بہت سے لوگوں نے لفافوں میں بند کر کے نقدی بھی دی تھی۔

پنکی بوتیک سے لیے گئے سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کیونکہ ایک مہنگے اور معروف پارلر سے میک اپ اور فیشل اور فیس پالشنگ کروائی گئی تھی۔ پھر ڈریس کا کلر اور اسٹیچنگ بھی بہت اچھی تھی۔ ننھی منی عائشہ گلابی جھالروں والے فراک میں گڑیا ہی لگ رہی تھی۔ وہ بڑے مزے سے اس بات سے بے خبر کہ اُس کے اعزاز میں اتنا شاندار فنکشن منعقد کیا گیا ہے۔ اپنی آپا کی گود میں سو رہی تھی۔

''کتنے اچھے لوگ ہیں جو بیٹی کی پیدائش کا جشن منا رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے معاشرے میں تو بیٹی کی پیدائش کا سن کر لوگوں کے منہ اتر جاتے ہیں۔'' صباحت کی ساس رقیہ بیگم نے سعدیہ بیگم سے کہا۔

''وقت وقت کی بات ہے تھوڑے سے بچے ہوتے ہیں ان بڑے لوگوں کے اس لیے بیٹا ہو یا بیٹی ہر ایک کی پیدائش اُن کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے۔'' سعدیہ بیگم نے کہا۔

''آپ لوگ یہاں بیٹھی ہیں۔ آئیے پنکی اور عالی سے ملیے اور بچی کو بھی دیکھ لیجیے۔'' عفیرہ بیگم نے رقیہ بیگم اور سعدیہ بیگم کے پاس آ کر کہا۔ تو وہ دونوں جھجکتی ہوئی تحفوں کے پیکٹ اٹھا کر عفیرہ بیگم کے ہمراہ اسٹیج پر چلی گئیں۔

''پنکی بیٹے یہ صباحت بٹی کی ساس امی ہیں مسز رقیہ ضمیر اور یہ شہباب بیٹے کی ساس امی مسز سعدیہ عظیم ہیں۔'' عفیرہ بیگم نے تعارف کروایا تو پنکی نے کھڑے ہو کر اُن کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں نے پنکی کو گلے لگا کر اُس کی پیشانی پر پیار کیا۔ اس دوران عالی بھی اسٹیج پر آ گیا۔ اُس نے بھی دونوں خواتین کو سلام کیا اور انہوں نے اُسے بھی بچی کی پیدائش کی مبارکباد دی۔ پھر دانیال جو سنہری شیروانی میں ننھا منا سا شہزادہ لگ رہا تھا کو پیار کیا اور اُسے بھی ہزار ہزار روپے دیے۔

''یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں آنٹی جی' جب آپ نے بچی کو تحفے دے دیے ہیں تو پھر دانی کو اتنے زیادہ پیسے دینے کی کیا ضرورت تھی۔'' پنکی نے سعدیہ بیگم اور رقیہ بیگم سے بڑے اخلاق سے کہا۔

''نہیں بیٹی اس میں زیادتی کی کیا بات ہے۔ بچے کو ہم پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں تو اس کا بھی حق تو بنتا ہے نا کہ کچھ نا کچھ اسے بھی دیا جائے' کیوں دانیال بیٹا۔'' سعدیہ بیگم نے دانیال کو گود میں اُٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

مبارک احمد ضمیر صاحب اور عظیم صاحب کو بھی اسٹیج پر بلا کر لے آئے۔ انہوں نے بھی پنکی اور عالی کو مبارکباد دی اور بچوں کو پیار کیا۔ عالی اور پنکی نے اُن کا شکریہ ادا کیا پھر اسٹیج سے نیچے جا کر عالی نے ان لوگوں کو اپنے ساس سسر اور سالوں سے بھی ملوایا۔ وہ بے حد تپاک سے اُن سے ملے جب سارے مہمانوں نے تحفے دینے اور مبارکباد دینے کی رسم ادا کر دی تو پھر کھانے کا دور چلا بے حد لذیذ اور بہت سی ورائٹی کے کھانے تھے۔ ہر شخص کی پسند اور ذوق کے مطابق سب نے خوب انجوائے کیا اور رات گئے یہ خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

عالی کی منگنی سے لے کر دانیال کے عقیقے تک ہر فنکشن میں کوئی نا کوئی گڑبڑ یا بدمزگی ہو جاتی تھی۔ یہ

واحد فنکشن تھا۔ جو اس قدر اچھے طریقے سے منعقد ہوا۔ اس میں کسی قسم کی شکر رنجی نہ ہوئی اور عالی کے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اُس کے والدین، بہن اور بھائی اور بہن کے سسرال والوں نے بھی بڑے اچھے طریقے سے تقریب میں شرکت کی۔ اور خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔

☆......☆......☆

صدیق حارث اور انیلہ کی با قاعدہ شادی پر رضا مند نہیں ہو رہا تھا۔ مگر پھر ماں اور باپ اور بھائیوں کے سمجھانے پر مان تو گیا تھا۔ مگر اُس نے یہ شرط عائد کی کہ وہ اپنے گھر والوں کو با قاعدہ رشتہ مانگنے کے لیے بھیجے۔ اس پر حارث کا بڑا بھائی بھابی اور بڑی بہن اور بہنوئی آئے تھے۔

انہیں حارث کی پسند اور انتخاب پہ خاصا شاک ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پہلی دو بیویوں کی طرح اب بھی اُس نے کسی بڑے گھر کی لڑکی کو ہی منتخب کیا تھا۔ مگر صدیق کے رویے اُس کے ڈربہ نما گھر، پسماندہ علاقہ اور پھر انیلہ کی اور حارث کی عمروں کا اتنا زیادہ فرق، پھر انیلہ زیادہ تعلیم یافتہ اور کلچرڈ بھی نہ تھی۔ جبکہ اُن کا خیال تھا کہ حارث نے کوئی تو خوبی دیکھتی ہوئی تھی اپنی اتنی پڑھی لکھی اور اچھے خاندان کی بیوی کو طلاق دی ہے انیلہ میں سوائے خوبصورتی اور کم عمری کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔

صدیق نے بڑی رعونیت سے اُن کے سامنے اپنی لمبی چوڑی شرطیں رکھیں کہ لڑکی کا کم از کم تین لاکھ حق مہر ہوگا۔ اُس کے نام پر گھر گاڑی اور بینک بیلنس بھی ہو۔ اور ماہانہ کم از کم دس ہزار روپے اُس کو جیب خرچ دیا جائے تو وہ رشتہ طے کرے گا۔ ورنہ اُس کی طرف سے صاف انکار ہے۔ جب حارث کو ان شرائط کا علم ہوا تو وہ غصے میں بھرا ہوا دوسرے دن ہی پہنچ گیا۔ اور اُس نے صدیق کو کھری کھری سنائیں کہ بڑے میاں منہ دھو رکھو۔ تمہاری بیٹی تو ویسے بھی میرے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے۔ اور تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی شرطیں منوانا چاہتے ہو۔'' یہ سن کر صدیق بھی چراغ پا ہو گیا اور اُس نے جواب میں اُسے گالیاں بکی

شروع کر دیں۔ دونوں کی تکرار اور لڑائی جھگڑے کی آوازیں سن کر پھر گھر کے سب افراد اکٹھا ہو گئے۔

بالآخر طے یہ پایا کہ حارث حق مہر کے پچاس ہزار صدیق کو ادا کرے گا اور شادی کا سارا خرچہ بھی خود اٹھائے گا۔

نکاح والے دن انیلہ کی نند کے ساتھ شہزادی بھی صبح سویرے ہی پارلر چلی گئی تھی۔ پھر جب وہ وہاں سے واپس آئیں تو تھوڑی دیر بعد ہی حارث بھی اپنے بھائی، بھابی، بہنوئی، اور قاری صاحب کے ہمراہ آ گیا۔

حارث نے سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی اور اونچی ہیل کے سیاہ شوز میں اُس کا قد قدرے لمبا لگ رہا تھا چہرے پر سہرا ڈالا ہوا تھا۔ اور گلے میں سنہری تلے والا ہار پہن رکھا تھا۔

صدیق اُس کے بڑے بھائی اور منجھلے چچا نے اُن لوگوں کا استقبال کیا۔ پہلے نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ پھر مہمانوں کی تواضع کولڈ ڈرنکس چائے اور مٹھائی وغیرہ سے کی گئی۔ رخصتی کے وقت صرف دادا، دادی اور شہزادی ہی انیلہ کے پاس تھے۔ چچا، تایا اور باپ نکاح کے فوراً بعد ہی غائب ہو گئے تھے۔ البتہ رخصتی سے چند لمحے قبل صغریٰ آئی اور انیلہ کو گلے لگا کر روتے ہوئے بولی۔

'' جاؤ بیٹی اللہ تمہارا نگہبان ہو اور تمہیں ہدایت نصیب ہو آج کے بعد تمہارے لیے تمہاری ماں، بہنیں اور بھائی مر گئے کبھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھنا ورنہ پتھر کی ہو جاؤ گی۔'' یہ کہہ کر وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے اشکوں کو پونچھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

دادی، دادا اور شہزادی نے اُسے ڈھیروں دعاؤں اور پیار کے ساتھ رخصت کیا اور انیلہ اپنے دل پر گرتے آنسوؤں کے ساتھ بابل کی دہلیز عبور کر کے تنگ و تاریک، گندی گلی سے گزر کر کچھ فاصلے پر بڑی سڑک پر کھڑی گاڑی میں آ کر اپنے دولہا کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ حارث کے بھائی بیٹھ گئے۔ جبکہ انیلہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر حارث کی بھابی بیٹھ گئیں۔ دوسری گاڑی میں حارث کی بہنیں بہنوئی اور قاری صاحب بیٹھ گئے تو دونوں گاڑیاں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آگے پیچھے چل پڑیں اور یوں اس ننھی منی برأت کے ہمراہ انیلہ اپنے نئے گھر میں پہنچ گئی۔

کہاں تو اُس نے بڑی سی کوٹھی، کاروں اور نوکروں چاکروں کے خواب دیکھے تھے اور کہاں تین کمروں کا ایک چھوٹا سا کرائے کا فلیٹ، مگر وہ پھر بھی خوش تھی کہ باعزت طریقے سے اپنے گھر میں آ گئی ہے۔ یہ تو پھر بھی ایک صاف ستھرے علاقے میں نئے رنگ و روغن والا سجا سجایا فلیٹ تھا۔ ورنہ اگر حارث اُس کو کسی جھونپڑی میں بھی لے جاتا تو وہ بخوشی اُس کے ساتھ چلی جاتی کہ اُس نے اگر اُس کو بلیک میل کیا تھا تو اُسے اپنا کر اُس کا مان بھی بڑھایا تھا اور اُس کے خاندان اور محلے والوں کی نظروں میں اُسے معتبر کر دیا تھا۔ اور اِس کے چہرے سے بدنامی اور رسوائی کی کالک صاف کر دی تھی۔

رات کا کھانا حارث کی بھابی اور نند نے تیار کیا تھا۔ انیلہ کے لیے اُس کی نند کی ملازمہ ٹرے میں لگا کر کھانا کمرے ہی میں لے آئی تھی۔ کھانے کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ تو حارث حجلۂ عروسی میں آ گیا۔

''پورے تین ہفتوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہمیں بچھڑے مدتیں گزر گئی ہیں۔'' حارث نے سرخ بیڈ شیٹ سے مزین ڈبل بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو جواب میں انیلہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''ارے بھئی تم تو ایسے شرما رہی ہو جیسے آج ہماری پہلی ملاقات ہو۔'' حارث نے مسکرا کر اُس کا چہرہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''شادی کے بعد تو پہلی ہی ملاقات ہے نا...... ماضی کو تو میں ایک بھیانک سپنا سمجھ کر بھول چکی ہوں۔ اور پلیز آپ بھی سب کچھ بھلا دیں۔ آج سے ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' انیلہ نے دھیمے دھیمے لہجے میں نظریں جھکا کر کہا۔

''اچھا...... کیا اتنا آسان ہے۔ ماضی کو بھلانا۔'' حارث نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ اپنے اللہ سے لو لگائیں۔ اُس عظیم ذات سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں تو پھر دیکھیے گا کہ کیسے آپ خود کو ہلکا پھلکا اور پُرسکون محسوس کریں گے۔'' انیلہ نے دھیرج سے کہا۔

''ارے واہ میری بیوقوف سی انیلہ رانی تو بڑی سمجھدار ہو گئی ہے۔'' حارث نے ایک اور طنز کا تیر چھوڑا۔ مگر انیلہ نے برا نہیں منایا۔ اُس نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ اُس شخص کو نرمی اور محبت سے سیدھے راستے پر لائے گی۔

''مجھے تو ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ میرا دماغ کیوں اُلٹ گیا جو میں نے تم جیسی عام سی لڑکی سے نا صرف اتنے سالوں تک دوستی برقرار رکھی بلکہ اپنی اچھی خاصی بیوی کو چھوڑ کر کنگال ہو کر تم سے شادی کا فیصلہ کر بیٹھا۔'' حارث نے اپنی بات مکمل کی اور پھر لباس تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن ایک مقامی ہال میں ولیمہ تھا۔ اس میں حارث نے بڑی تعداد میں اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ملنے والوں کو بلا رکھا تھا۔ البتہ انیلہ کی طرف سے اُس نے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا اور اگر مدعو کرتا بھی تو آنا کس نے تھا۔ اس لیے انیلہ نے بھی محسوس نہیں کیا۔

ولیمے کے اگلے دن حارث اور انیلہ ایک ہفتے کے لیے مری ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ مری کی پُرفضا وادیوں میں ایک ہفتہ گزار کر انیلہ کی خوشیوں کو چار چاند لگ گئے۔ اور وہ اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ اُسے اس قدر چاہنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ملا ہے۔ جس نے اُس کے لیے نا صرف بھرپور طریقے سے شادی کے انتظامات کیے بلکہ اُس کی ہر خواہش کو پورا کیا۔

☆......☆......☆

سعدیہ بیگم ہانیہ کے ہمراہ حرا کے محل نما گھر میں داخل ہوئیں تو وہ حیران سی رہ گئیں۔ انہوں نے سوچا بھی نا تھا کبھی کہ سامیہ کی یہ چلبلی سی پیاری پیاری سی دوست اس قدر رئیس خاندان کی چشم و چراغ ہو گی۔ حرا کے ماما، پاپا بھائی اور بھابی نے نہایت تپاک سے دونوں ماں بیٹی کا استقبال کیا۔

عدیل کا تعارف حرا کی ماما نے اپنا بھانجہ کہہ کر

کروایا تھا۔ سعدیہ بیگم سب افراد سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ منظور چاچا نے انہیں جوس اور چائے اور دیگر لوازمات سرو کیے تو دونوں ماں بیٹی نے محض چائے ہی پی۔ اتنی زیادہ مختلف اقسام کی اشیاء دیکھ کر ہی مرعوب سی ہو رہی تھیں مگر جب کچھ دیر بعد کھانے کی میز پر بیٹھیں تو وہاں انواع واقسام کے کھانے سجے تھے۔

جب تک سعدیہ بیگم وہاں موجود رہیں سامیہ اوپر حرا کے کمرے ہی میں رہی۔ اُس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ماں کا سامنا کرنے کی جبکہ پہلے یہی طے کیا گیا تھا کہ سامیہ ماں سے ملے گی اور پھر سب اُن سے بات کریں گے کہ وہ سامیہ کے گھر واپس آنے کے سلسلے میں عظیم صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کریں مگر اس موضوع پر بات ہی نا ہو سکی۔

ایک دو مرتبہ جب حرا نے اُسے کہا کہ وہ اپنی امی اور بہن سے مل لے تو اُس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور روتے ہوئے بولی۔

''اگر امی نے سب کے سامنے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو میری کتنی بکی ہو گی۔''

''پلیز سامی ایسا مت سوچو وہ تمہارے لیے بہت اَپ سیٹ ہیں۔ تمہیں بہت چاہتی ہیں کل جب میں اُن سے ملنے گئی تھی تو وہ جس انداز میں تمہارا ذکر کر رہی تھیں، اُن کے ایک ایک لفظ سے تمہارے لیے محبت اور ممتا کی تڑپ نمایاں تھی۔ حرا نے سامیہ کو سمجھایا تھا۔

''مگر تم یہ تو سوچو کہ جب وہ مجھے یہاں دیکھیں گی اور پھر عدیل بھی یہاں موجود ہیں تو وہ فوراً سمجھ جائیں گی کہ وہاب کا مجھ پر شک بلا جواز نہیں تھا اور یوں پاپا کی طرح ماما اور ہانیہ بھی مجھ سے بدگمان ہو جائیں گی اور اگر ایسا ہوا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی اور پھر شاید وہ میری گھر واپسی کے لیے پاپا پر زور بھی نہ ڈالیں۔'' سامیہ نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا تو حرا بھی قائل ہو گئی تھی۔

سامیہ نے کھڑکی سے جھانک کر ماں بہن کو جاتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا اور جاتے ہوئے بھی اُن پر الوداعی نظریں ڈالی تھیں اور اُس کی اُن کی دید کی پیاسی نگاہیں سیراب ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُن کے سامنے موجود رہیں اور وہ انہیں دیکھتی رہے یہاں تک کہ اُس کی زندگی ختم ہو جائے۔ اس حد تک وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اب اتنے عرصے تک اُن سے الگ رہ کر اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ انہیں کس قدر شدتوں کے ساتھ چاہتی ہے مگر اب بھی پاؤں میں مجبوریوں کی زنجیر حائل تھی۔ جسے توڑنے کی فی الحال اُس میں نا ہمت تھی نا ہی حوصلہ...... جب سعدیہ بیگم اور ہانیہ کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی تو پھر وہ بوجھل قدموں سے نیچے آئی تھی۔

☆......☆......☆

''میں کل سامیہ کی سہیلی حرا کی طرف گئی تھی۔'' رات کو عظیم صاحب اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ سعدیہ بیگم نے بیڈ کے قریب کرسی گھسیٹ کر اُس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... کیوں؟'' عظیم صاحب نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر یونہی سرسری طور پر پوچھا۔

''وہ دراصل حرا کی ماما نے مجھے کھانے پر انوائٹ کیا تھا۔'' سعدیہ بیگم نے کہا۔

''بیگم تمہیں پتہ ہے نا کہ اسی لڑکی سے دوستی کی وجہ سے سامیہ کا گھر برباد ہوا۔ نا وہ اُس امیر زادی سے دوستی کی پینگیں بڑھاتی نا اُس کے گھر اتنا زیادہ جاتی اور نا وہاب کو اُس پر اس قدر شک ہوتا کہ نوبت طلاق تک جا پہنچتی۔'' انہوں نے قدرے کھردرے لہجے میں سعدیہ بیگم سے کہا۔

''لیکن اس میں حرا اور اُس کے گھر والوں کا کیا قصور...... وہ تو مخلص سے شریف لوگ ہیں۔ اب اُن کو الزام مت دیں۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' بالآخر عظیم صاحب نے زچ ہو کر پوچھا۔

''بس آپ سامیہ کو فون کریں اور اُسے کہیں کہ وہ اپنے گھر واپس آ جائے۔''

''اچھا اب سونے دو مجھے...... رات بہت ہو گئی ہے۔ صبح اس معاملے پر غور کروں گا۔'' یہ کہہ کر عظیم صاحب بیڈ پر لیٹ گئے اور انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''ہیلو سامی کیسی ہو؟'' عدیل نے فون پر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں؟ اچھا ہوا آپ نے کال کرلی۔ میں آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔'' سامیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''کیوں خیریت؟ ویسے خیریت ہی ہوگی۔ کیونکہ تمہاری آواز خوشی سے بھرپور ہے۔'' عدیل نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''جی جناب بالکل خیریت ہے دراصل میں آپ کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں کہ آج صبح ہی پاپا کا مجھے فون آیا ہے۔ انہوں نے نا صرف مجھے معاف کردیا ہے۔ بلکہ گھر آنے کو بھی کہا ہے۔''

''واقعی یار تم نے یہ تو بہت بڑی خوشی کی خبر سنائی ہے۔ اللہ تعالٰی کا لاکھوں بار شکر ہے اب تم نے اپنے گھر جاکر پہلا کام یہ کرنا ہے کہ آنٹی کو جلد از جلدی ہماری شادی کے لیے منانا ہے۔ میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتا۔'' عدیل نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''پلیز عدیل اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ میرا فائنل ایگزام ایک سال کے بعد ہے میں چاہتی ہوں کہ میری پڑھائی مکمل ہوجائے تو پھر......''

''نہیں...... سامیہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ اب تمہارے بنا ایک پل بھی گزارنا...... روز روز حرا کے گھر جاکر بھی ملنا اچھا نہیں لگتا۔''

''عدیل آپ سمجھتے نہیں اس طرح پاپا سوچیں گے کہ میں نے اسی مقصد کے لیے اُن سے معافی مانگی ہے اور گھر واپس آئی ہوں تاکہ آپ سے شادی کرسکوں۔''

''اگر قدرت کو ہمارا ملاپ منظور ہے۔ تو وہ ہوکر رہے گا۔ آپ ہر قسم کے اندیشوں کو ذہن سے جھٹک دیں۔ اچھا بائے اللہ حافظ۔'' اور یہ کہہ کر سامیہ نے فون بند کردیا۔ جبکہ دوسری طرف سے عدیل ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

سامیہ اپنی ماں اور بہن کے ہمراہ جب اپنے گھر پیارے گھر کے گیٹ سے گاڑی میں اندر داخل ہوئی تو فرط جذبات سے اُس کی آنکھیں چھلک اٹھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں بعد اس گھر میں لوٹی ہو۔

وہ جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی سے اتری اور تقریباً بھاگتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوگئی پاپا اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھے کسی فائل کی ورق گردانی کررہے تھے۔

''پاپا...... میرے اچھے پاپا جی...... مجھے معاف کردیا نا آپ نے؟'' سامیہ نے بھاگ کر اُن کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اپنا سر اُن کے گھٹنوں پر رکھ کر آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

''میری بچی...... میری سامیہ میری پیاری چاندی بیٹی...... میں تم سے ناراض ہی کب تھا۔ ہاں میری منی سی بیٹی ضرور مجھ سے ناراض ہوگئی تھی۔'' یہ کہہ کر پاپا نے اپنے دونوں مضبوط بازو پھیلائے اور سامیہ ان میں سما گئی۔ عجیب سا منظر تھا گھر کے بھی افراد نم آنکھوں سے باپ بیٹی کے اس حسین ملاپ کو دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

''رقیہ بیگم آپ نے عفیرہ بہن سے بات کی کہ کب تک اُن کا بچی کی رخصتی کرنے کا ارادہ ہے۔'' ضمیر صاحب نے رات کے کھانے کے بعد دونوں بیٹے اور بہو بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو بیوی سے پوچھا۔

''ہاں میں نے دو تین دن پہلے اُن سے پوچھا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ اگلے مہینے شہاب بیٹا دبئی سے آرہا ہے اور صباحت بیٹی ایم اے کررہی ہے۔ اُس کا ایک سال ہی رہ گیا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے...... ہمیں بھی ابھی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔''

☆......☆......☆

''بھائی آپ آج رات کو جلدی گھر آجایئے گا۔ میں نے آپ کی پسند کے کچے قیمے کے کباب اور سندھی بریانی بنائی ہے۔ امی مٹن قورمہ بنارہی ہیں۔ ساتھ میں گاجر کا حلوہ اور فروٹ ٹرائفل بھی ہے۔'' عالی

پارک میں جاگنگ کر رہا تھا۔ جب صباحت کا اُسے فون آیا۔

''ارے میری پیاری بہنا اتنا کچھ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے گھر میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی دال روٹی بھی میرے لیے من وسلویٰ سے کم نہیں۔'' عالی نے پیار بھرے لہجے میں بہن سے کہا۔

''نہیں بھائی آپ ہفتے میں ایک مرتبہ تو آتے ہیں امی کا تو بس نہیں چلتا کہ دنیا کی ہر اچھی چیز آپ کے لیے تیار کر لیں۔''

''او کے مائی ڈیئر سسٹر...... میں ابھی تو جاگنگ کر رہا ہوں۔ پھر گھر جاؤں گا نہا دھو کر تیار ہو کر آٹھ بجے تک آجاؤں گا۔''

''کیا دانیال بھی آئے گا آپ کے ساتھ؟''

''نہیں وہ اپنی نانی کے گھر جا رہا ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ آپ بس وقت پر پہنچ جایئے گا۔''

''اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر صباحت نے فون بند کر دیا اور پھر وہ کچن میں جا کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆......☆......☆

عالی جاگنگ سے واپس آیا تو پنکی اپنے والدین کے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''عالی تم چلو گے پاپا کی طرف میرے ساتھ آج؟''

''نہیں پنکی تم جاؤ انجوائے کرو میں نے ابو کی طرف جانا ہے انہوں نے مجھے کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔'' عالی نے جاگنگ شوز اتارتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر ایک لمحے کے لیے پنکی کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ ماتھے پر بل ڈال لیے اور پھر تنک کر بولی۔

''وہاں تو تم اکثر ہی جاتے رہتے ہو۔ پاپا کے ہاں گئے تمہیں پورے دو ماہ ہو چکے ہیں۔''

''مل لوں گا اُن سے بھی کیوں پریشان ہوتی ہو ابھی تو تم بچوں کے ساتھ چلی جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

عالی نہا کر اور کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے باہر آیا تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تیار ہوا اور والدین سے ملنے کے لیے اُن کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

رات کو جب عالی اپنے گھر والوں کے ساتھ خوب اچھا وقت گزار کر گھر واپس آیا تو پنکی ہنوز واپس نہیں آئی تھی۔ عالی نے سوچا کہ جب اُس کا موڈ ہوگا آجائے گی اس لیے وہ لاپرواہی سے سو گیا۔ مگر جب ایک ہفتے بعد بھی نا پنکی واپس آئی نا ہی اُس نے فون کیا تو تب عالی کا ماتھا ٹھنکا۔ اور وہ سمجھ گیا کہ اس مرتبہ محترمہ کچھ زیادہ ہی ناراض ہو گئی ہیں۔

''خیر ہوتی ہے ناراض تو ہوتی رہے میری بلا سے۔'' عالی نے خود کلامی کی اُسے بچوں کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ اب تو چھوٹی گڑیا بھی ایک سال کی ہو رہی تھی۔ اُس نے چیزوں کو پکڑ پکڑ کر اور واکر کی مدد سے چلنا بھی شروع کر دیا تھا۔ جب وہ تتلا تتلا کر پاپا کہتی تو عالی کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

دوسرے دن آفس سے اُس نے آفس کے سوئپر اور نائب قاصد کو اپنے گھر بھیجا۔ انہوں نے سارے گھر کی صفائی کی' بیڈ شیٹس چینج کیں۔ برتن وغیرہ دھو دیے اور سارے گھر کے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کر دی۔ شام کو عالی گھر آیا تو پورا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ جب تک پنکی کا غصہ نہیں اترتا وہ اسی طرح کبھی کبھار آفس کے بندوں سے گھر کی صفائی وغیرہ کروا لیا کرے گا۔ کئی بار اُس کا دل چاہا کہ پنکی کو فون کر کے بچوں کی خیریت دریافت کرے مگر پھر اُس کی خوددار طبیعت نے گوارا نہ کیا اُس نے عہد کر لیا تھا کہ نا وہ پنکی کو منانے جائے گا نا اُس کے ناز نخرے برداشت کرے گا۔ خود گئی ہے خود ہی آئے گی۔ اگرچہ بچوں کی یاد اُسے ستاتی تھی مگر وہ کسی طرح خود کو بہلا ہی لیا کرتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ پنکی اُسے بچوں سے الگ کر کے ایموشنلی بلیک میل کر رہی تھی۔ وہ انتہائی خودسر اور ضدی عورت تھی جو پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتی رہتی تھی۔

اور پھر پنکی کی پھوپو امریکہ سے اپنی دونوں بیٹیوں اور ایک رنڈوے دیور کے ہمراہ آ گئی۔ وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان آ گئے تھے کیونکہ پھوپو کی دونوں بیٹیوں

کے رشتے پنکی کے بھائیوں سے طے ہو چکے تھے۔ فی الحال ان لوگوں نے پنکی کے پاپا کے گھر کے اوپر کے حصے میں رہائش اختیار کی۔ اور پھر قریب ہی کوئی گھر تلاش کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ وہ خرید کر پھر شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پھوپو کا دیور سمیر احمد چالیس پینتالیس سال کے پیٹے میں تھا۔ اُس کی بیوی پچھلے سال بلڈ کینسر میں مبتلا ہو کر انتقال کر چکی تھی۔ اُس کے بچے بھی نہیں تھے پیسہ بہت تھا کیونکہ وہ امریکہ میں ایک اسٹورز کی چین کا مالک تھا۔ وہ پاکستان دوسری شادی کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ تاکہ ایک تو اُس کا گھر بس سکے دوسرے اُسے اولاد کی نعمت بھی میسر آ جائے۔ اُس کی دولت کی وجہ سے کئی امریکی لڑکیوں سے اُس کی دوستیاں تھیں اور وہ آنکھیں بند کر کے اُس سے شادی پر آمادہ ہو جاتیں۔ مگر سمیر احمد کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور یہاں آ کر اُس کی ملاقات پنکی سے ہو گئی۔ اگرچہ پنکی کی شخصیت میں بھی کوئی خاص جاذبیت نہیں تھی۔ بلکہ خاصی بدصورت تھی مگر سمیر احمد کو پتہ نہیں اُس میں کیا نظر آیا کہ وہ جی جان سے اُس پر مرمٹا اور اُس کے اردگرد پروانہ وار منڈلانے لگا۔

اُدھر جب عالی کی جانب سے خاموشی طویل ہوتی چلی گئی اور اُس نے اُس سے نا کوئی رابطہ قائم کیا نا ہی اُس سے ملنے آیا تو وہ سمجھ گئی کہ عالی اُس سے تمام ناطے توڑنا چاہتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اب اگر عالی اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ تو وہ دو بچوں کے ساتھ والدین کے در پر کب تک پڑی رہے گی۔ ایک دولت مند شخص اُس کا ہاتھ تھامنے کو آمادہ تھا۔ تو اسے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

چنانچہ پنکی نے والدین اور بھائیوں کے مشورے سے عالی سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے ایک دن وہ ڈرائیور اور جمیلہ بواء کے ہمراہ ٹرک لے کر اپنے گھر گئی۔ گھر کی ایک چابی اُس کے پاس تھی۔ عالی آفس گیا ہوا تھا۔ اُس کی غیر موجودگی کو غنیمت سمجھ کر اُس نے اپنا سارا جہیز میں ملا ہوا فرنیچر ٹی وی، فریج اور دوسرا سامان ٹرک پر لدوایا۔ اپنے اور بچوں کے کپڑے اور دیگر تمام ضروری چیزیں سمیٹیں۔ کچھ زیور گھر میں پڑا

تھا۔ وہ سیف سے نکالا۔ سیف میں جتنا کیش تھا وہ لیا۔ بینک میں اکاؤنٹ عالی نے پنکی کے نام پر کھلوایا تھا تاکہ جب ضرورت ہو وہ پیسے نکلوالیا کرے۔ ایسا تب سے تھا جب پنکی لاہور میں اکیلی رہتی تھی جبکہ عالی کراچی میں تھا زیورات کی لاکر بھی پنکی کے نام پر تھی۔ بینک کی چیک بک اور لاکر کی چابی ہر وقت پنکی کے پاس ہینڈ بیگ میں ہوتی تھی۔ اور یوں اپنی دانست میں پنکی نے عالی سے انتقام لینے کی غرض سے اُس کے گھر اور پیسے کا صفایا کیا اور ہمیشہ کے لیے وہاں سے چلی گئی۔ ٹرک اُس کے والدین کے گھر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ جبکہ وہ جمیلہ بواء کے ہمراہ بینک کی جانب چلی گئی اور سارا کیش نکلوایا۔ لاکر سے زیورات لیے اور مطمئن ہو کر اپنے والدین کے گھر پہنچ گئی۔ اگلے دن اُس نے اپنے پاپا کے فیملی فرینڈ وکیل کو بلوایا اور عالی کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا۔

عالی جب حسب معمول رات گئے گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ گھر کا صفایا ہوا تھا۔ پہلے تو اُسے خیال آیا کہ شاید ڈاکوؤں نے اپنا کام دکھایا ہے۔ مگر جب اُس نے اپنے اسٹڈی ٹیبل پر پنکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ پڑھا تو پوری بات اُس پر واضح ہو گئی۔

لہٰذا عالی نے اپنے لیٹر پیڈ سے ایک پیپر الگ کیا اُس پر طلاق نامے کا ڈرافٹ تیار کیا۔ اور اگلے روز کورٹ کے ذریعے اُسے قانونی طور پر طلاق نامہ بھجوا دیا۔ خس کم جہاں پاک کہہ کر عالی نے پنکی کی یاد کو ایک بھولی بسری داستان سمجھ کر ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دفن کر دیا۔ البتہ بچوں کی جدائی کے خیال سے اُس کے سینے میں کسک ہو رہی تھی۔ مگر چونکہ وہ جانتا تھا کہ جب تک بچے چھوٹے ہیں۔ وہ ماں کے پاس ہی رہیں گے۔ یوں بھی وہ اپنے ننھے منے معصوم بچوں کو عدالتوں کے ذریعے لینے کی کوشش میں خوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ جانتا تھا کہ پنکی کا بارسوخ باپ کبھی بھی بچے اُس کے حوالے کرے گا۔ نا اُسے اُن سے ملنے کی اجازت دے گا۔ خواہ وہ کتنی ہی کوشش کر لے۔ اس لیے اُس نے یہ سوچ کر سینے پر صبر کی سِل رکھ لی کہ وقت آنے پر اُس کے بچے اللہ اُس کے پاس

پہنچانے کی کوئی نا کوئی سبیل ضرور فرما دیں گے کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں وہ اتنا عرصے تک پنکی کو محض اپنے بچوں کی خاطر ہی تو برداشت کیے جا رہا تھا۔

چند دن تک اپنے گھر کے اجڑنے کا سوگ منانے کے بعد عالی نے بچا کھچا سامان سمیٹا اور اپنے والدین کے گھر چلا آیا۔ شہاب دبئی سے آ چکا تھا اور وہ لوگ نئے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے چار بیڈ روم کا دس مرلے پر مشتمل ڈبل اسٹوری گھر بہت خوبصورت اور ماڈرن طریقے سے بنا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو مری سے واپسی پر گھر پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے اور پھر کہیں ڈھائی تین بجے تک ہی حارث اور انیلہ سوئے تھے۔ انیلہ کا خیال تھا کہ وہ صبح دیر تک سوتی رہے گی تاکہ ایک تو نیند پوری ہو جائے دوسرے سفر کی تھکان اُتر جائے۔ مگر وہ اُس وقت چونک کر اٹھ بیٹھی جب حارث کے موبائل کا الارم زور زور سے بجنے لگا۔ پھر وہ رُکا ہی نہیں تھوڑی دیر بج کر خاموش ہوتا اور چند لمحے کے بعد پھر بج اٹھتا۔ اس طرح بار بار ریپیٹ ہو رہا تھا۔

انیلہ نے حارث کو دیکھا مگر وہ اپنے بستر پر نا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔ واش روم سے پانی کے گرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اسی وقت واش روم کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور حارث غصے میں بھرا ہوا واش روم سے برآمد ہوا۔ اور چیخ کر بولا۔

''تم بہری ہو کیا؟ تمہیں الارم کی آواز نہیں آ رہی۔ ابھی تک بستر پر پڑی ہو۔ اُٹھ کر الارم بند کر کے تیار ہو جاؤ۔ یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں جو یوں دن چڑھے تک سوتی رہو۔'' باپ کے گھر میں کب میرے نصیب میں دن چڑھے تک سونا لکھا تھا۔ وہاں تو سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی اٹھ جاتی تھی۔ انیلہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تو پھر یہاں آ کر کیوں شہزادی بن گئی ہو؟'' حارث نے زہریلے انداز میں کہا۔

''ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تم پہلے ہی لیٹ ہو رہی ہو۔ ابھی ناشتہ تیار کرنا اور دوسرے ضروری کام نمٹانے ہیں تم نے۔'' حارث نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اتنی صبح صبح اٹھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ رات کو تین بجے سوئے تھے۔ ابھی تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔'' انیلہ نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

''ملکہ عالیہ آفس اور پارلر نہیں جانا کیا؟ پورے مہینے سے گھر بیٹھ کر عیش کر رہی ہو۔ مزید چھٹیاں لیں۔ تو دونوں جگہوں سے جواب مل جائے گا۔'' حارث نے اُسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

''ک...... کیا؟ آفس؟ پارلر میں نے کوئی جاب واب نہیں کرنی اب۔''

''محترمہ تم نے کسی نواب سے شادی نہیں کی۔ میرے گھر میں رہنا ہے تو کام کرنا پڑے گا پچاس ہزار روپے میں خریدا ہے میں نے تمہیں، تمہارے دلال باپ سے...... اور میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں تھا کہ میں یوں تم جیسیوں کے عوض اتنے پیسے دیتا رہوں۔ قرض لے کر دیے تھے یہ پیسے' اور اب یہ قرضہ تمہاری تنخواہ سے ادا ہوگا سمجھیں تم۔''

''تو...... تو...... تم نے مجھے...... مجھے پچاس ہزار میں خریدا ہے۔ کیوں کیا ایسا تم نے...... یہ حرکت کر کے مجھے میری ہی نظروں سے گرا دیا ہے تم نے اور میرے باپ نے 'پڑا رہنے دیا ہوتا وہیں' ایک جہنم سے نکال کر تم دونوں نے مجھے دوسری جہنم میں لا پھینکا ہے۔ مجھے لگا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔

''تم جیسی سے کون محبت کرتا ہے جو شادی سے پہلے ہی اپنا آپ غیر مردوں کے حوالے کر دیں۔ اس قابل ہو تم؟'' حارث نے زہر خند لہجے میں کہا۔

گیارہ بجے وہ پارلر کے قریبی اسٹاپ پر اتری۔ وہاں قریب ہی ایک بیکری سے آدھا کلو مٹھائی لی اور پارلر کی طرف چل پڑی۔ جب وہ پارلر میں داخل ہوئی تو پارلر میں سعدیہ بیگم اکیلی ہی اپنی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم آنٹی سعدیہ کیسی ہیں آپ؟'' انیلہ نے مٹھائی کا ڈبہ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ بھئی شادی مبارک ہو۔ تمہارا شوہر تمہاری چھٹی کی درخواست اور ولیمے کا کارڈ لے کر آیا تھا۔ مگر چونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں نا آ سکی، تم خوش ہونا اپنے گھر میں؟'' سعدیہ بیگم نے انیلہ کے سراپے کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ج...... جی...... آنٹی اللہ کا شکر ہے۔ حارث بہت اچھے ہیں۔'' پھر اُس نے مٹھائی کھلا کر منہ میٹھا کیا۔ اسی دوران نا صرف ٹریننگ والی لڑکیاں آ گئیں بلکہ کسٹمرز بھی آنی شروع ہو گئیں۔ اور پارلر کا باقاعدہ کام کا آغاز ہو گیا۔ تو انیلہ اپنا ذاتی دکھ بھول کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اور یوں ٹائم گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ تین بجے سعدیہ بیگم آ گئیں۔ وہ انیلہ کے لیے لنچ لے آئی تھیں۔ باقی لڑکیاں اپنا اپنا لنچ گھر سے لے آتی تھیں۔ سب نے مل کر لنچ کیا۔ پھر ایک لڑکی نے الیکٹرک کیٹل میں پارلر ہی میں چائے بنائی۔ اس دوران چار بج گئے اور انیلہ سعدیہ بیگم اور باقی لڑکیوں کو خدا حافظ کہہ کر پارلر سے باہر آ گئی۔

اپنی سوچوں میں وہ کھوئی ہوئی تھی کہ اُس کے قریب آ کر بس رکی اور وہ جلدی سے سواریوں کے اژدھام کے باوجود بس میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ آفس کے قریبی اسٹاپ پر بس رکی تو پہلے مارکیٹ گئی۔ وہاں سے باس کے لیے دو پونڈ کا کیک اور باقی اسٹاف کے لیے دو کلو مٹھائی کا ڈبہ خریدا۔ شکر ہے کہ اُس کے پرس میں دو ہزار روپے پڑے تھے۔ جو ولیمے والے دن ملنے والی سلامیوں میں سے اُس نے بچا کر رکھ لیے تھے۔ آفس میں سب لوگ بہت تپاک سے ملے اور اُس کو شادی کی مبارکباد دیتے رہے دس بجے تک وہ آفس میں مصروف رہی پھر آفس کی گاڑی نے ہی اُسے گھر ڈراپ کر دیا وہ تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے پرس لونگ روم میں میز پر رکھا اور اپنے کمرے میں جا کر الماری سے کپڑے نکالے' کپڑے بدل کر وہ کھانا کھائے بنا ہی سو گئی۔

دن بھر کی تھکن کی وجہ سے وہ فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو...... حارث بیڈ کی اپنی مخصوص سائیڈ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ جانے وہ رات کے کس پل آیا تھا۔ انیلہ کو نیند میں ہونے کی وجہ سے خبر نا ہو سکی تھی۔ وہ چپکے سے بیڈ سے اتری۔ وضو کر کے نماز پڑھی پھر کچن میں جا کر ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔ اب اُس کو اسی طرح بھاگ دوڑ کے زندگی گزارنی تھی۔ سو ناشتے کے بعد کام پر جانے کے لیے کپڑے استری کرنے چل دی۔ اب یہی اُس کی زندگی تھی پہلے باپ کی عیاشیاں پوری کرنے کے لیے کمائی تھی اور اب رنگین مزاج شوہر کے شوق پورے کرنے کے لیے چکی میں پسنا تھا۔

☆......☆......☆

عدیل نہایت بے چینی سے کالج کے احاطے میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ سامیہ کے پیپر کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اُس کا آخری پیپر تھا۔ اور وہ پیپر کا وقت ختم ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اُس کالج میں آ گیا تھا۔

''آپ...... آپ یہاں کیسے؟'' سامیہ نے عدیل کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''محترمہ آدھے گھنٹے سے آپ کا منتظر ہوں۔'' عدیل نے جلدی سے کہا۔

''اوہو...... اس قدر بے چینی......'' سامیہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''ہاں...... ہاں اڑا لو...... ہمارے جذبوں کا مذاق...... ایک سال سے انتظار میں سوکھ رہا ہوں۔ اور محترمہ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔'' عدیل نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''ویسے عدیل آپ کو ڈاکٹر کی بجائے شاعر ہونا چاہیے تھا۔ سامیہ نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے؟ اُن کے جذبات' احساسات نہیں ہوتے کیا؟ اب تو محترمہ آپ خود بھی تقریباً ڈاکٹر بن چکی ہیں۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' عدیل نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اچھا چھوڑیے ان باتوں کو، بتائیں اب کیا پلان ہے بھئی......''

''پلان تو تم سے شادی کے بعد کینیڈا فلائی کرنے کا ہے وہاں ہم دونوں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیں گے۔اور سامیہ اس بات پر خوش ہوگئی۔

پھر یہ الگ داستان ہے کہ عدیل نے کس طرح سامیہ کے والدین تو راضی کیا اس کوشش میں حرا اور اس کے گھر والوں نے عدیل کا بہت ساتھ دیا اور وہ دن سامیہ کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار ترین دن تھا۔ جب اُس کے من پسند شخص سے نہایت۔ سادگی سے اُس کی شادی ہوگئی اور وہ رخصت ہوکر عدیل کے اپارٹمنٹ میں آگئی۔

''میری تو خواہش تھی کہ میں تمہیں رخصت کروا کر اپنی شاندار خاندانی حویلی میں لے جاؤں۔ سارا خاندان اس شادی میں شامل ہوتا۔کئی روز تک ہماری شادی کی خوشی میں روایتی رسومات ہوتیں۔جشن منایا جاتا' مگر افسوس کہ ایسا نا ہوسکا۔پلیز اس سیدھی سادھی خاموش شادی پر مجھے معاف کردینا۔'' عدیل نے سامیہ کو رونمائی میں نہایت خوبصورت اور قیمتی ڈائمنڈ رنگ پہناتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ مل گئے ہیں بس میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔''

پھر ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا۔اور وہ وقت بھی آگیا جب سامیہ سب سے رخصت ہوکر عدیل کے ہمراہ کینیڈا کی جانب محوِ پرواز تھی۔

کینیڈا آنے سے قبل عدیل اپنے گاؤں گیا تھا اور اپنے خان بابا اور خاندان کے دوسرے افراد کو کینیڈا جانے کے متعلق بتادیا تھا البتہ اپنی شادی کی خبر نہیں بتائی تھی۔سب نے اُس کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی۔

☆......☆......☆

عالی کی خاموشی اور اُداسی کو سارے گھر والے محسوس کررہے تھے جب تک شہاب یہاں موجود رہا وہ اُس کے پاس اُس کے کمرے ہی میں سوتا تھا۔عالی کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ عالی کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرکے گھر بسا لے۔

☆......☆......☆

پنکی نے بڑے زعم سے سمیر کے ورغلانے اور سبز باغ دکھانے پر عالی سے طلاق تو لے لی تھی۔مگر اب وہ شادی کے سلسلے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ ویسے بھی ابھی تو جب تک پنکی عدت میں تھی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور سمیر کا کہنا تھا کہ اُسے شادی کی جلدی ہے' کیونکہ وہاں امریکہ میں اُس کا بزنس اُس کی غیر موجودگی میں متاثر ہورہا تھا اور قبل اس کے کہ پنکی کی عدت پوری ہوتی سمیر ایک دن خاموشی سے امریکہ فلائی کرگیا۔

☆......☆......☆

مبارک صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کے یہاں سے جانے کے بعد بہت بہت روتقی سی محسوس ہوتی ہے۔ضمیر صاحب نے نماز کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنے گھر کے اوپر والے ویران ویران اور تاریک پورشن کی طرف اُداس نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں بڑے اچھے اور ملنسار لوگ تھے۔عفیرہ بہن سے تو تقریباً ہر روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ صباحت بیٹی سے بھی مل لیتی تھی۔ اب تو خصوصی طور پر ہی اُن کی طرف جانا ہو تو ہو۔اتنی دور تو چلے گئے وہ لوگ۔'' رقیہ بیگم نے بھی افسردگی سے کہا۔

''چلیے کوئی بات نہیں۔ کچھ ہی دن ہیں یہ وقت پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔ اور پھر صباحت بیٹی ہمارے گھر کی رونق بن کر آجائے گی۔'' ضمیر صاحب نے کہا۔

''ہاں......اللہ تعالیٰ وہ وقت خیریت سے لائے۔ میں تو اس کے انتظار میں ایک ایک پل گن رہی ہوں۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اوپر کے پورشن میں بیٹے کو شفٹ کردیں گے۔ کیونکہ اُس کے بچے بڑے ہورہے ہیں۔ اب اُس کا ایک کمرے میں گزارا نہیں ہوگا۔ اور صباحت بیٹی کو میں اپنے پاس نیچے والے پورشن میں رکھوں گی۔ بڑی پیاری اور سلجھی ہوئی بچی ہے۔'' رقیہ بیگم نے صباحت کا ذکر نہایت پیار سے کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ جلدی وہ دن لائے۔'' یہ کہہ کر ضمیر صاحب نماز کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆......☆......☆

وہ دن انیلہ کے لیے انتہائی خوشی کا تھا جب اُسے پتہ چلا کہ حارث نے امریکہ میں اپنے دوست کے ساتھ کاروبار شروع کیا ہے۔ اور جلد وہ دونوں امریکہ چلے جائیں گے اور آج وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین تصور کر رہی تھی وہ اور حارث ایئرپورٹ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ آج اُن کی نیویارک کی فلائٹ تھی۔

☆......☆......☆

پانچ سال کی ان تھک محنت کے بعد عدیل اور سامیہ اپنے اپنے کورسز مکمل کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اب وہ کینیڈا کے قانون کے مطابق مکمل ڈاکٹر تھے۔

عدیل یہ جانتا تھا کہ سامیہ اپنے گھر والوں سے اکثر فون پر بات کرتی ہے اکثر اُن کا فون بھی آجاتا تھا۔ بلکہ عدیل سے بھی سب گھر کے افراد باری باری بات کرتے تھے۔ عدیل خود بھی گاہے بگاہے انہیں فون کرتا رہتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے گھر والوں سے بھی برابر فون پر بات چیت کرتا رہتا تھا۔ جب اُس کا کورس مکمل ہو گیا تو اُس کے والد، والدہ اور دیگر عزیز و اقارب کا اصرار بڑھتا چلا گیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے پاکستان ضرور آئے۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے پاکستان کیوں بلایا جا رہا ہے۔ کیونکہ اُس کے والد اُس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ عدیل نے سوچا کہ وہ جب کچھ دنوں کی چھٹی پر پاکستان جائے گا تو پھر وہاں جا کر ہی اپنے گھر والوں کو سامیہ سے اپنی شادی کا بتائے گا اور پھر اُسے اُن سے ملوا بھی دے گا۔ اور اُسے امید تھی کہ وہ بھی اُس سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔

اُن کی شادی کو اب کافی وقت گزر چکا تھا اور وہ دونوں ہی چاہتے تھے کہ اُن کے گھر بھی اب اولاد ہو مگر چیک اپ کے بعد سامیہ کو یہ دل خراش خبر ملی کہ اُس میں کچھ پیچیدگیاں ہیں جس کے باعث شاید وہ اب ماں نہ بن سکے۔

یہ خبر سننے کے بعد وہ بہت روئی عدیل بھی خاموش سا ہو گیا تھا اور پھر یہ خاموشی سرد مہری میں کب بدلی دونوں کو ہی اندازہ نہ ہوا۔

دونوں سارا دن اپنی اپنی جابز میں مصروف رہتے اور رات کو معمول کے مطابق کھانا لگا کر اور اِدھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد سو رہتے اور جب بھی کسی کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی تو پھر تو سارا دن اور رات بھی اُن کی آپس میں ملاقات نا ہو پاتی۔ پھر انہی دنوں عدیل کی والدہ کی شدید بیماری کی اطلاع آئی تو عدیل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سامیہ بھی ساتھ جانا چاہتی تھی مگر کسی وجہ سے فی الحال اُسے چھٹی نا مل سکی۔ اس پر اُن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال عدیل اکیلا چلا جائے اور اُس کے واپس آنے پر سامیہ چلی جائے گی۔

ایک ماہ بعد جب عدیل پاکستان سے واپس آیا تو اس نے سامیہ کو یہ بتا کر اس کے ہوش اڑا دیے کہ اُس کا نکاح اُس کی خالہ زاد بہن سے کر دیا گیا ہے سامیہ کو عدیل سے اس دھوکے کی امید نہ تھی لہٰذا......

اُس نے چپکے چپکے پاکستان واپس جانے کے تمام انتظامات کر لیے اور پھر اُس دن عدیل کو بتایا جب اُس کی روانگی میں محض ایک دن باقی تھا۔ اگرچہ عدیل نے اُسے بہت روکنے کی کوشش کی۔ مگر سامیہ کا فیصلہ اٹل تھا اور یہ بھی کہ وہ اب مزید عدیل کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی عدیل اپنی نئی زندگی اپنی دوسری بیوی کے ساتھ شروع کر سکتا ہے اور پھر وہ نم آنکھوں سے عدیل سے جدا ہو کر پاکستان کے لیے محوِ پرواز ہو گئی۔

☆......☆......☆

عالی نے بذریعہ عدالت پنکی سے بچے حاصل کر لیے تھے وہ یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ پنکی ایک غیر ذمہ دار ماں ہے۔ اب وہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت مگن زندگی گزار رہا تھا۔

☆......☆......☆

صباحت کا ایم اے مکمل ہو چکا تھا اور اب اُس کے سسرال والوں کی خواہش تھی کہ وہ اُسے بہو بنا کر اپنے گھر لے جائیں۔ دوسری طرف شہاب کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

عفیرہ بیگم جہاں اپنے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کی

شادیوں کی زور و شور سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔
وہیں انہیں بڑے بیٹے عالی کی ویران زندگی کا دکھ بھی تھا۔ مگر عالی کا ایک ہی کہنا تھا کہ جب تک اُس کے بچے اسکول جانے کے قابل نہیں ہو جاتے وہ دوسری شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس طرح اُس کے بچے نظر انداز ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ کچھ بڑے ہو جائیں اور اُن کی اسکولنگ شروع ہو جائے گی تو پھر وہ اپنی پڑھائی لکھائی میں مصروف ہو جائیں گے اور اُن کو اتنی فرصت ہی نا ہوگی کہ وہ سوتیلی ماں یا دوسروں کے اچھے برے رویوں کو محسوس کر سکیں۔
جبکہ عالی کے والدین کا موقف تھا کہ چونکہ ابھی بچے چھوٹے ہیں اگر کسی اچھی لڑکی سے عالی کی شادی ہو جائے تو وہ اُس سے جلدی مانوس ہو جائیں گے اور اُسے اپنی ماں کے طور پر قبول کر لیں گے۔ مگر عالی کی ایک ہی نا تھی تنگ آ کر اُس کے گھر والوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

ایئر پورٹ سے نکل کر وہ دونوں بذریعہ ٹیکسی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل پہنچ گئے۔ دورانِ سفر انیلہ حیرت سے شیشے کے پار دیکھتی رہی اس کے لیے تو یہ دنیا حیرت کدہ تھی جس لڑکی نے اپنے شہر سے باہر قدم نہ رکھا ہو وہ امریکہ جیسے ملک پہنچ جائے تو دنیا ہی بدل جاتی ہے۔
حارث نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا کہ وہ ضروری کام سے جا رہا ہے کچھ دیر بعد لوٹ آئے گا۔ انیلہ نے اپنا بیگ کھول کر اُس میں سے گہرے نیلے رنگ کی پرنٹڈ شرٹ' سادہ ٹراؤزر اور ہم رنگ اسٹول نکالا اور باتھ لینے کے لیے واش روم میں چلی گئی غسل کر کے اور لباس تبدیل کر کے وہ خود کو خاصی فریش محسوس کر رہی تھی۔ بال سیٹ کرنے کے بعد اُس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ حارث کا انتظار بھی کر رہی تھی۔ اُسے خاصی شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔
کافی دیر بعد حارث واپس آ گیا واپسی پر وہ کسی پاکستانی ریسٹورنٹ سے بریانی لیتا آیا تھا۔
''یار سوری دیر ہو گئی دوست کھانے پر لے گیا تھا۔ ریسٹوران کا مالک اپنا لاہوری ہی ہے۔ اُس نے مزے دار بریانی کھلائی۔ تمہارے لیے بھی پیک کروا دی۔ اب تم جلدی سے گرم گرم کھانا کھا لو۔ تمہیں بہت بھوک محسوس ہو رہی ہو گی۔'' حارث نے تیز تیز بولتے ہوئے اپنی بات ختم کی اور پھر وہ اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔
انیلہ نے بددلی سے ایک ڈسپوزیبل پلیٹ میں تھوڑی سی بریانی لی۔ ساتھ میں قورمہ' رائتہ اور سلاد بھی تھا۔ وہ بھی اُس نے اپنے پلیٹ میں لے لیے ایک گلاس میں کوک لی اور باہر بالکونی میں آ کر بیٹھ کر کھانے لگی۔
کھانے کے بعد وہ دونوں سو گئے' سفر کی تھکان تھی لہٰذا تکیے پر سر رکھتے ہی وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی انیلہ جلدی سے بیڈ سے اُتری چپل پہن کر سیدھی بالکونی میں گئی اُسے یہ تجسس تھا کہ جو مناظر رات کی تاریکی میں دھندلے دھندلے سے نظر آ رہے تھے۔ دن کے وقت کیسے ہوں گے۔
سنہری چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ صاف شفاف نیلگوں آسمان بہت پیارا لگ رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے آوارہ ٹکڑے آپس میں اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ سامنے پارک میں سبز سبز گھاس آنکھوں کو تراوت بخش رہی تھی۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لیے اس وقت پارک میں ویرانی کا راج تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ویسا ہی اژدھام تھا۔ فٹ پاتھوں پر بوڑھے' جوان' بچے' عورتیں اور مرد تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔
اسی اثناء میں حارث بھی اٹھ گیا اُس کو کسی سے ملنے جانا تھا ناشتہ کر کے وہ باہر چلا گیا اور انیلہ کو تاکید کی کہ وہ تیار رہے واپسی پر باہر گھومنے چلیں گے۔
انیلہ دروازہ لاک کر کے بالکونی میں آ کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر تک باہر دیکھتی رہی جب اُکتا گئی تو پھر کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے

لگی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اُس نے گھڑی میں ٹائم دیکھ کر ظہر کی نماز ادا کی۔ اس دوران سہ پہر کے چار بج گئے تھے۔ حارث کے آنے کے ہنوز کوئی آثار بھی نا تھے۔ چھ بجے کے قریب حارث آیا اور اُس کو تیار کروا کر باہر نکل آیا کمرے سے باہر آکر انیلہ نے سکھ کی سانس لی جہاز کے سفر کے بعد سے وہ مستقل کمرے میں بند تھی۔

انیلہ اس عجیب وغریب دنیا کو حسرت سے تک رہی تھی جہاں ہر شخص کے چہرے پر آسودگی اور طمانیت تھی۔ صاف ستھری سڑکیں‘ سرسبز پارک صحت مند لوگ سب کچھ تو ان لوگوں کو حاصل تھا۔

پورا ہفتہ ان دونوں نے نیویارک میں اسی طرح گزارا۔ صبح حارث ناشتے کے بعد ہوٹل سے چلا جاتا۔ شام کو واپس آتا تو وہ انیلہ کو باہر گھمانے پھرانے لے جاتا۔ کبھی کسی پارک میں‘ کبھی کسی شاپنگ مال میں تو کبھی ساحل سمندر پر‘ وہاں ساحل میں شام کے وقت سارے دن کے تھکے ہارے لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ کچھ نیم برہنہ عورتیں اور مرد ساحل کی ریت پر نیم دراز باتوں میں مصروف ہوتے۔

امریکہ سے واپسی پر حارث بہت خوش تھا۔ اُسے اس کاروباری دورے پر توقع سے بڑھ کر فائدہ ہوا تھا۔ اُس نے ایک اچھی گاڑی بھی لے لی تھی۔ اور انیلہ سے آفس کی جاب بھی چھڑا لی تھی اور اب وہ صرف پارلر جاتی تھی۔ حارث نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو دوروں کے بعد وہ نا صرف ایک اچھے علاقے میں گھر لے لے گا۔ بلکہ انیلہ کو الگ گاڑی بھی لے دے گا۔ اور اُسے پھر پارلر کی جاب بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ اگلے دو سالوں میں سال میں تین یا چار مرتبہ انیلہ اور حارث امریکہ‘ کینیڈا‘ انگلینڈ‘ فرانس اور جرمنی کے دوروں پر جاتے۔ اور واپسی پر اُن کی دولت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

اس بار بھی انیلہ اور حارث ایک ہفتے کے لیے لندن گئے تھے۔ انیلہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ واپسی پر اپنے والدین سے ملنے ضرور جائے گی۔ ابا کتنا ہی کیوں ناراض ہو وہ منا لے گی اور خوب تحفے بھی لے کر جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی لندن ایئر پورٹ پر اتر کر وہ معمول کی چیکنگ کروا رہی تھی جب...... لیڈی پولیس کی کرخت چہرے والی خاتون کو کچھ شک سا ہوا۔

''کھولو اِسے......'' اُس نے انیلہ سے درشت لہجے میں کہا۔

انیلہ نے بلا جھجک حارث کے بتائے گئے کوڈ کے مطابق بریف کیس کھولا۔ بریف کیس میں حارث کے امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار کے بارے میں کچھ ضروری فائلیں تھیں۔ کچھ اور کاغذات وغیرہ تھے۔ لیڈی پولیس کی اہلکار نے وہ کاغذات ایک طرف رکھ دیے اور بریف کیس کو الٹ پلٹ کر بغور دیکھنے لگی۔ پھر ایک آلے کے ساتھ چیک کیا مگر تب بھی وہ مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک نظر انیلہ کے چہرے پر ڈالتی تھی اور پھر بریف کیس کا معائنہ شروع کر دیتی۔ بالآخر اُس نے کچھ فاصلے پر مردوں کی چیکنگ میں مصروف ایک نوجوان آفیسر کو بلایا۔ اُسے کوڈ ورڈز میں کچھ کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا انیلہ کو کڑے تیوروں سے گھورتا ہوا بریف اُٹھا کر ایک کمرے کا پردہ اُٹھا کر اُس میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دو پولیس مین آئے۔ انہوں نے انیلہ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا اور ایئر پورٹ کی پارکنگ میں کھڑی ایک پولیس وین میں ڈالا اور گاڑی تیزی سے ایک طرف بڑھ گئی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے کیوں پکڑا ہے تم لوگوں نے۔'' انیلہ نے چلا چلا کر انگریزی میں کہا۔ مگر جواب میں ایک سخت مزاج پولیس والے نے کہا۔

''شٹ اپ...... ڈونٹ شاؤٹ۔'' جواب میں انیلہ سہم کر چپ ہو گئی۔

انیلہ کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ پھر اگلے دن اُسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں اُس پر الزام لگایا گیا کہ اُس نے بریف کیس کے خفیہ خانوں میں دو کلو ہیروئن چھپائی ہوئی تھی۔ اگرچہ انیلہ نے اس الزام کا انکار کر دیا اور صاف کہا کہ اُس نے کوئی ہیروئن اسمگل نہیں کی اور یہ کہ وہ بے گناہ ہے۔ یہ بریف کیس اُس کے شوہر نے اُسے ایئر پورٹ پر دیا تھا۔ مگر اُس کی بات

کوئی بھی نہیں سن رہا تھا۔

حارث نے جب دیکھا کہ انیلہ پکڑی گئی ہے تو وہ فوراً ایئرپورٹ سے ہی اگلی فلائٹ سے پاکستان واپس چلا گیا۔ اُس کے پاس پاکستان کا ریٹرن ٹکٹ تو تھا ہی اور پاکستان جاتے ہی اُس نے انیلہ کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ جس پر کئی ماہ پہلے کی تاریخ تھی۔ تاکہ یہ ثابت کرسکے کہ اُس کا کئی ماہ سے اُس سے کوئی تعلق رشتہ نہیں ہے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھ اُسے بھی نا ملوث کرسکے۔ اُس نے ایک مختصر خط میں لکھا تھا کہ اُس کا ایسی عورت کے ساتھ کوئی تعلق ناطہ نہیں جو ہیروئن کی اسمگلنگ جیسے گھناؤنے جرم کی مرتکب ہوئی ہو۔ اور یوں انیلہ حارث کے کرتوتوں کی سزا تنہا بھگتنے کے لیے دیارِ غیر میں بے یارو مددگار رہ گئی۔

☆......☆......☆

سعدیہ بیگم اتنے برسوں بعد بیٹی کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ اگرچہ انہیں بیٹی کے اکیلے آنے پر دل میں کسک سی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ بیٹی کے پُراعتماد فیصلے اور خود اعتمادی پر مطمئن سی تھیں۔ باقی مقدر کے کھیل ہوتے ہیں۔ اگر قدرت اُسے دوسرے شوہر سے اولاد کی نعمت سے نواز دیتی تو نا اِس کا شوہر اولاد کی خاطر دوسری شادی کرتا نا اُن کی نازوں پالی لاڈلی کو ایک مرتبہ پھر بے گھر ہونا پڑتا۔ مگر ہوتا وہی ہے جو انسان کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ دخل انسان کی اپنی غلطیوں کا بھی ہوتا ہے۔ خوشی اور غم ملے جلے تاثرات کے ساتھ سب افرادِ خانہ نے سامیہ کا استقبال کیا اور تین گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ عظیم منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔

سامیہ کی آمد کی خوشی میں قریبی رشتے داروں کو ایک شاندار سی ضیافت میں مدعو کیا گیا۔ کھانا فراہم کرنے کی ذمہ داری ایک کیٹرنگ والے ادارے کے سپرد کی تھی۔ سب سے زیادہ خوشگوار سرپرائز سامیہ کے لیے یہ تھا کہ اُس کے تینوں بچے بھی آگئے وہ تو انہیں پہچان ہی نا سکی۔ بچے بڑے ہوگئے تھے سامیہ نے پہلی بار اپنے بچوں کو محبت سے دیکھا اور پھر لمحوں میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ اب وہ اپنے بچوں کو پوری توجہ اور محبت دے گی جو اُن کا حق ہے۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی اور بہت مطمئن تھی شاید وطن واپسی کی وجہ اولاد ہی تھی۔

☆......☆......☆

عالی ترقی کی منازل طے کرتا ہوا ایک اونچے عہدے پر فائز ہو چکا تھا اپنے دونوں بچوں کی وہ بہت اچھی پرورش کر رہا تھا۔ بچے بھی دادا' دادی کے ساتھ بہت خوش تھے۔ سب کے بے حد اصرار کے باوجود عالی نے شادی سے انکار کر دیا تھا وہ اب اپنے بچوں اور اپنے درمیان کسی تیسرے فریق کو آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ زندگی بہت آسودہ اور مطمئن سی گزر رہی تھی۔ ماضی میں کی گئی ناانصافیوں کو بھی وہ بھرپور انداز میں زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اس سے والدین کی جانب ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

انیلہ زندگی میں کی گئی اپنی غلطیوں پر نادم تھی۔ لیکن چاند تارے چھونے کی چاہ نے اُس کو تاریکی کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ اس سے کہاں غلطی ہوئی وہ سمجھ ہی نہ پائی۔ خوشگوار زندگی' محبت کرنے والا شوہر ہر لڑکی کی آرزو ہوتی ہے اس نے بھی تو یہی چاہا تھا پھر اُس کا انجام تاریک اور سرد جیل کا کمرہ کیوں' وہ کیوں قید تنہائی کاٹ رہی ہے جبکہ وہ گناہ گار بھی نہ تھی...... مگر سزا اُس کا مقدر ٹھہری۔

انسان ساری زندگی سپنے بننے میں گزار دیتا ہے۔ اونچے اونچے خواب دیکھتا ہے اپنے آپ کو سب سے اونچے مسند پر براجمان کرنا بھی چاہتا ہے مگر اُن سہانے سپنوں کی چاہ میں حقیقت کو بھلا بیٹھتا ہے اور یہیں سے اُس کی تباہی اور بربادی کا آغاز شروع ہوتا ہے۔ سامیہ کی خود غرضی نے اُس کو بالآخر تہی داماں کر دیا۔ عالی نے بھی خوابوں کی دنیا بسا کر سچ سے منہ موڑا اور انیلہ نے بھی صرف اپنے بارے میں سوچا...... تیز چلنا چاہا اور یہ تینوں ہی کردار منہ کے بل گر پڑے زندگی کی حقیقت سمجھنے والے ہی خوابوں کو رتھ پر سواری کر پاتے ہیں یہ بات جتنی جلدی سمجھ آجائے اتنا ہی اچھا ہے۔

☆......☆......☆

افسانہ

نسیم سکینہ صدف

قسمت کے کھیل نرالے

بڑی مشکل سے مطلوبہ کوٹھی کو تلاش کیا۔ گیٹ پر چوکیدار کو کہہ کر اندر اطلاع بھجوائی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو عورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر اور وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی اگرچہ......

مسئلہ ہی ایسا آن پڑا تھا کہ میں پریشان ہوگئی۔ مسئلے کا تعلق میری بیٹی سے تھا جو ایم اے میں پڑھ رہی تھی۔ اس مسئلے نے میری نیند حرام کر دی۔ بیٹی جوان ہو جائے تو ماں باپ کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ اگر میرا خاوند زندہ ہوتا تو مجھے اتنی فکر اور پریشانی نہ ہوتی۔ جب سے میری بیٹی جوان ہوئی تھی۔ اس کے

رشتے آ رہے تھے اور یہ سب امیر خاندانوں کے لڑکوں کے رشتے تھے۔

ان میں سے چند امیدواروں کو میں نے صاف انکار کردیا تھا کیونکہ یہ اوچھے اور شوباز قسم کے لالچی لوگ تھے۔ اور ان کی نظریں ہماری جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک دو اچھے اور پُروقار گھرانے مجھے پسند تھے اور میری خواہش تھی کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاں بیٹی کو بیاہ دوں۔

میں ایف اے تک پڑھی ہوئی ہوں۔ آج کل ایف اے کوئی خاص تعلیم نہیں سمجھی جاتی لیکن میں نے ان وقتوں میں ایف اے کیا تھا جب میٹرک تک پڑھنا بھی بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کی وجہ سے میرے اندر روشن خیالی پیدا ہوگئی۔ میں مطالعہ اور لکھنے کی شوقین ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی شاعری بھی کرلیتی ہوں۔ لیکن صرف شوق کی حد تک میں نے شاعری کو جنون نہیں بنایا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ تعلیم نے میرے اندر خود اعتمادی اور خیالوں میں پختگی پیدا کردی تھی اور یہی خود اعتمادی میں نے اپنی بیٹی میں پیدا کردی تھی۔

میں نے بیٹی سے اس کی شادی کی بات کی اور اس کے رشتے کے امیدوار گھرانوں کے متعلق تفصیل سے بتا کر کہا کہ وہ ان میں سے جہاں پسند کرے وہاں میں ہاں کردوں گی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اطمینان سے دو چار دن سوچ کر مجھے اپنی مرضی بتادے۔

''سوچنے کی ضرورت کوئی نہیں ہے۔'' بیٹی نے نظریں جھکا کر کہا۔

''مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں...... آپ ان لوگوں سے معذرت کرلیں۔''

بیٹی کے دوٹوک انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ اپنی زندگی کا ساتھی پسند کرچکی ہے اور اپنے فیصلے سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹے گی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ایک لڑکے کے متعلق بتایا جو اس کے ساتھ پڑھتا تھا اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے اپنی بیٹی پر غصہ نہیں آیا۔ بلکہ خوشی ہوئی کہ اس نے سب کچھ صاف صاف بتادیا۔ میں نے اپنے طور تحقیقات کی تو پتہ لگا کہ لڑکے کی صرف ماں ہے اور باپ نے لڑکے کے بچپن میں ہی اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی اور ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلی تھی اور مستقل انگلینڈ چلا گیا تھا۔ لڑکے کی ماں کا نام رضیہ بتایا گیا تھا۔ میں نے رضیہ سے ملنے کا فیصلہ کرلیا اور اگلے ہی دن وہاں جا پہنچی۔ یہ بڑی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ ہر طرف ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور کشادہ کوٹھی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار اس علاقے میں آچکی تھی مگر یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں جوان تھی اور یہاں نئی نئی کوٹھیاں بننی شروع ہوئی تھیں۔ اب تو یہ علاقہ پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔

بڑی مشکل سے مطلوبہ کوٹھی کو تلاش کیا۔ گیٹ پر چوکیدار کو کہہ کر اندر اطلاع بھجوائی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو عورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر اور وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی اگرچہ وقت نے ہم دونوں پر اپنے اثرات مرتب کیے تھے لیکن ہم دونوں نے فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ وہ میری کالج کے زمانے کی سہیلی رضیہ تھی۔ اپنے آپ کو رضیہ کے بجائے رضی کہلوانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ بڑی خوش ہو کر ملی اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے بالکل نہ بتایا کہ میں کس مقصد کے لیے آئی ہوں۔ مجھے دھچکا اس لیے لگا تھا کہ میری بیٹی رضی کے بیٹے کو پسند کرچکی تھی اور میں رضی کے ماضی سے واقف تھی۔ یہی مسئلہ میرے لیے پریشانی کا باعث بنا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے اپنی جوانی کے دن یاد آگئے۔ میرے

والدین مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ جب وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو میرے ابا اور امی خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ بسے۔ اباجی کی کوششوں سے ایک سکھ خاندان کی چھوڑی ہوئی حویلی ہمیں الاٹ ہوگئی۔ ہمارے خاندان والے چونکہ حالات زیادہ خراب ہونے سے پہلے ہی نکل آئے تھے۔ انہوں نے اپنی زمین جائیداد اونے پونے بیچ دی تھی۔ یہاں آ کر چھوٹا موٹا کاروبار کرلیا جو چل نکلا۔ ہم زیادہ امیر تو نہ ہوئے لیکن گھر میں خوشحالی تھی اور رہنے کو اچھی خاصی حویلی' میٹرک کے بعد جب کالج پہنچی تو وہاں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ اسکول کی نسبت آزاد ماحول تھا۔ یہیں میری ملاقات رضیہ سے ہوئی۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ کار میں کالج آتی جاتی تھی۔ کار بھی ڈرائیور لے کر آتا کبھی اس کا بھائی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کار کسی امیر کبیر فیملی میں ہی ہوتی تھی۔ رضی کو اپنی امارات اور حسن پر بڑا ناز تھا اور جا بے جا وہ اس کا اظہار کرنے سے چوکتی نہیں تھی۔ بات بات پر 'میری گاڑی' میرا ڈرائیور' ہماری کوٹھی اور ہمارے نوکر' وغیرہ جیسے الفاظ اس کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس میں سنجیدہ اور سادہ رہتی تھی اور میری طبیعت میں شوخی بالکل نہ تھی۔ پھر بھی ہماری دوستی ہوگئی۔ حالانکہ مزاج کے لحاظ سے ہم دونوں اُلٹ تھیں۔ دوستی بھی ایسی ہوگئی کہ ہم کالج میں ہر جگہ اکٹھی نظر آنے لگیں اور ہماری دوستی کالج میں مشہور ہوگئی۔

چھٹی کے وقت رضی کا ڈرائیور لینے آتا تو وہ مجھے اپنی کار میں بٹھالیتی اور ہمارے علاقے کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر اُتار دیتی۔ وہاں سے ہمارا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ مجھے کالج جاتے چار پانچ ماہ ہوگئے تھے۔ ایک دن چھٹی کے وقت میں رضی کے ساتھ کالج سے باہر نکلی اور حسب معمول اس کے ساتھ اس کی کار کی طرف بڑھنے لگی۔ رضی کی کار سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور سرخ رنگ کی نئی کار کھڑی تھی۔ ہم دونوں رضی کی کار میں بیٹھنے لگیں تو سرخ کار کا ہارون زور زور سے بجنے لگا۔ ہم دونوں نے اس طرف دیکھا۔

سرخ کار میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر رضی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی اور ساتھ ہاتھ ہلا کر کچھ اشارہ بھی کر رہی تھی۔

''یہ میرا کزن ہے زبیر......'' رضی نے مجھے پریشان دیکھ کر نوجوان کا تعارف کرایا اور کہا۔

''یہ میرا دوست بھی ہے اور مجھے لینے آیا ہے۔ تم ایسا کرو میرے ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ میں زبیر کے ساتھ گھوم پھر آؤں۔'' پھر اس نے اپنے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ رضی اپنے کزن کے ساتھ چلی گئی اور اس کا ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ اس کا کزن آتا اور وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی۔ رضی نے زبیر کے ساتھ میرا بھی تعارف کرادیا۔ چند ملاقاتوں میں ہی میں نے نوٹ کرلیا کہ رضی جتنی شوباز اور چلبلی لڑکی ہے زبیر اتنا ہی پُروقار اور سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔ دو تین بار میں بھی ان دونوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔ سچ پوچھیے، میری خاندانی حیثیت ایسی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ گھومنا، پھرنا، ہوٹل میں کھانے کھانا اور آئس کریم کھانا خواب لگتا تھا۔ یہ دونوں اپر کلاس کے اور میں مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ ایسی عیاشی تو صرف خواب میں دیکھ سکتی تھی۔ کبھی کبھی رضی کا بھائی جو کالج میں پڑھتا تھا اسے لینے آجاتا تھا۔ وہ بھی رضی کی طرح شوباز تھا بلکہ کچھ اوچھا بھی تھا۔ وہ خوامخواہ میرے ساتھ

بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا لیکن میں نے اسے کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ میں دو چار بار رضی کو اپنے گھر بھی لے کر گئی اور اپنے ابا سے ملوایا۔

ماں تو فوت ہو چکی تھی اس لیے میں اپنے ابا سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ کسی بات کی اہمیت ہوتی یا نہ ہوتی، میں ان کو ضرور بتاتی اسی طرح کبھی کبھی میں ابا کی اجازت سے رضی کے گھر بھی چلی جاتی۔ رضی نے مجھے بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے زبیر کی اور اس کی منگنی ہو جائے کیونکہ دونوں کے گھر والوں کا کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔ دونوں امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ زبیر کا باپ کچھ زیادہ ہی دولت مند تھا۔ ان کی نظر میں لڑکی لڑکے کا اکٹھے گھومنا پھرنا معیوب نہیں تھا۔ ایک دن رضی کالج نہیں آئی۔ چھٹی کے وقت میں گھر جانے کے لیے نکلی تو زبیر کی گاڑی نظر آئی۔ اس نے ہارن بجا کر مجھے متوجہ کیا۔

''میں نے اسے بتایا کہ آج رضی نہیں آئی اور وہ انتظار نہ کرے۔''

''مجھے پتہ ہے وہ آج نہیں آئی۔'' زبیر نے اطمینان سے کہا۔ ''اس نے مجھے کل ہی بتا دیا تھا۔ میں آپ کی وجہ سے آیا ہوں۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیوں......؟'' ''آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''براہ کرم گاڑی میں بیٹھ جائیں، یوں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے میرے لیے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی، گاڑی کیا چلی میرے دماغ میں اندیشوں اور وسوسوں نے یلغار سی کردی۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگی کہ میں کیوں ایک غیر آدمی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اسی کشمکش میں تھی کہ

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی ایک اعلیٰ اور امیرانہ درجے کے ریستوران کے سامنے رُکی تھی۔

زبیر مجھے لے کر فیملی کیبن میں بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا آ گیا اور ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہی میں نے زبیر سے کہا کہ اس نے جو بھی بات کرنی ہے۔ جلدی سے کرلے کیونکہ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تو تھی ہی لیکن اصل بات یہ تھی کہ میں یقین کر ہی نہیں سکتی تھی کہ زبیر مجھے خلوصِ نیت اور شرافت سے یہاں لایا ہے۔ میری سوچ یہ تھی کہ یہ اپنے مقابلے میں مجھے غریب اور سادہ لوح لڑکی سمجھ کر ورغلائے گا اور یہ اتنے امیرانہ کھانے سے میرا دماغ خراب کرنا چاہتا ہے۔

''آپ برا نہ مانیے۔'' زبیر نے کہا۔

''میں سیدھا سادہ آدمی ہوں اس لیے بغیر کسی تمہید باندھے بات کروں گا۔ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس میں بے حد سنجیدہ ہوں۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رضی مجھ سے زیادہ خوبصورت تھی اور امیر بھی اور پھر ان دونوں کی شادی بھی متوقع تھی۔ دونوں ایک ہی خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی شادی میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میرا یہ خدشہ صحیح ثابت ہونے لگا کہ یہ مجھے ورغلائے گا۔ شادی کا خواب دکھا کر میری عصمت کو کھلونا بنائے گا۔

''آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جو کچھ کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''شادی آپ ہی سے کروں گا۔''

''لیکن آپ کی اور رضی کی؟''

''میں رضی سے شادی نہیں کروں گا۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''میں اسے بیوی کی حیثیت سے برداشت نہیں کرسکوں گا۔ اس کے ساتھ رشتہ داری اور دوستی ایک الگ چیز ہے۔'' اس نے رضی سے بیزاری کا اظہار شروع کردیا۔

''رضی کیا سوچے گی؟'' میں نے کہا۔

''کوئی کیا سوچتا ہے مجھے اس کی پروا نہیں۔'' زبیر نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے اور اس کے سوشل اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے یہ بھی کہا۔ رضی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے اور دولت مند بھی ہے اور اسے وہاں سے جہیز بھی اس کے شایانِ شان ملے گا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔'' اس کے جواب میں اس نے بڑی لمبی بات کی جو مختصراً یوں تھی کہ'' اسے رضی کا ماڈرن ہونا اور آزادانہ مردوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔ اسے شو بازی اور اوچھی حرکتوں سے نفرت تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے جہیز یا دولت کی پروا نہیں ہے۔ اسے میری سنجیدگی اور متانت اچھی لگی تھی۔'' زبیر نے مجھ سے کہا کہ رضی کے گھر میں ضرورت سے زیادہ آزاد روی ہے۔ رضی کا بھائی لڑکیوں سے دوستیاں کرنے میں بدنام ہے۔ اور ان کے گھر میں شادی بیاہ اور دعوتوں وغیرہ میں کھلے عام شراب بھی پی جاتی ہے۔ بے راہ روی کو یہ لوگ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

قدرتی سا سوال تھا جو میں نے اس سے کیا۔ ''اسے رضی میں اتنی خامیاں نظر آتی ہیں تو اس کے ساتھ ایسی گہری دوستی کیا مطلب......؟''

''اپنے والدین کی عزت کی خاطر!'' زبیر نے جواب دیا۔

''والدین کی خوشی کی خاطر میں نے رضی کو قبول کرلیا تھا اور اسے اپنے ساتھ بے تکلف کرکے حقیقی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کررہا تھا لیکن مجھے مایوسی ہونے لگی تھی۔ میں جو اوصاف اس میں پیدا کرنا چاہتا تھا وہ تم میں نظر آگئے۔''

''میں نہ اپنا سوشل اسٹیٹس دیکھ رہا ہوں نہ تمہارا۔ میں جو چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔'' میں نے زبیر کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور کشمکش میں پڑ گئی کہ اسے کیا جواب دوں۔ زبیر نے یہ بھی کہا کہ'' میں ابھی رضی کے ساتھ اس سلسلے میں بات نہ کروں ہوسکتا ہے وہ میری دشمن ہوجائے۔ زبیر نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو کہا۔

''آرام سے گھر جاکر سوچ لینا اور ہفتہ دس دن میں مجھے اپنی رائے دے دینا۔'' اس کے بعد زبیر نے ایک مناسب جگہ پر مجھے ڈراپ کردیا اور میں وہاں سے رکشہ لے کر گھر آگئی۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ابا سے کوئی بات چھپائی اور انہیں کچھ نہیں بتایا۔ بتاتی بھی کیسے زبیر نے رضی کے متعلق اور اس کے گھر والوں کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں۔ میرا باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ رضی سے بات کروں یا نہ کروں۔ وہ جیسی بھی تھی۔ میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اسے دھوکے میں رکھوں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ یہی بات اسے کسی سے پتہ چلے میں خود اسے سب کچھ بتادوں گی۔ اگلے دن چھٹی تھی میں نے ابا جان سے رضی کے گھر جانے کی اجازت لی اور رکشے میں بیٹھ کر کوٹھیوں کے علاقے میں پہنچ گئی۔ رضی کی کوٹھی میں پہنچی تو اس کا بھائی مل گیا۔ میں نے اس سے رضی کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھو اور وہ رضی کو بھیجتا ہے۔ میں ڈرائنگ میں بیٹھ

گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور کہنے لگا۔

''رضی سو رہی تھی۔ میں نے اس کو جگایا ہے وہ نہا دھو کر ابھی آ جاتی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی کا اظہار کرنے لگا۔ میں سرک کر ذرا پرے ہٹ گئی۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح میرے قریب ہو گیا اور باتوں باتوں میں مجھے دوستی کرنے کی ترغیب دینے لگا۔ دوستی سے اس کی مراد ناجائز تعلقات ہی ہو سکتے تھے۔ میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے میرا وجود تپنے لگا تھا۔ اب مجھے زبیر کی باتیں سچ معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں اس گھر میں پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی اور رضی کے کمرے سے واقف تھی۔ میں سیدھی رضی کے کمرے کی طرف گئی اور اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور رضی آنکھیں ملتے ہوئے نکلی۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئی اور اندر لے گئی۔ ہم دونوں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''تم ابھی تک سو رہی تھیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں ...... کیوں، کیا بات ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''چھٹی والے دن میں دوپہر کو ہی اٹھتی ہوں۔''

''تمہارے بھائی نے تمہیں جگا کر میرے متعلق نہیں بتایا؟''

''نہیں......'' اس نے حیران ہو کر کہا۔

''آخر بات کیا ہے؟'' میں نے اسے اس کے بھائی کی حرکت بتائی تو وہ غصے میں آنے کی بجائے ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ وہ کچھ زیادہ ہی شرارتی ہو گیا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ میرا خون ابھی تک کھول رہا تھا اور وہ بڑے مزے سے اس بے ہودگی کو شرارت کہہ رہی تھی۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے رضی سے کہا کہ میں ایک خاص بات کرنے آئی ہوں اور پھر میں نے ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھ دی۔

توقع یہ تھی کہ وہ غصے میں آ کر زبیر کو گالیاں بکے گی اور میرے ساتھ بھی ناراض ہو گی لیکن اس کا ردِ عمل کچھ اور ہی تھا۔ پہلے تو اسے دھچکا لگا جیسے میں نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیے ہوں۔ حیرت اور صدمے سے اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور منہ کھل گیا۔

میں ڈر گئی کہ اب میری خیر نہیں لیکن ایک آدھ منٹ گزر گیا تو اس نے مجھے یوں حیران کر دیا کہ اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی کہ زبیر بہت اچھا لڑکا ہے اور میں ہاں کر دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا کیا بنے گا کیونکہ تم زبیر کو پسند کرتی ہو اور زبیر کے ساتھ تمہاری دوستی بھی ہے۔

''دوست کی حیثیت سے تو زبیر ٹھیک تھا۔'' رضی نے کہا۔

''لیکن شوہر کی حیثیت سے وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ وہ بڑا شکی مزاج ہے۔ ہر وقت پابندیاں لگاتا رہتا ہے۔ فلاں سے ملو فلاں سے نہ ملو۔ فلاں نے ہنس کر بات کیوں کی وغیرہ...... میں یہ پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے لیے لڑکوں کی کوئی کمی نہیں۔ میں اپنے مطلب کا لڑکا پسند کرلوں گی۔'' اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر زبیر کے والدین میرے گھر رشتہ مانگنے آتے ہیں تو میری پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ ابا جان کو کچھ شک ہو جانا تھا۔ میں نے یہ مشکل رضی کے آگے رکھی تو اس نے کہا کہ یہ رشتہ میں خود کراؤں گی۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ پہلے میرے ابا سے مل کر بات کی پھر زبیر کے ماں باپ کو ہمارے گھر لے آئی۔

''ابا جان نے ان کو کہا کہ مجھے اس رشتے سے انکار نہیں لیکن ہم مڈل کلاس لوگ ہیں اور وہ بہت دولت مند ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل میری بیٹی کو طعنے سننے پڑیں۔ زبیر کے ماں باپ بہت شریف لوگ تھے۔

انہوں نے کہا کہ امیر غریب سب اللہ نے بنائے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس آپ ہمیں بیٹی عطا فرمادیں۔ اس مسئلے پر بڑی باتیں ہوئیں اور آخر کار زبیر کے والد نے میرے ابا کو قائل کرلیا۔

پھر ایک ماہ کے اندر اندر میری شادی زبیر سے ہوگئی۔ زبیر اور اس کے والدین اتنے دولت مند ہونے کے باوجود نیک اور شریف لوگ ثابت ہوئے۔ میری زندگی خوش باش گزرنے لگی۔

میری شادی کے تین ماہ بعد رضی کی بھی شادی ہوگئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ لڑکا اس نے خود پسند کیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتیں کم ہونے لگیں۔ اور کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہوگئیں۔ میری شادی کو چار سال گزرے تھے اور میری ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ جب مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ رضی کو طلاق ہوگئی ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔

میں رضی سے افسوس کا اظہار کرنے اس کے گھر جا پہنچی۔ وہ بڑی خوشی سے ملی۔ اس کی حرکتوں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے طلاق کا کوئی افسوس ہے بلکہ وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو کہنے لگی۔

''دفع کرو اس حرامی کو میرے لیے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ جب دل کرے گا شادی کرلوں گی۔''

اس سے پتہ چلا کہ اس کا ایک بیٹا ہے جو اس کا خاوند اس کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا خاوند کسی رشتہ دار سے ملنے انگلینڈ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک انگریز لڑکی سے ہوگئی اور وہ اسے ساتھ ہی پاکستان لے آیا اور اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ میں نے اعتراض کیا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں اس کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤں۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے دوستوں کو گھر بلانا شروع کردیا۔ اس سے بات بڑھ گئی۔ وہ پہلے ہی انگریز لڑکی سے شادی کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے طلاق دے دی اور انگلینڈ چلا گیا۔ پھر رضی نے دوسری شادی کرلی مگر یہ شادی بھی زیادہ دیر نہ چلی اور صرف ایک سال بعد ہی اسے طلاق ہوگئی۔ اس کا دوسرا شوہر کوئی غیرت مند آدمی تھا جو اس کی بے راہ روی کو برداشت نہ کرسکا اور رضی اس کی لگائی ہوئی پابندیاں برداشت نہیں کرسکی۔ اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا۔

پھر بہت سارا وقت گزر گیا۔ میری بیٹی جوان ہونے لگی۔ جب بیٹی کی عمر پندرہ سال کو پہنچی تو زبیر کا انتقال ہوگیا انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسپتال تک جانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ زبیر کے انتقال پر رضی اور اس کے گھر والے بھی آئے تھے۔ یہ رضی سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میرے لیے بڑا مشکل وقت آن پڑا تھا۔ لیکن میرے ساس سسر نے مجھے اور میری بیٹی کو سنبھال لیا۔ روپے پیسے کی فراوانی نے بھی کوئی خاص مسئلہ نہ پیدا ہونے دیا۔ اس کے بعد رضی کا اور میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع رہا۔

آج میری بیٹی جوان ہوگئی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے سفر کے لیے جس ہم سفر کو پسند کیا ہے وہ میری سہیلی رضی کا بیٹا ہے۔ میں کشمکش و پیچ میں ہوں کہ کیا کروں۔ حالات نے مجھے عجیب دوراہے پر لاکھڑا کیا ہے۔ میرے سامنے یہ مسئلہ سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ کیا رضی جیسی عورت کا بیٹا اچھا شوہر ثابت ہوسکے گا؟ کیا میری بیٹی کا فیصلہ درست ہے؟ اور کیا یہ عجب اتفاق نہیں کہ زبیر اور رضی شادی کے بندھن والے تھے۔ مگر میرے درمیان میں آنے سے یہ رشتہ نہ ہوسکا اب زبیر کی بیٹی اور رضی کا بیٹا ایک ہونا چاہتے ہیں تو کہیں میں پھر درمیان میں تو نہیں؟ یہ اتفاق ہے یا قسمت میں عجیب سے دوراہے پر کھڑی ہوں۔

☆☆......☆☆☆

افسانہ

فرح انیس

وہ جو اِک ارمان تھا

''کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو بیوہ عورتوں کی طرح دہائیاں دے رہے ہو؟'' دونوں کچن میں کھڑے تھے، ولی کے اس طرح سے چیخنے پر وہ منہ بنا کر کاؤنٹر پر باؤل پٹخ کر وہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔تم پاگل عورت چینی کے بجائے نمک ڈال رہی تھی۔ سارا حشر کر دینا تھا،تم نے آج......

وہ پارک میں بنی بینچ پر بیٹھی سامنے کی جانب کھیلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر غصے کی وجہ سے سرخی چھائی ہوئی تھی۔ ولی کو اُس کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ ارے یار مسکان میں مذاق کر رہا تھا۔

اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ولی کو اپنی جان پر بنتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اُس کے برابر سے اُٹھ کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، دونوں کانوں کو پکڑ کر..... مسکان دیکھو نہ میں نے کان بھی پکڑ لیے پلیز اب تو معاف کر دو نا۔ چہرہ پر مسکنیت طاری کر کے اُس کی جانب دیکھنے لگا۔ مسکان کو اُس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اُس کا موڈ بحال دیکھ کر ولی نے شکر کا سانس لیا۔

''اچھا مسکان ایک بات تو بتاؤ؟'' ولی کے سنجیدہ انداز پر وہ اپنے برابر بیٹھے ولی کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''یہ جو حضرت ہیں، یہ ہیں کس سلطنت کی مخلوق؟'' اس سے پہلے وہ کچھ سمجھتی وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ اُس کی شرارت پر وہ چیختی ہوئی اُس کے پیچھے بھاگی۔ ''ولی کے بچے آج نہیں چھوڑوں گی تمہیں میں۔''

وہ لان میں کھڑی کینوس پر جھکی مہارت سے اسٹروک لگا رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ ہاتھ روک کر بے چین سی ہو کر کینوس کو دیکھنے لگی۔ جہاں دو خوبصورت آنکھیں مکمل ہو چکی تھی۔

''اب وہ اضطرابی انداز میں بالوں میں ہاتھ چلا رہی تھی۔'' خوبصورت بھوری آنکھوں میں بے چینی بھر آئی تھی، نازک گلابی لبوں کو بے دردی سے کچلتی ہوئی کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔ تھک کر برش وہیں کرسی پر پھینک کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو دیکھنے لگی۔ آگے بڑھ کر اُن کاغذوں کو اکٹھا کرنے لگی۔ جن پر کہیں دو خوبصورت آنکھیں بنی ہوئی تھی تو کہیں دو خوبصورت لب، کسی ایک بھی کاغذ پر بھی کوئی مکمل خاکہ نہیں بنا تھا۔ اچانک سے

اُن کاغذوں کو بیڈ پر پھینک کر وہی زمین پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ جنون نہیں ہے تو کیا ہے
پتھر کی دیواروں کو کانچ سے توڑنا

مسکان خاور علی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خاور علی کافی عرصے سے لندن میں مقیم تھے۔ اُن کا وہاں بزنس خوب چل رہا تھا۔ مگر جب چند سال قبل ان کی بیوی عائشہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر کوچ کر گئیں۔ تو ان کی زندگی کو شدید دھچکا لگا۔ دوستوں کے بے حد اصرار پر بھی وہ دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہوئے اور سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آگئے اپنی اکلوتی بیٹی مسکان کے پاس اپنی تمام تر توجہ اکلوتی بیٹی کی پرورش پر صرف کر دی مگر وقت گزرنے کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ ماں کی توجہ اور شفقت سے محروم مسکان بالکل اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔

"اگر ولی کا ساتھ نہ ہوتا تو خاور علی تو بالکل ٹوٹ جاتے۔ خالد صاحب خاور علی کے کافی پرانے دوست تھے، اُس کے علاوہ اُن کے برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ عائشہ کی زندگی میں اسماء کا جو خالد کی بیوی تھیں اُن کا گھر کافی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ولی خالد کا اکلوتا بیٹا اور اُن کی بیٹی مسکان کا بچپن کا ایک واحد دوست جو اسکول اور کالج میں اس کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور اب ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔

حال میں مسکان نے ایک آرٹ اسکول سے فائن آرٹ میں ڈپلومہ کیا تھا۔ اسماء اور خالد مسکان کو اپنی ہی بیٹی سمجھتے تھے۔ اسماء کے بے حد اصرار پر وہ اُن کے گھر چلی جاتی تھی۔ خود اُس کو ولی کے گھر میں اپنے گھر سے زیادہ مزا آتا تھا۔ ولی اُس کا دنیا میں وہ واحد دوست تھا جس سے وہ دنیا کی ہر بات شیئر کرتی تھی۔

مسکان کی دنیا بہت ہی مختصر تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق، اپنے اندر کی کتھارس سے کاغذوں کو سیاہ

کرنا، یا پھر رنگوں سے کھیلتے رہنا یا پھر ولی کے ساتھ وقت گزارنا۔ خاور علی کی اتنی محبت کے باوجود بھی وہ اُن سے اتنا گھل مل نہ سکی۔ وہ کچھ بولتے بھی یا اُس کو پاس بٹھا کر باتیں بھی کرتے ہوں تو وہ ہوں ہاں کے علاوہ کچھ نہ کہتی وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔

☆......☆......☆

''مسکان کی بچی'' ولی کی زوردار چیخ پر وہ اچھل کر رہ گئی اور ہاتھوں سے باؤل گرتا گرتا بچا۔

''کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو بیوہ عورتوں کی طرح دہائیاں دے رہے ہو؟'' دونوں کچن میں کھڑے تھے، ولی کے اس طرح سے چیخنے پر وہ منہ بنا کر کاؤنٹر پر باؤل پٹخ کر دہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

تم پاگل عورت چینی کے بجائے نمک ڈال رہی تھی۔ سارا حشر کر دینا تھا، تم نے آج میرے کپ کیکس کا اوہ اچھا وہ نمک تھا میں نے غور نہیں کیا۔ لاپرواہی سے جواب دیتی اُٹھ کر فریج سے سیب نکال کر کھانے لگی۔ ہاں جب بھی کبھی کچن میں جھانکو تو یہی حال ہوگا۔ اُس کے شرارت سے کہنے پر لاپرواہی سے بالوں کو جھٹک کر بولی۔

''اچھا اب زیادہ دماغ نہ کھاؤ کیک بنا کر کھلاؤ۔''

''میں یہاں تم سے تربیتی پروگرام سیکھنے نہیں آئی۔'' وہ تنک کر بولی ہاں تم تو ہو ہی سدا کی ندیدی۔

کیک بناتے ہوئے ولی کی زبان بھی فراٹے سے چلتی جا رہی تھی۔ بیک کے لیے رکھنے کے بعد وہ وہیں اُس کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ارے تم نے مجھے ہلکا لیا ہوا ہے۔'' ایسا کیک تم نے کبھی زندگی میں نہیں کھایا ہوگا۔

''واہ واہ کیا میرے ہاتھوں میں ذائقہ ہے۔ تم کھانا، حیران رہ جاؤ گی۔ خود ہی اپنی تعریف میں لگا ہوا تھا۔ مسکان کو لاپرواہی سے سیب کھانے میں مشغول دیکھ کر ولی جل ہی گیا۔

''ہاں بھئی تم تو جلو گی میرے ٹیلنٹ سے۔'' اُس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ اوون کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں اُس کے اندازے کے مطابق کپ کیک بیک ہو چکے تھے۔

''لگ تو شکل سے بڑے مزے کے رہے ہیں۔'' ایک بار پھر ولی کی تعریفیں شروع ہو چکی تھیں۔ جلدی سے ایک پیس اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا مگر اب چلتی زبان رُک چکی تھی اور وہ اب مسکان کو کیک منہ میں رکھتے دیکھ رہا تھا۔

''آخ تھو۔'' یہ کیا ہے؟ اُس کو ڈسٹ بن کی جانب بڑھتا دیکھ کر بولنے لگا وہ مسکان مجھے لگتا ہے ریسپی ہی ٹھیک نہیں تھی۔

ہاں اب ذرا بتانا کیا کہہ رہے تھے؟ کہ مسکان ایسے کپ کیکس تم نے کبھی زندگی میں نہیں کھائے ہوں گے۔ اب وہ اُس کی نقل اتارتے ہوئے بولی، وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا، ہاں تو ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

''بھلا بتاؤ ایسا کپ کیک کھایا ہے تم نے؟'' اُس کی بات پر وہ اُس کی غصے سے گھور کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

وہ کافی دیر سے یونیورسٹی کیفے میں بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس دن پارک میں ہونے والی بات کو سوچ کر ولی کے لب بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ دونوں واک کر رہے تھے کہ اچانک سے مسکان بولی۔

''ولی میری یہ خواہش ہے کہ جو کچھ میرے خوابوں خیالوں میں ہو وہ سب پورا ہو۔'' مسکان

کی اس بات پر وہ ہنس دیا کیونکہ بچپن سے وہ یہ بات اس کے منہ سے سنتا آرہا تھا۔ یاد ہے مسکان ہم دونوں جب اسکول سے آتے تھے تو بھری دوپہر میں ہم شام تک کیسے پاگلوں کی طرح سائیکل چلایا کرتے تھے۔ تمہیں سائیکلنگ اتنی پسند نہیں تھی نہ، تم صرف میرے خاطر چلایا کرتی تھیں تاکہ میں بور نہ ہوں۔

ولی کے کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس دی، ہاں تو تم میرے ساتھ گڈے گڑیا کی شادی والے کھیل میں شریک ہوتے تھے، وہ بھی میری خاطر اور جیسے بچپن کی یادوں میں کھوگئی اور تم اپنی گڑیوں کی شادی میں پریوں کو بلاتی تھی اور تو اور شہزادے شہزادیاں بھی ہوتے تھے۔ اس کے یاد دلانے پر وہ زور سے ہنس دی۔

''اک اک بات یاد ہے ولی مجھے!'' اُس کو اس طرح ہنستا دیکھ کر ولی بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ مسکان ایک لائف پارٹنر میں کیا خوبیاں ہونی چاہیے؟'' اُس کے سوال پر وہ کھوئی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

سب سے مختلف سب سے ہٹ کر، مغرور سا شہزادوں کی سی آن بان ہو، وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولنے لگی، حسین سا......

اوہ مسکان بس کردو، وہ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

'' یہ عجیب سی مخلوق ملے گی کہاں تمہیں۔ ویسے خوبصورت تو میں بھی ہوں۔'' اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔ جبھی وہ اُس کو مارنے کے لیے دوڑی تھی۔

☆......☆......☆

ولی بیٹا کیا کررہے ہو؟ اسماء کو اندر آتا دیکھ لیپ ٹاپ میں مصروف ولی نے سر اُٹھا کر کمرے میں اندر آتی ماں کی جانب دیکھا۔

'' ارے مما آئیں بیٹھیں۔ لیپ ٹاپ اک طرف کرکے وہ ماں کی جانب متوجہ ہوا۔ بیٹا میں بات کرنے آئی ہوں ضروری تم سے۔

'' جی بولیے۔''

اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

'' بیٹا میں اور تمہارے پاپا چاہ رہے ہیں کہ ہم مسکان سے تمہاری بات پکی کردیں۔ شادی آرام سے تم لوگوں کی پڑھائی کے بعد کردینگے اور پھر جاب کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تمہارے پاپا کا اتنا بڑا بزنس ہے وہ تم نے ہی تو دیکھنا ہے۔

تم بتاؤ، ٹھیک ہے نہ میں خاور بھائی سے بات کروں۔''

'' جی مما جو آپ کو مناسب لگے۔ اُس کی سعادت مندی پر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ جانتی تھیں کہ وہ مسکان کو کتنا چاہتا ہے۔

'' چلو ٹھیک ہے میں خاور بھائی سے بات کرتی ہوں۔ ہم پھر دو دن بعد چلتے ہیں۔ ابھی چھوٹی سی رسم کردیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔

وہ وہیں بیڈ پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھ کر مسکان کو سوچنے لگا۔

'' تم میرے لیے کیا ہو مسکان یہ تم جان ہی نہیں سکتی۔'' تصور میں مسکان کا شرمایا ہوا روپ دیکھ کر مسکرایا۔

☆......☆......☆

آنسو مچل مچل کر اس کی آنکھوں سے بغاوت کرتے ہوئے اُس کے رخساروں کو تر کررہے تھے۔ وہ ٹیرس میں کھڑی آسمان کی جانب چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

'' تم کہاں ہو ارمان؟ کیوں نہیں آجاتے

اب!'' رندھی ہوئی آواز سے بولتی جارہی تھی۔ مسکان کے رونے میں اب شدت آگئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دھپ سے اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا تم واک نہیں کررہی؟''

''نہیں میرا موڈ نہیں۔''

''کیوں کیا ہوا تمہارے موڈ کو؟''

''پتا نہیں......!'' بجھے ہوئے انداز میں اُس کو جواب دیا۔

''مسکان اِدھر دیکھو میری طرف، کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں تو......!''

''تم مجھ سے چھپا رہی ہو اپنے دوست ولی سے۔''

''نہیں ولی ایسی کوئی بات نہیں۔'' زبردستی مسکرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' اب وہ خوشی سے چمکتی آنکھوں سے برابر بیٹھی مسکان کو دیکھنے لگا۔

''اچھا......'' اس کے غائب دماغی سے جواب دینے پر وہ کچھ اُلجھ سا گیا۔

☆......☆......☆

''ہاں بھئی خاور بھائی پھر آپ نے کیا سوچا؟'' اسماء مسکرا کر پوچھنے لگی۔ آج خالد اور اسماء خاور علی کے گھر آئے تھے مسکان کے سلسلے میں۔

''بھابی مسکان آپ ہی کی بیٹی ہے۔ اور پھر میں خود ولی کو پرسنلی بہت پسند کرتا ہوں اور ولی سے زیادہ بہتر رشتہ میرے لیے کوئی نہیں، کیونکہ میں جانتا ہوں مسکان ولی کے ساتھ بہت خوش

رہے گی۔'' خاور علی کے جواب پر خالد اور اسماء مسکرادیے مگر اس سارے عمل میں اسماء کے برابر بیٹھی مسکان ساکت نگاہوں سے باپ کی جانب دیکھے جارہی تھی۔ ولی کی نگاہیں بار بار مسکان کی جانب اٹھ رہی تھیں جو سفید فراک میں نہایت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''پھر بھائی صاحب اجازت ہے نہ؟'' اسماء کے مسکرا کر پوچھنے پر خاور علی بے ساختہ ہنس دیے۔

''جی بالکل اجازت ہے۔'' اسماء نے نازک سی انگوٹھی مسکان کی انگلی میں ڈال دی۔

''مبارک ہو بھئی۔'' خالد نے اُٹھ کر خاور علی کو گلے لگالیا۔ خاور علی پھر ولی کی جانب بڑھے۔

''مبارک ہو بیٹے......''

''شکریہ انکل......'' وہ مسکرا کر اُن کے گلے لگ گیا۔ پھر وہ اپنی بیٹی کی جانب بڑھے جو بہت خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''مبارک ہو بیٹا......'' اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''کاش آج عائشہ زندہ ہوتی......'' مگر ان سب سے بے نیاز مسکان چپ چاپ بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

''تو یہ تھا ولی کا سرپرائز......'' رات کو کمرے میں بیٹھی انگوٹھی کو دیکھے جارہی تھی۔ پھر آہستگی سے انگوٹھی انگلی سے اُتار کر سائیڈ پر رکھ دی۔

آہٹ پر چونک کر سر اٹھایا تو خاور علی کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔

''آئیں پاپا......''

''میری بیٹی خوش تو ہے نا؟'' وہ مسکرا کر اُس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''جی پاپا......'' خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''بیٹا کوئی پریشانی ہے تو اپنے پاپا سے شیئر کرو۔ آپ اپنے پاپا سے کبھی کچھ شیئر نہیں کرتیں۔''

''نہیں پاپا ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا بیٹا بس آپ خوش رہو۔'' مسکرا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کمرے سے نکل گئے۔ اُن کے جاتے ہی وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

اس کے اندر آگ جل رہی تھی وہ بے چین ہو کر قلم کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ قلم کے نظر آتے ہی اس کے ہاتھوں میں روانی آ گئی تھی۔ وہ تیزی سے اپنے اندر کی آگ سے سفید کاغذ کو سیاہ کرنے لگی۔ پر آخری سطر پر اس کا قلم رُک سا گیا۔ جیسے لمبی مسافت کر کے تھک سا گیا ہے اور اس کے آنسو ٹوٹ کر موتی کی شکل میں اس سطر کو بھگو رہے تھے جس پر لکھا تھا۔

''یہ لوگ میری آنکھوں سے میرے خواب نوچ رہے ہیں۔''

☆......☆......☆

''کیا بات ہے بڑی چپ چپ ہو؟'' وہ برابر چلتی ہوئی مسکان کو دیکھنے لگا دونوں کافی دیر سے پارک میں واک کر رہے تھے۔

مسکان کو چپ دیکھ کر ولی سے رہا نہیں گیا تو پوچھ بیٹھا۔

''ولی ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں نا۔''

مسکان کی بات پر وہ اس کو دیکھنے لگا۔

''ہاں تو اس میں کوئی شک ہے۔'' چلتے چلتے وہ رُک گئی۔ وہ بھی رُک کر اس کو دیکھنے لگا۔

''مسکان کیا ہوا ہے؟''

''تم جانتے ہو نہ میرے خوابوں خیالوں میں کوئی اور ہے۔ ولی مجھے اس کا انتظار ہے۔'' عجیب بے چارگی سے وہ اس کو دیکھنے لگی۔

وہ جو رُکی ہوئی سانسوں سے اس کو دیکھ رہا تھا، آخری بات پر اس کی ٹھنڈی سانس لے کر وہی قریب رکھی بینچ پر بیٹھ گیا۔

''دیکھو مسکان میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ خواب خیال کچھ نہیں ہوتے۔ خدا کے لیے حقیقت کی دنیا میں واپس آؤ مسکان۔ تمہیں یہ سب سوچ کر کچھ حاصل نہیں ہوگا مسکان۔ یہ سب سراب ہے۔ جس کے پیچھے بھاگ کر صرف تم اپنی زندگی خراب کرو گی۔ یہ ایک لاحاصل انتظار ہے تمہارا مسکان۔''

وہ ایک دم سے اس کی بات پر بھڑک کر بولی۔

''ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا اور وہ آئے گا دیکھنا تم۔'' اس کے جنونی انداز پر وہ حیران ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگا وہ غصے سے اُٹھ کر پارک سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

اس کو لائبریری میں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''کیسی ہو مسکان؟''

''ٹھیک ہوں۔ تمہیں پتہ ہے ولی وہ مجھے مل گیا۔''

''کون؟'' سرسراتی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

''ارمان......''

''کہاں ملا، پارک میں؟'' خوشی سے دمکتے چہرے سے جواب دیا۔

اوہ کئی دنوں سے جو میں پڑھائی میں بزی تھا تو مسکان پارک جاتی رہی۔ وہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔

اب وہ مسکراتے ہوئے سادگی سے ارمان کے بارے میں بتانے لگی اور اپنی اس سادگی میں اس نے ولی کے بدلتے ہوئے تاثرات بھی محسوس نہیں

کرے۔ وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ مسکان کی جانب دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

''بیٹا ولی......''

''جی مما......'' اسماء کے متوجہ کرنے پر وہ غائب دماغی سے ماں کی جانب دیکھنے لگا۔

شام میں دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بیٹا اتنے دن ہوگئے تم لوگوں کے پیپرز ختم ہوئے اور یہ مسکان نے کوئی چکر بھی نہیں لگایا اور نہ تم گئے۔

''کیا تم دونوں میں کوئی ناراضگی ہے؟'' اب وہ فکرمندی سے بیٹے کی جانب دیکھنے لگی۔

''نہیں مما ایسا کچھ نہیں ہے، سب ٹھیک ہے۔''

ابھی وہ کچھ کہتی اس کی بات کے جواب میں کہ سیل پر بجتی بیپ کی جانب متوجہ ہوگئی۔ انہیں سیل پر مصروف دیکھ کر وہ باہر آ گیا۔

مضطرب سوچوں کو بہلانے کے لیے وہ سڑک پر ٹہلنے لگا کہ اچانک سے اس کے قدم پارک کی جانب بڑھ گئے۔

''کتنے ٹائم بعد وہ یہاں آیا تھا۔'' کھیلتے ہوئے بچوں، عورتوں اور لڑکیوں کی واک کرتے ہوئے دیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ کتنی ہی یادیں تھی۔ جو یاد آنے لگی۔ مسکان کے ساتھ واک کرتے ہوئے بے اختیار ہنسنا۔ یادوں سے دامن چھڑاتا ہوا۔ آگے کی جانب بڑھا۔ تو اک گوشے میں اک لڑکی کو دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

لڑکی کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ مگر ولی کو اس پر مسکان کا گمان ہو رہا تھا۔ آگے بڑھ کر وہ لڑکی کی جانب چل دیا۔ اس تک پہنچ کر اس کی آواز پر اس کے قدم رک گئے وہ اس سے ابھی بھی کچھ فاصلے پر تھا۔

''ارمان میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا تھا۔ اگر تم نہ ملتے تو تمہاری مسکان مرجاتی ارمان......''

ولی آگے بڑھ کر مسکان کے برابر آ گیا اور سامنے کی جانب جو نگاہ اٹھی تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا، ایسے زلزلے جو اندر ہی اندر اس کے وجود کو کھوکھلا کر رہے تھے اور بظاہر عمارت سالم سلامت تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ اندر کیا تباہی مچی ہوئی ہے۔

جب بولا تو اس کی آواز خود کو بھی خوف سے کپکپاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''مسکان تم کس سے بات کر رہی ہو؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

ولی کی آواز پر وہ چونک کر اس کو دیکھنے لگی۔ جیسے نیند سے جاگی ہو۔

''وہ یہاں ارمان، وہ ارمان ہے نا......'' وہ بے ربط لہجے میں بولتی اس کو دیکھنے لگی۔

اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔ جس میں بہت سارے کاغذ تھے۔ وہ ان کاغذوں کو دیکھنے لگا۔ جس میں کہیں تو دو خوبصورت لب تو کہیں دو خوبصورت آنکھیں بنی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی مکمل خاکہ نہ بنا تھا۔ سب ادھورے، مسکان کے خوابوں کی طرح۔

وہ خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی جانب چل دیا۔ ساتھ چلتے ہوئے اس کی نگاہ بار بار مسکان کے چہرے کی جانب اٹھ جاتی۔ بے خوابی کے باعث آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہوگئے تھے۔ اس کو اس کے گھر چھوڑ کر خود گھر کی جانب بڑھ گیا۔

رات وہ بیڈ پر لیٹا، عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ شام کا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس کو اپنی غفلت پر افسوس تھا کہ وہ کیوں اتنا مسکان سے غافل رہا۔ دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے وہ مسکان کے بارے میں

ہی سوچے جا رہا تھا۔

''کیا مسکان پاگل ہوگئی ہے؟'' کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ اب صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ صبح ہوتے ہی اس نے اپنے دوست حیدر کو کال ملائی۔

جو اس کا بچپن کا دوست بھی اور اب ایک ماہر نفسیات بھی تھا۔ سارا مسئلہ سننے کے بعد وہ بولا۔

''تم مسکان کو لے کر ابھی میرے کلینک آجاؤ۔''

اب وہ مسکان کو حیدر کے کلینک لے جا رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے مسکان کو دو تین بار متوجہ بھی کیا۔ مگر وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔ ولی کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اب وہ حیدر کے سامنے بیٹھا تھا۔ حیدر پُرسوچ نگاہوں سے مسکان کو دیکھ رہا تھا۔ جو کہیں اور ہی پہنچی ہوئی تھی۔ حیدر کے کچھ پوچھنے پر بھی وہ غائب دماغی سے اس کو دیکھنے لگی۔

''یار ولی اِدھر آؤ۔'' وہ اسے کلینک میں ایک سائیڈ پر لے گیا۔ جہاں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''بیٹھو...... اب ایک بات بتاؤ تم لوگ اس سے اتنا غافل کیسے رہے؟ یار حیدر میں نے بتایا نہ تمہیں کہ یہ اپنے پاپا سے اتنی فرینک نہیں ہے اور میں اس کا بچپن کا واحد دوست ہوں۔ اس کی اس عادت کو میں جانتا تھا کہ مسکان خوابوں خیالوں میں رہنے والی لڑکی ہے۔ پر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ سوچ اتنی پختہ ہو جائے گی۔

''دیکھو جو کچھ بھی تم نے بتایا ہے۔ مسکان کے بارے میں تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ولی بہت سے تو نہیں مگر کچھ لوگ ضرور ہیں اس دنیا میں جو خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

وہ لوگ اپنے اندر ایک جہاں آباد کر لیتے ہیں پھر انہیں کسی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس طرح مسکان نے بھی اپنے اردگرد خوابوں کی دنیا سجالی ہے۔

جب تم نے پارک میں دیکھا کہ مسکان کسی سے بات کر رہی تھی اور تم جب تم وہاں پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ دراصل اب اس کو وہ دکھنے لگا جو کسی اور کو محسوس بھی نہ ہو۔ وہ خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر اس خواب میں کھوگئی تھی کہ اُسے کسی کے آنے کی خبر بھی نہ ہو پائی۔

تم مسکان کو میرے پاس لے کر آتے رہنا میں اپنی پوری کوشش کروں گا مگر ولی مجھے کچھ وقت دو۔

حیدر کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ہاتھ ملا کر اس کے کلینک سے باہر آ گیا...... اب وہ مسکان کا ہاتھ پکڑے چلے جا رہا تھا کہ اسے اپنے پروفیسر کی لیکچر کے دوران کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔ کچھ لوگ خوابوں خیالوں میں رہتے ہیں کہ وہ اپنی اس دنیا میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ انہیں باہر کی دنیا بری لگنے لگتی ہے اور اگر ان کے خواب خیال پورے نہ ہوں تو ایسے لوگ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں یا پھر اپنی دنیا میں واپس چلے جاتے ہیں۔

جنہیں واپس اپنی دنیا میں لانا نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ اپنے اردگرد ایک حصار قائم کر لیتے ہیں جسے وہ چاہ کر بھی توڑ نہیں پاتے۔

وہ چلتے چلتے سڑک کنارے رُک گیا۔ اور سڑک پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''میں لاؤں گا تمہیں واپس مسکان، میں کروں گا تمہارا انتظار چاہے اس کے لیے ساری عمر ہی کیوں نہ لگ جائے۔''

اس سارے عمل میں اس نے مسکان کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کیونکہ یہ ہاتھ اس نے عمر بھر نہیں چھوڑنا تھا۔

جو بہت حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

افسانہ

ثمینہ طاہر بٹ

سب مایا ہے

''وڈی چوہدرانی جی...... آپ کیا سوچ رہی ہیں جی...... چھیتی چھیتی (جلدی جلدی) کریں جی پانی تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آپ کو اللہ کا واسطہ جی، اس پھٹے (تختے) پر آ جائیں۔'' ''نہیں شیداں...... تم لوگ جاؤ...... جاؤ تم لوگ محفوظ مقام پر...... میں اپنا......

''معاف کر دو چوہدرانی جی...... اللہ کا واسطہ ہے معاف کر دو اس نمانی کو غلطی ہو گئی جی اس سے، آخری واری معاف کر دیو جی...... آج کے بعد یہ آپ کو حویلی کے آس پاس بھی نظر نہیں آئے گی۔ رب کا واسطہ ہے وڈی چوہدرانی جی...... اس بدنصیب کی خطا بخش دو۔''

چوہدرانی جی کا غیض و غضب سے برا حال ہو رہا تھا۔ اُن کا مزاج تو ہمیشہ ہی سوا نیزے پر رہتا تھا مگر اس وقت تو اُن کا غصہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا اور اُن کے اس جلال بھرے انداز کو دیکھتے ہوئے کسی مائی کے لعل میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی بری طرح سے پٹتی معصوم رانی کو اُن کے چنگل سے چھڑا سکے۔

''سمجھا لے اِس کو شیداں...... اپنی اوقات مت بھولے، میں پوچھتی ہوں ہمت کیسے ہوئی اس حرام خور کی میری پوتی کا مقابلہ کرنے کی...... اونہہ! ذاتدی کوڑھ کرلی (چھپکلی) تے شہتیراں نوں جپھے۔'' ''کم ذات، نامراد کہیں کی۔'' چوہدری جی نے اپنے قدموں میں گری، بری طرح سے روتی بلکتی رانی کے پہلو میں جما کے لات رسید کرتے ہوئے تنفر اور کروفر بھرے انداز سے کہا تو اپنے کمرے کے دروازے میں گم صم کھڑی حیرت سے یہ سب 'تماشہ' دیکھتی ارم کا دل کانپ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

سرخ اینٹوں سے بنی اس اونچی حویلی کی شان واقعی بہت اونچی تھی۔ آس پڑوس کے سات گاؤں میں بھی ایسی شاندار حویلی کسی کی نہ تھی۔ اور بھلا ہوتی بھی کیسے؟ اس پورے علاقے میں چوہدری حشمت اللہ اور اُن کے آباؤ اجداد کا ایک نام، ایک مقام تھا۔

چوہدری صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ انہوں نے نئے دور کے نئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تینوں بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اُن کے بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاؤں کی بجائے شہر میں

سکونت اختیار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اسی لیے اپنے بابا جان کی رضا اور مشورے سے لاہور اور اسلام آباد میں فیکٹریاں اور ملیں لگائیں، خوب محنت، توجہ اور ایمانداری سے اپنے کاروبار کو فروغ دیا اور اب وہ وہیں سیٹلڈ تھے۔

چوہدری صاحب کا بھی زیادہ تر وقت شہر میں ہی گزرتا تھا۔ انہوں نے چوہدرانی صاحبہ کو بھی وہاں سیٹ کرنے کی بارہا کوشش کی تھی، مگر اُن کا وہاں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ چوہدری رحمت اور چوہدری حشمت دونوں کے کئی کنال پر پھیلے محل نما بنگلے تھے۔ ملازمین کی فوج ظفر موج تھی۔ مگر چوہدرانی جی کا پھر بھی وہاں دم گھٹتا تھا۔ نہ تو وہ اُن پڑھے لکھے سوٹڈ بوٹڈ (یونیفارمز) ملازمین پر پوری طرح حکومت کر پاتیں تھیں اور نہ ہی اُن کی حکومت کو سمجھ پاتے تھے۔ اس لیے وہ صرف چند روز ہی مارے باندھے شہر میں گزار پاتیں اور پھر واپس اپنے گاؤں لوٹ آتیں اپنی راج دھانی میں......

جہاں اُن کے حکم کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مارسکتی تھی۔ جہاں وہ 'وڈی چوہدرانی جی' ہوتیں اور باقی سارا پنڈ (گاؤں) کمی کمین، شوہدا اور کم ذات......

☆......☆......☆

''بے جی...... آپ نے رانی کو اس بری

طرح سے کیوں مارا؟ کیا ہوگیا، اگر اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا تو...... آخر وہ بھی انسان ہے، دل رکھتی ہے سینے میں اور پھر میری بچپن کی سکھی ہے وہ...... ہم ساتھ کھیلے، ساتھ پلے بڑھے ہیں بے جی...... اگر میں اس سے اپنے دل کی ہر بات کر سکتی ہوں تو وہ بھی حق رکھتی ہے کہ اپنی ہر بات میرے ساتھ شیئر کرے۔ یہ ہی دوستی کی معراج ہے بے جی...... آپ سمجھتی کیوں نہیں؟''

''میں تو سب سمجھتی ہوں پُتر...... مگر تو کچھ نہیں سمجھتی، یہ کمی کمین اِن کو ایک فاصلے پر ہی رکھتے ہیں۔''

''اِن کی حیثیت پاؤں میں پہنے جوتے کے برابر ہی ہوتی ہے اور جوتی ہمیشہ پیروں میں ہی اچھی لگتی ہے، سر پر نہیں رکھی جاتی، مگر تمہیں میری بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اور تمہیں ہی کیا، تمہارے تو باپ اور دادا سے بھی میرا ہمیشہ یہی اختلاف رہا ہے، انہیں بھی تمہاری طرح اِن غریبوں ہاری مزدوروں کا درد بے چین رکھتا ہے۔ اگر میں نے اپنا رعب اور دبدبہ نہ رکھا ہوتا تو آج ہماری چوہدراہٹ، ہماری بادشاہت کہاں قائم رہنی تھی؟''

''ارے یہ تو اللہ بخشے میرے ماں باپ نے ہمیشہ اپنے گاؤں اور گاؤں والوں پر حکومت کی اور ہمیں بھی حکمرانی کے گُر سکھا گئے، جو آج تک ہمارے کام آ رہے ہیں ورنہ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔''

''ایک تمہارے دادا کیا کم تھے ان کمی کمینوں کو سر چڑھانے کے لیے کہ تمہارا بابا اور پھوپی نے بھی اِن کا ہی رنگ ڈھنگ چڑالیا۔ اور اب رہی سہی کسر تم پوری کردینا۔'' ارم کو شروع سے ہی بے جی کا گاؤں والوں اور خاص طور سے اپنے مزارعوں اور ملازموں کے ساتھ روا رکھا جانے والا رویہ بے حد کھلتا تھا تو بے جی کو بھی اُس کے بقول اُن کے اِن 'چھوٹے لوگوں' اور خاص طور سے رانی سے دن بدن بڑھتی دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، مگر اس کے باوجود دونوں زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس لیے جیسے ہی اُسے چھٹیاں ہوتیں وہ گاؤں بھاگتی تھی۔

ارم بنیادی طور پر بالکل اپنے بابا اور دادا کی کاپی تھی۔ اُن کی طرح نرم دل، صلح جو اور سب سے محبت کرنے والی...... اُس کی اور رانی کی دوستی بچپن سے ہی بہت گہری تھی، گو کہ وہ گاؤں دادی سے ہی ملنے آتی تھی مگر رانی کا وجود اس کے لیے خاص کشش رکھتا تھا۔

شیداں اُن کی پرانی خاندانی ملازمہ تھی۔ اُس کے والدین نے بھی اپنے زمانے میں چوہدری صاحبان کی بڑی خدمت کی تھی اور پھر اپنے دور میں اُن کی جگہ شیداں اور اُس کے شوہر اکرم نے لے لی تھی۔ جو چوہدریوں کی زمینوں کا منشی تھا اور اب اُن کے بچے بھی اُن کی ہی طرح اپنا خاندانی فریضہ نبھا رہے تھے بڑی خوشی اور دل جمعی کے ساتھ......

رانی ماسی شیداں کی اکلوتی نواسی تھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے والدین اور بہن بھائی ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے ناطہ توڑ گئے تھے۔

اُس سال بارشیں معمول سے کچھ زیادہ ہی برس گئی تھیں۔ جانے آسمان نے کس کس کا کون کون سا غم اور دکھ دیکھ لیا تھا کہ دن رات روتا ہی چلا گیا اور دن رات برستے بادلوں نے جہاں اور بہت سے نقصانات کیے وہیں شیداں اور اکرم

کے دل پر بھی شب خون مارا تھا۔

اُن کی اکلوتی بیٹی کے سر پر بنی کچی پکی چھت والا کوٹھا ان طوفانی بارشوں کی تاب نہ لاسکا اور اچانک ڈھے گیا۔ رانی کے ماں باپ، بہن بھائی اس اُفتاد کے نتیجے میں ایک ساتھ ہمیشہ کی نیند جا سوئے۔

اب رانی کی خوشی قسمتی تھی یا اس کے نصیبوں کی ستم ظریفی کہ سب سے چھوٹی اور شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ بچ گئی اور یوں شیداں اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس ہی لے آئی تھی۔

''نانی...... رب سوہنے نے تو سارے انسان برابر بنائے ہیں۔ ایک ہی مٹی سے، ایک جیسی ہی روح پھونکی ہے سب کے اندر، پھر یہ چھوٹے بڑے کی تقسیم کس نے کی تھی؟ رب سوہنا اور اُس کا پاک نبی ﷺ تو فرماتے ہیں کہ کسی انسان کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے، تو پھر بے جی، ہمیں اتنا چھوٹا اتنا کمتر کیوں سمجھتی ہیں؟ نانی آپ نے اور آپ کے پورے خاندان نے ہمیشہ اُن کی خدمت کی ہے۔ پھر بھی نانی...... پھر بھی......''

''بے جی کی نظر میں ہماری ٹکے کی اوقات نہیں ہے۔ اُن کا جب، جہاں جی چاہتا ہے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیتی ہیں۔ چھوٹی بی بی اگر میرے ساتھ محبت کرتی ہیں یا مجھے اپنی سکھی مانتی ہیں تو اِس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو اُن سے نہیں کہا تھا کہ میرے ساتھ بہناپا گانٹھیں...... میری کیا اوقات کہ میں انہیں اپنے برابر سمجھوں۔''

''میں اپنی حیثیت اپنی اوقات اچھی طرح سے جانتی ہوں نانی...... پھر بھی...... پھر بھی بے جی نے ہمیشہ مجھے ذلیل کیا ہے۔ 'کمتر'، 'کم حیثیت' کی کمین نہ صرف سمجھا ہے بلکہ ہر دم احساس بھی دلایا ہے کہ ہماری جگہ صرف ان بڑے لوگوں کی جوتیوں میں ہی ہے...... ایسا کیوں ہے نانی......''

''آپ نے، نانا ابو نے بلکہ آپ کے تو بڑے بزرگوں نے بھی کبھی اپنی وفاداریوں، اپنی خلوص اور خدمت میں کمی نہیں آنے دی۔ تو پھر بے جی کو کیوں یقین نہیں آتا ہم پر، ہمارے خلوص پر......''

رانی کو اپنے جسم پر لگی چوٹوں میں اتنا درد محسوس نہیں ہو رہا تھا، جتنا کہ چوہدرانی جی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کے وہ گھاؤ اُسے تڑپا رہے تھے جو اس کے دل، اُس کی روح پر لگے تھے اور اُسے اس طرح تڑپتے دیکھ کر اُس کے نانا نانی اور ماموں ممانی بھی خون کے آنسو رو رہے تھے جنہوں نے اسے ہتھیلی کے چھالے کی طرح ہی پالا تھا۔

''رانی پتر......! تو مان یا نہ مان، غلطی تو تیری بھی ہے۔ چھوٹی بی بی...... اگر تجھے مان دیتی ہے تو اُس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تو اُن کے برابر ہوگئی۔ وہ ہمارے مالک ہیں پتر، اور ہم اُن کے ملازم...... مالک اور غلام کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے وہ کبھی بھی پاٹا نہیں جاسکتا۔

دھی رانی...... تو یہ بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتی۔ چھوٹی بی بی نے تجھے جانے کیسی کتابیں پڑھادیں ہیں، جانے کونسی دنیا دکھادی ہے تجھے کہ تو یہ برابری اور تقویٰ کی باتیں کرنے لگی ہے۔ پُتر! ہم نسلوں سے اس معاشرے میں رہ رہے ہیں اور اس معاشرے کے یہی اصول ہیں، یہی ریت اور یہی رواج......

یہاں شاہ کے بیٹے شاہ اور غلام کے بچے غلام ہی پیدا ہوتے ہیں۔ چھوٹی بی بی تو خود بڑی معصوم اور بھولی ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ دنیا کہاں بستی ہے اور دنیا والے کتنے ظالم ہیں......!'' اُس کے نانا

نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر اُسے اُن کی باتیں تازیانے کی طرح ہی لگیں تھیں۔

''ہاں رانی میری جان...... ابا ٹھیک کہہ رہا ہے ہم غلام ہیں۔ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام...... ہمارا کام صرف مالکوں کی جی حضوری کرنا...... اُن کی ہاں میں ہاں ملانا اور اُن کی خدمت ہی کرنا ہے اور بس......

اس سے زیادہ کی نہ تو ہمیں اجازت ہے اور نہ ہی ضرورت...... تو جانتی ہے ناں بیٹا کہ ارم بی بی کے والدین چوہدری رحمت بھی مجھے اپنا مصاحب خاص سمجھتے ہیں۔ اپنا دوست اور بعض اوقات اپنا بھائی بھی کہتے ہیں۔ مگر میں تیری طرح کبھی جذباتی نہیں ہوا۔ میں نے اپنے اور اُن کے درمیان موجود فاصلے کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ وہ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کرتے ہیں، کرسکتے ہیں، مگر میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اندھے کنویں کی طرح بنا کر پیش کیا ہے اُن کے سامنے، ایسا اندھا کنواں جس میں راز جا تو سکتے ہیں، باہر نہیں آسکتے۔ اسی لیے بٹیا......

چوہدری صاحب مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں۔ تمہاری غلطی یہ ہے بیٹا کہ تم نے ارم بی بی سے قصے کہانیاں سنی تو ضرور مگر اُن پر اعتبار بھی کرلیا اور پھر اُن کو اپنی کہانیاں بھی سنانے بیٹھ گئیں۔ اور یہ بات ہی بڑی چوہدرانی جی کو ناگوار گزری اس کے ماموں انعام نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اُسے اپنے نرم الفاظ میں بہت کچھ سمجھایا تو وہ اُن کی شکل دیکھنے لگی۔

''ہاں ماموں! آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں۔ غلطی تو میری ہی ہے اور اپنی غلطی کی سزا بھی میں نے پا ہی لی ہے شاید...... بے جی نے میرے ساتھ ٹھیک ہی سلوک کیا۔ میں اسی سزا کی مستحق تھی؟'' وہ نانی کی گود میں سر رکھ کر ایک بار پھر رو دی تھی۔

☆......☆......☆

ارم نے اگلے کئی دن تک رانی کا انتظار کیا۔ کئی بار ماسی شیداں سے اُس کا پوچھا بھی اُسے حویلی آنے کا پیغام بھی بھجوایا مگر چونکہ بے جی کا حکم تھا کہ رانی کا داخلہ حویلی میں بند ہے اور فی الحال ارم بھی اُس سے ملنے نہیں جاسکتی تو اُس کا انتظار انتظار ہی رہا۔

وہ جو ہر بار چھٹیوں کے آغاز میں ہی گاؤں چلی آتی تھی اور آخری چھٹی والے دن ہی واپس جاتی تھی۔ اس بار اس قدر دلبرداشتہ ہوئی کہ اُس نے فوراً واپسی کا اعلان کر دیا۔ چوہدرانی جی کو اس بات کا بھی بڑا 'وٹ' (غصہ) چڑھا تھا کہ اُن کی پوتی انہیں غلط ثابت کرنے کے لیے رانی کا ساتھ دے رہی تھی اور اسی لیے احتجاجی طور پر انہیں وقت سے پہلے ہی چھوڑ کر واپس جا رہی ہے۔

دل تو اُن کا ایک بار یہی کیا تھا کہ پھر رانی کو پکڑ کر چار چوٹ کی مار ماریں کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے یا پھر اس بلا کو ہمیشہ کے لیے گاؤں بدر ہی کروادیں۔ مگر وہ فی الحال ارم کی وجہ سے مجبور تھیں کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے دادا بلکہ اپنے پاپا کو بھی ساری بات حرف بہ حرف بتادی تھی۔ نہ صرف بات بتائی تھی بلکہ اپنے خدشات کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا کہ اب بے جی رانی کو زیادہ نقصان پہنچائیں گی۔

اور اگر ایسا ہوا تو وہ بھی گاؤں آنا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی اور اُس کی طرف سے دی جانے والی یہ دھمکی بے جی کے ہاتھ باندھ گئی تھی۔ پھر ارم واقعی وہاں نہیں رکی تھی اور واپس لاہور چلی

گئی۔ چودھرانی جی نے چند دن تو قلق میں گزارے، مگر پھر جلد ہی اپنی چودھراہٹ میں مگن ہوگئیں۔

☆......☆......☆

ہر طرف پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ تاحد نگاہ پھیلے اس بپھرے پانی نے کس کس سے کیا کیا چھین لیا تھا۔ اس کا اندازہ دور بیٹھے اپنے اپنے ٹی وی سیٹ پر اس حالتِ زار کو دیکھتے، اُن پر تبصرے کرتے، اظہار افسوس کرتے ہوئے لوگوں کو کبھی بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

یوں تو ہر سال ہی ساون بھادوں میں بادل کھل کر برستے تھے اور پھر ان لگاتار ہونے والی بارشوں کے پانی میں جیسے ہی بھارت کی طرف سے چھوڑا جانے والا پانی آملتا تو ایک طرح سے قیامت صغریٰ ہی برپا ہوجاتی۔ مگر یہ شاید اِن لوگوں کی خوش نصیبی تھی یا پھر ان پر اللہ کا خاص فضل کہ سیلاب نے عرصہ ہوا اُن کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا۔

اُن کا گاؤں نالہ ڈیک کے پرلی طرف تھا اور کافی فاصلے پر بھی...... اس لیے بھی وہ پچھلی کئی دہائیوں سے ان طوفانوں اور ان سیلابوں سے بچتے چلے آرہے تھے۔ مگر اس بار جانے کیا ہوا تھا کہ سب کے اندازے بھربھری ریت کی طرف ڈھلتے ہی چلے گئے۔

چوہدری حشمت اور چوہدری رحمت اپنے اپنے کاموں میں بری طرح سے پھنسے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی بزنس ٹور پر دبئی گئے ہوئے تھے۔ جبکہ چوہدری نعمت جو 'وڈی چوہدرانی جی' کی طرح ہی اکھڑ مزاج اور خود پسند تھے' آج کل اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گاؤں آئے ہوئے تھے اور اُن کی آمد کی وجہ سے حویلی میں خاصی ہلچل اور گہما گہمی نظر آتی تھی۔ اُن کے ڈیرے پر بھی خوب رونق تھی۔

اُن کے ساتھ ساتھ اُن کے ہمراہ آنے والے مہمان بھی بے حد مطمئن تھے اور اس سہانے موسم کو خوب انجوائے کررہے تھے۔ مگر ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے جو ہونا ہو وہ تو ہر حال میں ہوکر ہی رہتا ہے۔ اور اس ان ہونی نے اس بار انہیں نشانہ بنایا تھا۔

نالہ ڈیک میں آنے والی طغیانی نے 'شاہ گدا' ایک کرڈالے تھے۔ اس اچانک آنے والے شدید سیلابی ریلے نے اُن کے گاؤں سمیت آس پاس کے کئی گاؤں صفحہ ہستی سے ہی مٹا ڈالے تھے۔ اُن کی کھڑی فصلیں وہ ظالم پانی اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔

چوہدری نعمت اور اُس کے دوست اس وقت ڈیرے پر بیٹھے اگلے شکار کا پروگرام بنارہے تھے کہ خود سیلابی ریلے کا شکار ہوگئے مگر اکرم، انعام اور ان جیسے ہی دوسرے ہاریوں نے اپنی جان پر کھیل کر انہیں بچا ہی لیا۔ اکرم چاچا نے اپنے بوڑھے شانوں پر چوہدری نعمت کو اٹھا رکھا تھا، اُن کے دوستوں کو دوسرے ہاری اٹھائے محفوظ مقام کی طرف لے جارہے تھے۔

اُدھر وڈی چوہدرائن کا بھی برا حال تھا۔ وہ اپنی حویلی کی چھت پر کھڑی بے بسی کے عالم میں آسمان سے قہر کی طرح برستے پانی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پانی، جو کبھی زندگی کی نوید بنتا ہے تو کبھی رحمت بن کر برستا ہے مگر اس وقت یہی پانی زحمت ہوا تھا۔ آسمان سے تو برس ہی رہا تھا لگتا تھا زمین بھی اپنے اندر موجود اس انمول خزانے کو بے دردی سے اگل رہی تھی۔

اس لیے تو یہ لمحہ لمحہ بلند ہوتا، اپنے راستے میں

آتی ہر شے نگلتا چلا جا رہا تھا۔ کیا مکان، کیا کھلیان، کیا درخت کیا کھیت...... سب سرتاپا ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے کچے پکے گھر دھڑا دھڑ گرتے چلے گئے۔ اور وہ کچھ بھی نہ کر پائیں۔ بس، بے بس سی کھڑی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی 'راج دھانی' کو لٹتا دیکھتی رہ گئیں۔

''چوہدرانی جی...... وڈی چوہدرانی جی...... جلدی کرو جی...... وقت بہت تھوڑا ہے۔ پانی جس تیزی سے بڑھ رہا ہے، تھوڑی دیر تک تو حویلی چھت بھی ڈوب جائے گی۔ آپ جلدی سے آجائیں، ہم آپ کو محفوظ مقام پر لے جاتے ہیں۔ جلدی کریں چوہدرانی جی......'' پانی حویلی کی چھت تک آن پہنچا تھا۔ وہ اونچی شان والی اونچی حویلی اس وقت ناکوں ناک سیلابی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چوہدرانی جی، دم بخود اپنا قیمتی سازوسامان اپنے قیمتی برتن، فرنیچر، چادریں، کپڑے، زیورات، حتیٰ کہ مال مویشی جن پر وہ بے تحاشا مان اور غرور کیا کرتی تھیں۔

پانی کی بے رحم موجوں کے ساتھ بہتا اپنی دسترس سے دور، بہت دور جاتا دیکھ رہی تھیں۔ ان کا دل نیچے ہی نیچے بیٹھتا جا رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے سے کئی لوگ ٹوٹے درختوں پر چڑھے، تختوں اور بھینسوں سے لپٹے اپنی اپنی جان بچاتے گزرتے چلے گئے تھے۔ وہ لوگ جو اُن کی ایک جھلک دیکھتے ہی انہیں جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

آج انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر خود کو اور اپنے بال بچوں کو محفوظ مقام پر لے جانے کی سعی میں مصروف تھے۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں گھری، برستے پانی میں بھیگتی سب دیکھے جا رہی تھیں۔ جب ایک تختہ بہتا ہوا اُن کی حویلی کی دیوار کے ساتھ آ لگا تھا۔ اس پر ماسی شیداں، رانی اور انعام سوار تھے۔ جیسے ہی وہ تختہ چھت کے ساتھ لگا، شیداں بے تابی سے چوہدرانی جی کو پکارنے لگی تھی۔ مگر چوہدرانی جی اُس کی منتوں ترلوں کے جواب میں خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھے چلی جا رہی تھیں۔

''وڈی چوہدرانی جی...... آپ کیا سوچ رہی ہیں جی...... چھیتی چھیتی (جلدی جلدی) کریں جی پانی تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آپ کو اللہ کا واسطہ جی...... اس پھٹے (تختے) پر آجائیں۔''

''نہیں شیداں...... تم لوگ جاؤ...... جاؤ تم لوگ محفوظ مقام پر...... میں اپنا پنڈ (گاؤں) اپنی حویلی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا علاقہ ہے یہاں میری حکومت ہے اور میں اپنی حکومت پر کسی اور کو حکمرانی نہیں کرنے دوں گی۔ چاہے وہ پانی ہی کیوں نہ ہو...... تم جاؤ...... جاؤ تم یہاں سے...... میں کہیں نہیں جاؤں گی...... کبھی نہیں جاؤں گی۔'' عجیب بہکا بہکا انداز تھا اُن کا، جیسے شدت غم سے اُن کا دماغ ہی الٹ گیا ہو۔ شیداں اُن کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی۔

''بے جی...... اللہ کے واسطے بے جی...... آپ کو ارم بی بی کی قسم ہے۔ آپ نانی کی بات مان لیں۔ ہمارے ساتھ چلیں بے جی...... ہم آپ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ خدا کے لیے بے جی!'' رانی نے ایکدم تختے سے چھت پر چھلانگ لگائی اور چوہدرانی جی کے سامنے گھٹنوں کے بل گرتی ہوئی ہاتھ جوڑے اُن کی منتیں کرنے لگی تو جیسے ایکدم حواسوں میں لوٹ آئیں۔

''شیداں...... تم بچوں کو اتنے پانی میں لے

کر کیوں آ گئیں اِدھر...... تمہارا گھر تو گاؤں کی آخری حد پر ہے اور وہ محفوظ ٹیلہ تو تمہیں بہت قریب پڑتا تھا۔ پھر تم کیوں کھیل رہی ہو اپنے بچوں کی جان سے......اور وہ بھی میری خاطر...... میں نے تو کبھی بھی تمہیں یا رانی کو کسی قابل سمجھا ہی نہیں، تو پھر کیوں تم لوگوں کو میری جان کی اتنی پروا ہے۔ مرجاتے دوناں مجھے اِسی پانی میں ڈوب کر اپنے غرور سمیت...... کیوں ہو رہی ہے تمہیں ہمدردی میرے ساتھ...... کیوں......؟'' وہ ایکدم جیسے چیخ پڑی تھیں اور اُن کی اس چیخ اس غصے میں بھی اُن کی بے بسی اور مجبوری جھلک رہی تھی کہ اُن کا رابطہ اس وقت ہر کسی سے ٹوٹ چکا تھا۔ فون سروسز بھی معطل تھیں اور گاؤں کا زمینی، فضائی رابطہ بھی ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا۔

''نہ چوہدری جی...... اس طرح نہ کہو...... آپ ہماری مالک ہو اور ہم آپ کے خاندانی ملازم...... ہمارے پرکھوں نے بھی کبھی آپ کو دغا دینے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار ہیں چوہدرانی جی...... آپ کو مشکل میں نہیں چھوڑ سکتے، آپ فکر نہ کریں۔ چھوٹے چوہدری جی اور اُن کے سارے دوستوں کو بند پر پہنچا دیا ہے انعام اور اس کے بابا نے...... اب ہم آپ کو لینے آئے ہیں کیونکہ ہم آپ کے بغیر ادھورے ہیں۔'' شیداں روہانسی ہوتی ہوئی چوہدرانی کو قائل کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

''مالکن جی! آپ کی مہربانی آپ اماں اور رانی کی بات مان لیں اور جلدی سے اس تختے پر آ جائیں۔ میں چھوٹے چوہدری صاحب سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔ آپ مزید مت سوچیں اور ہماری عرض مان لیں۔ آپ کا بڑا کرم ہوگا جی۔'' اب کے انعام نے بھی منت بھرے انداز سے کہا تو چوہدرانی جی نے ہارے ہوئے انداز میں شیداں اور رانی کے ساتھ تختے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

چھت سروں پر نہیں، سب پریشان ہیں
میرے مالک! یہ کمزور انسان ہیں

اور آج چوہدرانی صاحبہ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ کمزور بے بس ہونے کا احساس کیسا جاں گسل ہوتا ہے۔ یہ بے بسی...... یہ بے کسی کس طرح رگوں کو کاٹتی، کس طرح خون نچوڑتی ہے۔ اس اونچے ٹیلے پر اُس سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچ نکلنے والے مفلوک الحال لوگوں کے درمیان بیٹھی وہ اُن جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ بے بس...... بے کس...... مجبور اور مفلوک الحال......

سیلاب کا پانی اتر چکا تھا اور اپنے ساتھ کئی آنکھوں کے خواب، کئی سروں سے چھت اڑا لے گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ جاتے جاتے چوہدرانی جی کی آنکھوں پر پڑے کئی پردے بھی بہالے گیا تھا۔ سارا علاقہ عجیب ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی اور بربادی نے جیسے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جیسے ہی گاؤں سے زمینی رابطہ بحال ہوا، چوہدری صاحبان اڑتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ تمام علاقے کی طرح اُن کے گاؤں میں بھی بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تھی۔ اُن کی کھڑی فصلیں برباد ہو گئیں تھیں۔ گاؤں کا کوئی گھر نہیں بچا تھا اس تباہی سے...... یوں تو مکینوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے گھروں کی مرمت شروع کر دی تھی۔ مگر جیسے ہی چوہدری صاحبان آئے تھے ان تعمیراتی کاموں میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ اور یہ بالکل پہلی بار ہو رہا تھا کہ بڑی

چوہدرائن بھی ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ بے گھر...... ہاریوں، کمیوں، کمینوں کے لیے اپنی حویلی کے ساتھ ساتھ دل کے در بھی وا کر دیے تھے۔

ارم بھی اپنے پاپا اور دادا سمیت گاؤں آ چکی تھی اور بار بار بے جی سے لپٹ کر رو پڑتی تو کبھی رانی اور ماسی شیداں کا شکریہ ادا کرتی نظر آ رہی تھی۔

''بے جی...... جتنے دن آپ اِدھر پانی میں پھنسی رہی، اُدھر ہم لوگ بھی جیسے سولی پر ٹنگے رہے تھے۔ میری حالت تو اس لیے بھی زیادہ بری ہو رہی تھی کیونکہ میں آپ سے خفا ہو کر گئی تھی ناں...... مجھے تو یہ احساس ہی کھائے جا رہا تھا کہ میں آپ سے ناراض ہوئی، آپ کے ساتھ بدتمیزی کی میں نے...... اور پھر آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکی۔ سچ کہتی ہوں بے جی، اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاتی......'' وہ سب اس وقت بے جی کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے۔ ارم نے ایک بار پھر ان سے لپٹتے ہوئے سہمے انداز میں کہا تو بے جی نے بھی اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ حویلی کی تعمیر کا کام کل ہی ختم ہوا تھا۔ گاؤں کے سارے گھر بھی بے جی کے حکم پر چوہدری صاحبان نے خصوصی توجہ دیتے ہوئے اپنے خرچے پر مرمت کروائے تھے اور اب ان لوگوں کی شہر واپسی کی تیاریاں تھیں۔

''ارم پتر! میں تم سے خفا نہیں ہوں بلکہ میں تو خوش ہوں کہ تم نے میرے سوئے احساس کو جھنجھوڑا تو سہی...... ہاں، اُسے جگانے کے لیے واقعی قدرت کی طرف سے یہ سیلابی ریلا آ گیا۔ مگر پہل تو تم نے کی ناں میری بچی...... اور ہاں...... اب تمہیں میرا ایک کام اور کرنا ہے۔'' بے جی نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے ہلکا پھلکا انداز اپنایا تھا۔

''جی بے جی...... حکم کریں۔'' ارمی نے بھی اُن کے ہی انداز میں کہا تھا۔

''ارم پتر! تم رانی کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جاؤ۔ اور اُس کا داخلہ بھی اپنی جامعہ میں کروا دو۔ اِس کو پڑھنے کا بہت شوق ہے ناں اور پھر یہ لائق اور ذہین بھی تو بہت ہے، تو اِس کا حق بنتا ہے کہ یہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ رحمت اللہ پتر، تم رانی کی پڑھائی کا سارا خرچہ اٹھاؤ گے اور پھر اس کی شادی تک کی ذمہ داری بھی تمہاری ہی ہے۔ سمجھے۔'' بے جی نے ارم اور اس کے پاپا کو ایک ساتھ مخاطب کیا تو ارم دنگ ہی رہ گئی۔

''بے جی...... آپ...... اور اتنا بڑا چینج...... یہ سب کیسے ہوا بے جی۔'' اُن کی بات سن کر ارم کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ ری ایکٹ کیسے کرے۔

''ہاں بیٹا...... یہ میں ہی ہوں اور یہ تبدیلی مجھ میں ایسے ہی نہیں آ گئی۔ تمہیں پتا ہے اُس دن سیلاب کا پانی میری اس اونچی حویلی کی چھت تک چڑھ آیا تھا۔ اور ممکن تھا بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی اس میں بہہ جاتی، مگر شیداں اور اُس کی اولاد اپنی جان پر کھیل کر مجھے محفوظ مقام پر لے گئے۔ اور پھر وہاں جو حالات میں نے دیکھے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

وہ سب لوگ جنہیں میں کم ذات، کم ظرف اور چھوٹا سمجھتی تھی اُن کی اعلیٰ ظرفی اُن کے بڑے دل دیکھ دیکھ کر مجھے تو اپنا آپ چھوٹا لگنے لگا۔ دینو کمہار کے دو بچے پانی میں بہہ گئے۔ مگر اُس نے

اپنے پڑوسیوں کے چار بچے ڈوبنے سے بچالیے۔ گامو موچی کی بیٹی کا سارا جہیز پانی بہا کر لے گیا، مگر وہ اس پر اللہ کا شکر گزار ہو رہا تھا کہ اس نے ماکھی ماچھن کی بیٹی کے داج والی پیٹی بہنے نہیں دی۔ میں حیران تھی کہ یہ کس طرح کے لوگ ہیں کون سی مٹی سے بنے، کس ذات کے انسان ہیں کہ اپنا درد بھلائے اپنے آنسو چھپائے دوسروں کے دکھ بانٹ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دلاسے دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کو ہر لحہ تیار ہیں اور اس شدید مشکل میں اس بری حالت میں بھی رب کے شکر گزار ہیں۔ میں سچ کہتی ہوں ان سب کے اس کردار، اس اعلیٰ ظرفی نے مجھ سے میرا غرور ہی چھین لیا۔ مگر یہ شیداں رانی اور اُن کے گھر والے انہوں نے یہاں بھی میری اَنا کا جھنڈا بلند رکھا۔ جیسے ہی امدادی ٹیم کے لوگ وہاں پہنچے یہ خود کشتیوں اور ہیلی کاپٹروں میں بیٹھنے سے پہلے ہمیں مجبور کرنے لگے کہ ہم اِدھر سے پہلے نکل جائیں، کیونکہ ہمیں اس طرح بے سروسامان رہنے کی عادت نہیں۔ مگر ہمارا ضمیر گوارا نہ کیا...... نعمت اللہ نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا اور یوں بچوں اور عورتوں کو پہلے وہاں سے نکالا گیا۔ پھر گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم وہاں سے نکلے۔ اور اسی لیے میں نے تمہارے دادا جی سے کہہ دیا تھا کہ پہلے میرے گاؤں کے ہر گھر کی مرمت ہوگی۔ سب بچیوں کا جہیز جو سیلاب بہا لے گیا تیار ہوگا، اُن کی شادیوں کا بندوست ہوگا۔ جن لوگوں کے مال ڈنگر بہہ گئے۔ گھر نہ رہے پہلے اُن کی مدد ہوگی اور پھر میری حویلی کی مرمت اور رنگ و روغن کروایا جائے گا۔''

''اچھا...... تو اسی لیے آپ نے پاپا چاچو اور دادا جی کو شہر نہیں جانے دیا اور اسی لیے حکومتی امداد آنے سے پہلے ہی ہمارے گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا۔'' ارم نے بے ساختہ خوش ہوتے ہوئے کہا۔ تو وہ کھل کر مسکرا دیں۔

''ہاں پتر......! جب اللہ نے ہمیں توفیق دے رکھی ہے اور ہمیں اس گاؤں کا مالک اور زمیندار بنایا ہے تو پھر اپنے لوگوں کی مدد بھی ہمیں خود ہی کرنی ہے۔ آخر ہم کب تک اپنے چھوٹے بڑے ہر کام کے لیے حکومت کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں اگر ہر گاؤں، ہر تحصیل اور ہر اُس جگہ جہاں ایسی ناگہانی تباہی آتی ہے دس بارہ ہمارے جیسے پاور اور پوزیشن رکھنے والے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آگے بڑھ کر اپنے لوگوں کی مدد خود کرنے لگیں تو پھر ہمیں کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اگر ہم اپنا کام خود وقت پر کرنے لگیں تو دوسروں سے شکایات بھی ختم ہو جائیں گی۔'' چوہدری حشمت اللہ نے اپنی بیگم کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا تو سب قائل ہو گئے۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ابا جی...... ہم نے تو شروعات کر دی ہیں۔ اب اللہ کرے کہ دوسرے لوگ بھی ہماری تقلید کریں۔ اور اللہ ہمیں بھی ہمت دے کہ ہم اس روشنی کو پھیلانے والوں میں شمار ہو جائیں۔'' نعمت اللہ کی بات پر سب نے یک زبان ہو کر 'آمین' کہا تو بے جی مطمئن سی مسکرا دیں۔ کہ اُن کو یقین ہو چکا تھا کہ اُن کی آنے والی نسلوں میں وہ ظرف ضرور ہوگا جو کہ اس خلوص اور محبت کی روشنی کو پھیلانے کا سبب بنے گا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عمران مظہر

زندگی گلابوں کی کیاری

''مہک یہ کمرہ آج سے تمہارا ہے۔ دیکھ لینا ہر چیز مکمل ہے یا نہیں کچھ کمی بیشی رہ گئی ہو تو معاف کر دینا۔ آج کی رات تمہاری ہے۔ اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے۔'' یہ کہتے رابعہ نے مہک کو گلے لگایا اور جانے کے لیے مڑی تھی تبھی......

احمد کی دوسری شادی کرنے کی بات سن کر جہاں ہاجرہ بیگم کی سماعتوں پر بم پھٹ پڑا تھا۔ وہیں رابعہ نے اِن الفاظ کی تلخی کو بغیر کسی تاثر کے حلق کے نیچے اُتارا تھا۔ وہ کسی بے جان بُت کی طرح دونوں ماں بیٹے کو تکنے گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو تم احمد...... دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ جانتے بھی ہو کیا اول فول بک رہے ہو۔ ارے کچھ خیال بھی ہے خاندان کی عزت کا، لوگ کیا کہیں گے۔

ابھی پہلی شادی کو ہی سال بھر نہیں ہوا اور جناب دوسری بار گھوڑی چڑھنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ کان کھول کر سن لے احمد دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں بخشوں گی اگر ایسی ویسی کسی بھی حرکت کے بارے میں سوچا بھی۔'' ہاجرہ بیگم بیٹے پر تلملا کر چیخ پڑی تھیں۔

''خدا کے لیے امی...... خدا کے لیے بس کریں۔'' احمد نے جھنجلا کر سر تھام لیا اور پہلی بار ماں کے سامنے بول اٹھا۔

''آپ کی انہی باتوں نے پچھلی بار مجھے کمزور کر دیا تھا جبکہ آپ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ میں مہک سے پیار کرتا تھا۔ پر آپ نے زور زبردستی کر کے مجھے ایک غلط فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

آپ جیسی مائیں ہوتی ہیں جو اولاد کو مجبوریوں کے نام پر بلیک میل کر کے کتنی ہی زندگیوں سے کھیل جاتی ہیں۔ کون خوش ہے آج؟ بتائیں مجھے؟

میں، رابعہ یا پھر مہک؟ کوئی بھی خوش نہیں ہے امی کوئی بھی نہیں بس ایک آپ ہیں جو اپنی خود ساختہ خوشیوں کے محل بنا کر تین تین زندگیوں کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔

آپ نے ظلم کیا ہے امی...... مجھ پر، مہک پر اور رابعہ پر بھی۔

کیا قصور تھا مہک کا؟ کہاں جائے آج وہ؟ بتائیں مجھے؟ وہ میں ہی تھا آپ کا بیٹا جس نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اُسے سبز باغ دکھائے تھے اور پھر اپنی خودغرضی میں اُسے اکیلا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس بے چاری نے نہ تو مجھ سے کوئی سوال کیا اور نہ ہی کوئی گلہ پر میرا ضمیر مجھے ہر لمحہ کچوکے لگاتا ہے کہ میں مجرم ہوں مہک کا بھی اور رابعہ کا بھی۔ ضمیر کی خلش میں، میں کبھی رابعہ کا نہیں ہو پاؤں گا امی اور یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے...... صرف آپ کی وجہ سے...... پر اس بار آپ جو بھی کہہ لیں میں فیصلہ کر چکا ہوں۔''

یہ کہتے ہی احمد گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

احمد کا پہلی بار یوں بے باکی سے بولنا ہاجرہ بیگم کو حیران کر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑا کر پاس پڑی چارپائی پر ڈھے سی گئیں اور رابعہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

احمد کمال متوسط طبقے کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھی جاب پر فائز تھا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہی مہک سے محبت کرتا تھا۔ اُس نے مہک سے ہزاروں

وعدے کیے تھے۔ لیکن جب ہاجرہ بیگم نے احمد کی جاب لگنے کے بعد اُس کے سر پر سہرا سجانے کا سوچا تو رابعہ ہی اُن کی منظورِ نظر ٹھہری۔ رابعہ جو اُن کے پڑوس میں رہتی تھی۔ پڑھی لکھی، سمجھدار اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ اُس کی انہی خوبیوں کی ہاجرہ بیگم دیوانی تھیں۔

احمد نے ماں کو مہک کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ لیکن ہاجرہ بیگم کسی طور نہ مانی تھیں اور اپنی کر کے ہی چھوڑی تھی۔

احمد نے ماں کے دباؤ میں آ کر رابعہ سے شادی تو کر لی تھی لیکن پہلے دن سے ہی وہ رابعہ کو قبول نہیں کر پایا تھا اور ہمیشہ اُس سے فاصلہ کیے رہتا اور اب شادی کے چھ مہینے بعد ہی احمد نے ماں کے سامنے مہک سے شادی کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مرد ایک بار تو ممتا کے دباؤ میں جھک سکتا ہے۔ لیکن بار بار اُسے نہیں جھکایا جا سکتا۔ یہ بات ہاجرہ بیگم اچھی طرح جانتی تھیں اسی لیے پریشان تھیں۔

اگلی صبح ہاجرہ بیگم صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ جب رابعہ چائے کا کپ لیے اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُسے گم صم بیٹھا دیکھ کر ہاجرہ بیگم کو ذکر کرنا بھول گیا اور اُن کا دل ہولنے لگا۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

''ہائے کیا جادو کر دیا اُس مہک نے میرے بیٹے پر، کم بخت اُسے بھولتا ہی نہیں۔ شادی ہو گئی نگوڑے کی پر اُس مہک سے پیچھا چھڑا ہی نہیں پا رہا۔ ہائے کیا ہوگا میرے بچے کا۔''

اُن کی بات سن کر رابعہ نے اپنا چہرہ اُن کی طرف کیا۔ اُس کے چہرے پر جامد سنجیدگی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ دھیمے ٹھہرے لہجے میں گویا ہوئی۔

''امی...... ٹھیک ہی تو کہتے ہیں وہ، انہیں خوش رہنے کا حق ہے۔ مذہب، اجازت دیتا ہے انہیں...... وہ کوئی دنیا سے انوکھا کام تو نہیں کر رہے اور پھر اچھا ہے ناں مہک کی زندگی سنور جائے گی۔''

اُس کی بات سُن کر ہاجرہ بیگم کو کچھ ہوا تھا کیا؟ یہ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھیں۔ انہوں نے فوراً سینے پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔

''یہ تو کہہ رہی ہے رابعہ؟ جانتی بھی ہے کیا کہہ رہی ہے؟ پگلا گئی ہے کیا؟ اُس منحوس کی زندگی تو سنور جائے گی پر تیری زندگی کا کیا ہوگا؟ کچھ اندازہ ہے تجھے؟''

''ہاں امی...... ہر بات کا اندازہ ہے۔ تبھی تو کوئی افسوس کوئی دکھ نہیں ہو رہا مجھے...... اَن چاہی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور اگر اُن کا ساتھ دینے سے اُن کے دل میں میری تھوڑی سی جگہ بھی بن گئی تو زندگی کٹ جائے گی۔ میں خوش ہوں اُن کے فیصلے سے، رابعہ نے آخری جملے پر مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا تھا۔ ہاجرہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆......☆......☆

شام کے دھندلکے چارسُو پھیل رہے تھے۔ ہاجرہ بیگم کا من اندھیرے میں کڑکتی بجلی کی طرح کوندیاں مار رہا تھا۔ رابعہ اپنے دل کے مندر میں دیا جلائے احمد کے پاس آئی تھی۔

''احمد آپ مہک کے ابا سے شادی کی تاریخ لے لیں۔ امی کو میں راضی کر لوں گی آپ بس پریشان مت ہوں۔'' احمد نے سر اُٹھا کر بے یقینی سے اُسے دیکھا وہ مسکرا اٹھی۔

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' احمد کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''سچ نہ کہہ رہی ہوتی تو آپ کے پاس آتی۔
آپ بس تیاری کریں۔ میں کل بازار جا کر مہک کے لیے سارا سامان وغیرہ لے آؤں گی۔ آپ کسی چیز کی فکر نہ کریں آپ بس تاریخ لے لیں۔''
رابعہ ایک عزم سے بولی تھی۔
احمد اُس کی بات سن کر خوش ہوا تھا اور اُسے 'تھینک یو' کا بے معنی لفظ بول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
اگلے دن جہاں احمد ہواؤں میں اڑ رہا تھا کہ اُسے مشکلوں سے ہی سہی مہک سے شادی کی تاریخ مل گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے مہک کے ابا کو راضی کیا تھا۔ وہیں رابعہ بازاروں کے چکر کاٹ رہی تھی۔
اُس نے ایک ہی دن میں مہک کے شادی کے جوڑے سے لے کر اُس کی ضرورت کی ہر چیز لے لی تھی۔ ہاجرہ بیگم دونوں میاں بیوی کے کارنامے خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔
اُن کا دل ہول رہا تھا کبھی وہ اِس سب کے لیے خود کو ملامت کرتیں کبھی اپنے بیٹے کو اور کبھی مہک کو، پر اِس سب میں جو چیز اُن کے من کی دنیا تہہ و بالا کر دیتی وہ رابعہ کی خاموشی تھی۔
اُس کی لگن تھی جو وہ اِس معاملے میں دکھا رہی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ یہ لڑکی ہے کیا؟ اور جب وہ رابعہ کو دیکھتیں انہیں لگتا اُن کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔
رابعہ سونا تھی، بدنصیب تو اُن کا بیٹا تھا جو اِس گوہر کو ٹھکرا کر خدا کی ناشکری کر رہا تھا۔
اُس شام بھی وہ تخت پر بیٹھی یہی سب سوچ رہی تھیں جب احمد آہستہ سے اُن کے پاس آیا تھا۔
''امی پرسوں عشاء کے بعد نکاح ہے۔'' اُس نے نظریں چراتے بہت دھیمے سے ماں کو بتایا تھا۔
ہاجرہ بیگم نے ترحم آمیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور بولیں۔
''گناہ کر رہا ہے تُو احمد...... مذہب مرد کو جتنی بھی شادیوں کا حق دے دے پر اتنا ہی حق اُن عورتوں کا بھی رکھتا ہے جو مرد کی تیار کردہ اِس سولی پر چڑھتی ہیں۔
کیا جواب دے گا کل خدا کو؟ تجھے نظر نہیں آتا رابعہ کا ایثار اُس کی خاموشی اُس کی قربانی تجھے نہیں دکھتی۔ تیرے دل میں رحم نہیں آتا اُس معصوم پر......
ارے گناہ مجھ سے ہوا ہے تُو تو مجھے ہی سزا دے دے پر اُس فرشتہ صفت پر یہ ظلم نہ کر، اُس کے حق میں پکڑا جائے گا تُو، کل جب اُس مہک کے ساتھ تُو زندگی کی خوشیوں کے مزے لوٹ رہا ہوگا اُس بے چاری کا کیا ہوگا۔ کبھی سوچا بھی ہے تُو نے؟''
احمد ماں کی باتیں سن کر چڑ گیا اور جھنجلا کر وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اُس کی بے حسی دیکھ کر ہاجرہ بیگم نے دوپٹہ منہ میں لیا اور سسکیاں بھرنے لگیں۔
اور پھر دو دن بعد ہی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد میں ہی کچھ لوگوں کی موجودگی میں احمد کا نکاح پڑھوایا گیا۔ وہ مہک کو پا کر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔
سفید کرولا میں احمد مستقبل کے خواب بُنتا مہک کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اپنی وفاؤں کے یقین اور وعدے دیتا اُس نے مہک کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی کا رُخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔
دوسری طرف رابعہ نے اپنے تئیں گھر کو سجا رکھا تھا۔ ہاجرہ بیگم ایک کونا پکڑے گم صم سی بیٹھی

تھیں۔ صحن میں محلے کی چند عورتیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں جب باہر شور بلند ہوا تھا۔ گاڑی کے ہارن نے بتا دیا تھا کہ دلہا دلہن تشریف لا چکے ہیں۔

ہارن سنتے ہی سب دروازے کی طرف بھاگے تھے۔ رابعہ سب سے آگے تھی اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے احمد مہک کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔

مہک نے رابعہ کے چہرے کی طرف اور رابعہ نے مہک کی طرف...... چند ثانیے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ مہک کی آنکھوں میں ایکدم سے نمی تیر گئی۔ وہ فرطِ جذبات میں رابعہ کے گلے لگ پڑی۔

''مجھے معاف کر دینا۔'' اُس نے آہستہ سے رابعہ کے کان میں کہا تھا۔ رابعہ نے اُسے خود سے الگ کیا۔ اپنے ہاتھ کی انگلی کی پور سے اُس کے آنسو صاف کیے اور اُس کا ہاتھ تھام کر گھر کے اندر لے آئی۔

شادی کے محدود ہنگاموں سے جب فراغت ہوئی تو رابعہ نے مہک کو دھیرے سے صوفے سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے آئی۔

''مہک یہ کمرہ آج سے تمہارا ہے۔ دیکھ لینا ہر چیز مکمل ہے یا نہیں کچھ کمی بیشی رہ گئی ہو تو معاف کر دینا۔ آج کی رات تمہاری ہے۔ اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے۔'' یہ کہتے رابعہ نے مہک کو گلے لگایا اور جانے کے لیے مڑی تھی تبھی مہک نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں رابعہ آج کی رات میری نہیں تمہاری ہے۔ میں نے احمد سے شادی کی حامی صرف اس شرط پر بھری تھی کہ تمہیں تمہارے کسی حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ آج احمد تمہارے پاس رہے گا۔''

''پر...... وہ......'' رابعہ یہ سن کر بوکھلا گئی تھی لیکن مہک نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ تبھی احمد کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دونوں نے احمد کی طرف دیکھا۔

''احمد آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟'' مہک نے ایک مان سے احمد سے سوال کیا۔ احمد نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور پہلی بار رابعہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

☆......☆......☆

اوں ہوں رابعہ......'' مہک نے اُس کے آنسو صاف کیے۔

''یہ مت سمجھو کہ تم پر ترس کھایا جا رہا ہے۔ نہیں تمہیں تمہارا حق دیا جا رہا ہے۔ تم چاہتیں تو حق چھین بھی سکتی تھیں پر تم نے اتنی بڑی قربانی دی بھی تو کس کے لیے اور کیوں؟ احمد کو تمہیں حق دینا ہو گا۔

وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہم سوکنیں نہیں بہنیں بن کر دکھائیں گی انشاءاللہ......

یہ کہتے ساتھ ہی مہک رابعہ کو کمرے میں احمد کے ساتھ چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی سب سنتی ہاجرہ بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُن کے لیے یہ تمام تجربات نئے تھے۔

کتنے روپ ہیں عورت کے؟ عورت واقعی قربانی کا دوسرا نام ہے...... وہ رابعہ یا مہک کی جگہ ہوتیں تو کیا وہ یہ سب کر پاتیں جو اُن دونوں نے کیا؟ یہ سب سوچتے اُن کا دل اس بات پر آسودہ تھا کہ اُن کے گھر میں ایثار کے گلاب ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

☆......☆......☆

افسانہ

سید عبادت کاظمی

عشق اک روگ

ہمارے فرسٹ سمسٹر کے ایگزام قریب تھے سر کبیر نے اسائمنٹ دی تھی جو کہ اس ویک اینڈ تک جمع کروانی تھی جو کہ لڑکوں میں سے مجھے اور گرلز میں سے افزا قیوم کے حصے میں آئی تھی۔ پلانٹ فزیالوجی اتنا مشکل ٹاپک نہیں تھا میں نے گوگل کی مدد......

''تو تمہارے مطابق مجھے تم سے نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے لیکن تم میری لگتی کیا ہو؟''میں نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔

''پتہ ہے احزام تم نے کبھی ڈوبتے ہوئے

سورج کو دیکھا ہے جب وہ ڈوب رہا ہوتا ہے تو آسمان پر سرخ ڈوریاں نمودار ہونے لگتی ہیں یہ اُس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ تکلیف میں ہے تمہاری محبت میں میرا بھی شاید ایسا ہی حال ہے۔ میں بھی ڈوبنے لگی ہوں۔ لیکن تمہیں کیا فرق پڑتا ہے احزام...... ''اُداسی اُس کی آنکھوں میں ٹپکنے لگی۔

''میں شاید کچھ ضرورت سے زیادہ تم سے امید لگا بیٹھی لیکن اِس میں بھی میرا ہی قصور ہے۔'' فائلوں کو سینے سے لگائے تھکے تھکے قدموں سے وہ باہر نکل گئی آج سے پہلے اُسے اتنا ناامید نہیں دیکھا تھا میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''میں احزام خیام حیدر کا اکلوتا بیٹا شاہ انڈسٹریز کا اکلوتا مالک ہزاروں لڑکیاں میری خوبصورتی میری وجاہت پر مرتی تھیں لیکن میں لڑکیوں سے سخت الرجک تھا۔ انسان کو اس چیز کی طلب ہوتی ہے جو اُس کی دسترس سے دور ہو۔ میرے پاپا بہت بڑے بزنس مین تھے اور اُن کے پاس میرے لیے بالکل ٹائم نہیں ہوتا تھا۔ ماما اپنی پارٹیز میں مصروف رہتی تھیں۔ پشاور یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن سراسر میری قابلیت پر ہوا تھا کیونکہ پڑھائی میں، میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتا تھا یہاں سب مجھے معمول کے مطابق لگا۔ لڑکیاں میری چارمنگ پرسنالٹی سے متاثر تھیں۔ میں باٹنی میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ دس سے بارہ بجے تک ہماری کلاسز ہوتی تھی۔ سر کبیر کی کلاس ختم ہونے کے بعد میں گھر کی طرف جا رہا تھا آج طبیعت کچھ ڈل سی تھی باقی کلاسز کا موڈ نہیں تھا۔ مین گراؤنڈ سے گزرتے ہوئے میں نے تین لڑکیوں کو دیکھا جو کسی بات پر بہت زوروں سے بحث کر رہی تھیں۔ میں اُن کے پاس سے گزرنے لگا اچانک اپنا نام سن کر میں فطری تجسس کے تحت رُک گیا۔

''پتہ نہیں منزہ تم لوگ ظاہری خوبصورتی پر کیوں مرتی ہو میں مانتی ہوں احزام حیدر خوبصورت ہوگا لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم لوگ میرا سر کھاؤ ہاں وہ ٹیلنٹڈ ہے ظاہری حسن تو وقت کی میراث ہے۔'' میں نے دھیان سے دیکھا۔

''وہ تین لڑکیاں تھیں ایک کچھ نوٹس لکھ رہی تھی سلیقے سے اوڑھا گیا دوپٹہ اُسے سب سے منفرد بنا رہا تھا کچھ سوچ کر میں اُن کی طرف چلا گیا۔

''ہیلو......'' میں نے قریب جا کر کہا۔

''دوسری دو لڑکیاں مجھے دیکھ کر اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔

''ہیلو......'' انہوں نے کہا۔ لیکن وہ دوسری لڑکی کے چہرے پر حیرانگی تھی لیکن وہ بیٹھی اپنے کام میں مگن رہی۔

''ہیلو مس......'' میں نے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

اُس کے ماتھے پر شکن سی آگئی اور اُس نے خشک لہجے میں مجھے کہا۔

''السلام علیکم!'' ایک لمحے کے لیے میں شرمندہ ہوگیا۔ اندرونی غصے پر قابو پاتا میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

پیچھے میں نے آواز سنی شاید وہ دونوں لڑکیاں اپنی دوست کو کہہ رہی تھیں۔

''افزا ایسے تو کوئی نہیں کرتا تم نے بات کیوں نہیں کی اُس سے یہ کیا بدتمیزی تھی۔''

''میں نے اُسے انوائیٹ کیا تھا کیا؟'' اُس نے تڑخ کر جواب دیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے کسی لڑکی نے اگنور کیا تھا مجھے برا لگا تھا۔

اگلے دن مجھے اُس سے زیادہ حیرانگی ہوئی جب کلاس ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔

''بات سنیں احزام!'' اُس نے قریب آ کر کہا۔

''جی......'' میں نے حیرانگی چھپا کر کہا۔
''اصل میں کل کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں میں تھوڑی اَپ سیٹ تھی۔'' اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
میں اُسے بس ''اِٹس او کے'' ہی کہہ سکا۔
کچھ دن گزرے اب ہم ایک دوسرے سے بات کر لیتے تھے۔ افزا قیوم کا تعلق مانسہرہ سے تھا اُس کے ماں باپ ایک خاندانی دشمنی کی زد میں قتل کیے گئے تھے وہ اپنی پھوپو کے ساتھ رہتی تھی۔
ہمارے فرسٹ سمسٹر کے ایگزام قریب تھے سر کبیر نے اسائنمنٹ دی تھی جو کہ اس ویک اینڈ تک جمع کروانی تھی جو کہ لڑکوں میں سے مجھے اور گرلز میں سے افزا قیوم کے حصے میں آئی تھی۔
پلانٹ فزیالوجی اتنا مشکل ٹاپک نہیں تھا میں نے گوگل کی مدد سے دو دن میں اسائنمنٹ بنالی تھی۔
سر کبیر کی عادت تھی کہ وہ دونوں کا موازنہ کرتے، اُس دن انہوں نے افزا کی اسائنمنٹ کو بہترین قرار دے دیا مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں پی گیا مجھے اب افزا قیوم سے چڑ ہونے لگی۔ وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی لیکن اُس کی سادگی اور رکھ رکھاؤ اُس کی شخصیت کو الگ بناتی تھی۔
فرسٹ رزلٹ آیا تو اُس کے 4GB اور میرے 39 تھے وہ پھر مجھ سے جیت گئی تھی چونکہ سر نے کلاس میں ہی نمبر بتائے تھے میں یکدم سے اُٹھ کر باہر چلا گیا وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی میرا دل یکدم سے اُچاٹ ہو گیا تھا میں گھر چلا آیا۔
دو دن میری طبیعت خراب رہی میں یونیورسٹی نہ جا سکا۔ دو دن کے بعد میں گیا افزا بے چینی سے میری منتظر تھی۔
''آپ دو دن نہیں آئے کیوں احزام خیریت تو تھی ناں...... آپ کو پتہ ہے کتنے اہم لیکچر آپ نے مس کر دیے۔'' اُس کی تشویش مجھے

حیرانگی میں مبتلا کر گئی۔
''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''اب کیسے ہیں آپ؟''
''ٹھیک ہوں۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا اور کینٹین کی طرف بڑھ گیا۔
''افزا قیوم تو تم بھی مجھے پسند کرنے لگی ہو میں نے سوچا اب آئے گا نہ مزہ......''
اب میں اُسے اگنور کرنے لگا۔ شاید وہ میرے رویے سے پریشان تھی میں اُسے خود سے بات کرنے کا موقع تک نہیں دے رہا تھا ایک دن میں لیبارٹری گیا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔
شاید اُس نے محسوس کیا کہ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ وہ میری طرف آئی۔
''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''
''بیٹھ جائیں کونسی میرے باپ کی کرسی ہے۔'' میں نے بدتمیزی سے کہا۔
''آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔'' اُس نے شکوہ کیا۔
''پتہ ہے احزام کبھی مجھے محبت پر یقین نہیں تھا میں ان سب کو کتابی باتیں قرار دیتی تھی۔ پر اب جس دن آپ نہیں ملتے مجھے ایسا لگتا ہے میرے اندر سناٹے گونجتے ہوں۔ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟''
''تو تمہارے خیال میں مجھے تم سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے، لیکن کیوں......؟'' میں نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔
''نہیں میں یہ نہیں کہتی۔'' اُس نے اُداسی سے کہا۔
''پتہ ہے احزام تم یہ سب کر سکتے ہو کیونکہ تم نے کبھی محبت نہیں کی۔

''تم نے کبھی ڈوبتے سورج کو دیکھا ہے احزام جب وہ ڈوب رہا ہوتا ہے تو آسمان پر سرخ ڈوریاں نمودار ہو جاتی ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تکلیف میں ہے تمہاری محبت میں میرا بھی ایسا حال ہے میں بھی ڈوبنے لگی ہوں۔ لیکن تمہیں کیا فرق پڑتا ہے احزام......'' اُداسی اِس کی آنکھوں میں ٹپکنے لگی۔
یہ سب کہہ کر وہ چلی گئی لیکن میں اب تک اُس کے الفاظ کی بازگشت میں تھا۔
''فرق پڑتا ہے افزا قیوم...... اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے بلکہ اس لیے کہ تم میری سب سے بڑی حریف ہو اب تم سے جیتنا مشکل نہیں۔'' میں نے سوچا۔
دوسرے سمسٹر کے پیپر شروع تھے لیکن وہ مجھے بہت کم دکھائی دیتی تھی ایک دن فائنل ایئر کے ایک لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ افزا قیوم اب میرے ساتھ دکھائی نہیں دیتی تو میں نے بڑے کروفر کے ساتھ جواب دیا۔
''میں نے اُسے ریجیکٹ کر دیا ہے چار دن ساتھ کیا رہا محترمہ مجھ سے محبت کرنے لگی اب احزام حیدر کے اتنے برے دن بھی نہیں آئے کہ افزا قیوم سے محبت کرے۔''
یہ کہہ کر میں جیسے مڑا پتھر کا ہو گیا کیاری کے پاس کھڑی افزا مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اُس کے بارے میں ایسی بات کر سکتا ہوں۔
اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں بس وہی اک نظر تھی جب مجھ پر ادارک ہوا کہ افزا سے بہت محبت کرتا ہوں۔
ایک شکایتی نگاہ مجھ پر ڈال کر وہ چلی گئی۔
اُس وقت میں یعنی احزام حیدر جیسے پاتال میں

گرتا چلا گیا۔

بار بار اُس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں کیا نہیں تھا مجھے افسوس ہونے لگا۔

کل ہمارا آخری پیپر تھا لیکن افزا کہیں نہ دکھائی دی دوسرے سمسٹر کا رزلٹ آ گیا میں ٹاپ پر تھا لیکن وہ رہ گئی تھی عجیب بات تھی کہ مجھے اپنی جیت پر کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔

دو ہفتوں سے زیادہ وقت گزر گیا تھا وہ نہ آئی تھی مجھے اُس سے سوری کہنا چاہیے۔

میں اُس کے ہاسٹل گیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔

میں اُس کی دوست منزہ سے ملا۔ پہلے تو اُس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا لیکن پھر میرے بہت اسرار پر وہ مجھ سے ملنے پر رضا مند ہوئی۔

''احزام بھائی وہ بہت خوبصورت دل کی مالک تھی آپ نے اُسے توڑ دیا وہ بہت دل برداشتہ تھی اپنے گاؤں چلی گئی ہے۔''

''وہ منزہ تم مجھے اُس کا کوئی نمبر دے سکتی ہو۔''

''اُس کا کوئی نمبر نہیں۔ لیکن آپ اُس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔''

''کیونکہ مجھے لگتا ہے میں غلطی پر تھا۔''

''تو اب آپ اپنی غلطی سدھارنا چاہتے ہیں۔''

''اس ویک اینڈ پر میں اُس کے گھر جاؤں گی آپ آ سکتے ہیں حالانکہ اُس نے مجھے منع کیا ہے۔''

میں منزہ کے ساتھ ویک اینڈ پر اُس کے گھر گیا محض چند دنوں میں وہ کملایا ہوا پھول لگ رہی تھی۔

مجھے لگا تھا کہ شاید وہ مجھے دھتکارے گی لیکن اُس نے عزت احترام کے ساتھ ہمیں بٹھایا۔

میں اُس کے ساتھ بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہا تھا کہ اُس کی پھوپو اندر داخل ہوئیں۔

''اچھا ہوا بیٹا تم لوگ آ گئے میں اس سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ اپنے دوستوں کو تو بلا لو پہلے مانتی نہیں تھی شادی کے لیے اب جب ہو رہی ہے خاموش سی ہے اب میں کہاں تک دیکھوں اکیلی جان ہے۔'' اُن کے الفاظ تھے یا کوئی پگھلا ہوا سیسہ جو میرے اندر اترتا چلا گیا۔

''آپ فکر نہ کریں پھوپو عمر میری ظاہری شخصیت پر نہیں جاتے انہیں میرے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔'' مجھے لگا کہ جیسے اُس نے مجھے جتایا ہو۔

''ایک تو تم شادی کر کے اتنی دور چلی جاؤ گی اب یہ سب کچھ تمہارا ہے بیٹا۔'' اِس کی پھوپو نے کہا۔

''مبارک ہو افزا......'' میں نے بمشکل کہا۔

''شکریہ......'' اُس نے رسماً کہا تھا اس دوران منزہ خاموش بیٹھی رہی تھی۔

پتہ نہیں بعد میں اُس نے افزا کو کچھ بتایا ہو یا نہیں مجھ سے پھر ٹھہرا نہ گیا۔

بساطِ زندگی پر افزا قیوم مجھے سب سے بڑی مات دے گئی تھی وہ مجھے عشق کا روگ لگا گئی تھی جس کا کوئی علاج نہیں وہ شادی کر کے دوبئی چلی گئی۔ میں احزام حیدر اپنی ساری خوبصورتی کو پسِ منظر میں چھوڑ کر اب جیسے زندگی کو گزار رہا ہوں میری زندگی اُس پرندے کی مانند ہو گئی ہے۔ جس کا آشیانہ آندھی سے اُڑ جائے تو وہ دربدر بھٹکتا ہے۔ میں نے اُس کی اَنا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ مجھے ایسی ٹھوکر لگا گئی تھی جس کا زخم وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے یہ سب میرا بویا تھا جو میں کاٹ رہا تھا کبھی کبھی اُس کی یاد آتی ہے تو زندگی کے رموز اوقاف اُلجھ کے رہ جاتے ہیں یہ کیسے روگ ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔

☆☆......☆☆

افسانہ

فصیحہ آصف خان

شکستِ فاش

سیما حیران تھی کہ گھر میں جوان بیٹی ہے اور فرید کا یوں کھلے عام گھومنا نہ پردہ، نہ رازداری، جیسے وہ گھر ہی کا فرد ہو۔ سیما کی ساس کو برا تو بہت لگا مگر وہ حماد کی برین واشنگ کر چکی تھی۔ چونکہ حماد ہی گھر کا سربراہ تھا۔ سُسر تو کب کے فوت ہو چکے تھے۔ بزنس اچھا جا رہا تھا۔ سو حماد نے......

گرم اُبلتی چائے کپوں میں ڈال کر لوازمات سے سجی ٹرے میں رکھ کر سیما ڈرائنگ روم کے دروازے تک آ گئی۔

''آ جاؤ...... سیما...... ناصر انکل ہیں۔ اپنے ہی بندے ہیں۔'' میں نے دروازہ ناک کیا ہی تھا کہ اندر سے میرے شوہر حماد کی آواز آئی۔ جس پر میں خاصی جز بز ہوئی۔ حماد جانتے تھے کہ میں اجنبی لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی ہوں پھر بھی......

میں اپنی سوچوں میں غلطاں تھی کہ حماد خود آ گئے اور مجھے اندر لے گئے۔ ٹرے انہوں نے تھامی تو میں نے جلدی سے دوپٹہ کھول کر سینے اور جسم کو اچھی طرح ڈھانپنے کی کوشش کی اور اندر آ گئی۔

سامنے صوفے پر ایک پینتالیس سے پچاس سال کے قدرے آگے سے بال اڑے سر والے مگر پُرکشش ادھیڑ عمر مرد کو بیٹھے دیکھا۔

اسلام علیکم! میں نے انہیں بزرگ سمجھ کر احترام سے کہا تو انہوں نے کھڑے ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دینے لگے۔

''جیتی رہیے، سدا سہاگن رہیے۔'' میں نے دل میں آمین کہا۔

''بیٹھو ناں سیما...... انکل اپنے اس شکار کا بتا رہے ہیں جو انہوں نے ساؤتھ افریقہ کے جنگلوں میں ایک چیتے کا کیا تھا۔ جس میں چیتے نے ان کے کندھے پر حملہ کیا تھا اور اس زخم کے نشان ثبوت کے طور پر آج بھی موجود ہیں۔ حماد انتہائی پُرجوش ہو کر بتا رہے تھے۔

''ارے چھوڑو یار اب تو کئی سال ہو گئے۔'' ناصر انکل کھسیا کر بولے۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں انکل آپ...... آپ اور آپ کے لافانی واقعات تو گویا سرمایہ ہیں، آپ پلیز ان کو قلمبند کریں۔ میں کل ہی آپ کے ساتھ ایک پبلشر کے پاس جاتا ہوں۔ میرے دوست کا بھائی ہے۔ وہ آپ کو ٹھیک سے گائیڈ کرے گا اور آپ کی کتاب بھی شائع کرے گا۔

حماد ان کا حوصلہ و جوش بڑھاتے ہوئے بولے جا رہے تھے۔ اس کے برعکس مجھے شکار اور شکاریات

سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ میں تو ٹی وی پر بھی جانوروں کے شکار دیکھنے سے گھبراتی تھی۔ پھر کچن میں کئی کام میرے منتظر تھے، اتنے میں میری ساس اور چودہ، پندرہ سالہ ندا آ گئے بازار سے......

''ارے واہ ناصر بھائی آئے ہیں۔'' ساس امی خوشدلی سے گویا ہوئیں اور وہیں صوفے پر دھک سے بیٹھ گئیں۔

''انکل پلیز سائبیریا والے ریچھ کے شکار کا واقعہ سنائیں ناں......'' ندا ان کے انتہائی تقریب بیٹھ کر بچوں کے انداز میں ضد کرنے لگی۔ اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ندا کی شرٹ کی فٹنگ میں اس کے جسمانی ابھار واضح ہو رہے تھے، گلے میں محض ایک رومال اٹکا تھا۔ مارے شرم کے میری آنکھیں جھک گئیں۔

''سیما کھانے میں کتنی دیر ہے؟'' ساس امی تھوڑی دیر بعد میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''جی بس تیار ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا اور جھٹ سے باہر آ گئی۔ جبکہ اندر سے ساس امی' حماد اور ندا کے قہقہے بدستور مجھے تکلیف میں مبتلا کر رہے تھے۔ میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ جہاں پر چادر اور چار دیواری کے تقدس کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ حماد کی امی نے مجھے شادی کی ایک تقریب میں دیکھا اور پھر گھر کی دہلیز ہی پکڑ لی۔ حماد خاصے امیر اور ماڈرن لوگ تھے۔

امی ابو مان کے نہیں دے رہے تھے۔ مگر وہ تو جیسے پیچھے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھے میری معصوم صورت،

گھر کا پاکیزہ ماحول، امی کی تربیت، سب باتوں نے مل کر میرا مقدر حماد کے گھر لکھ دیا۔

شادی کے بعد سیما نے جب حماد کے گھر کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا فرید یہاں کا کچن سنبھالتا ہے۔ کئی سال سے، برتن دھونا، صفائی کرنا، باہر کا سودا سلف اس کے ذمے تھا۔ جو سیما کو بے حد ناگوار گزرا۔ فرید ہی اس کے آگے کھانا، چائے رکھتا، برتن سمیٹتا، تب تو دلہنیا تھا۔ وہ آنچل چہرے کے آگے کر لیتی۔ مگر جب کھیر پکوائی کے بعد باقاعدہ کچن سنبھالا تو فرید کا ساتھ اسے گوارہ نہ ہوا۔ تب ایک اچھی خاصی بحث کے بعد اسے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بدلے ایک درمیانی عمر کی عورت کو صبح سے دوپہر تک رکھ کر اس مسئلے کو حل کیا گیا۔

سیما حیران تھی کہ گھر میں جوان بیٹی ہے اور فرید کا یوں کھلے عام گھومنا نہ پردہ، نہ راز داری، جیسے وہ گھر ہی کا فرد ہو۔ سیما کی ساس کو برا تو بہت لگا مگر وہ حماد کی برین واشنگ کر چکی تھی۔ چونکہ حماد ہی گھر کا سربراہ تھا۔ سُسر تو کب کے فوت ہو چکے تھے۔ بزنس اچھا جا رہا تھا۔ سو حماد نے اپنی محبوب بیوی کی بات ماننے میں تامل نہ کیا۔ یوں بھی وہ ایک صلح جو انسان تھا۔ فرید کو اس نے ایک دفتر میں چپڑاسی لگوا کر اُس کا روزگار بحال کر دیا۔

مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔ اس دوران سیما اکثر و بیشتر سنتی رہتی کہ کوئی ناصر انکل آئے بیٹھے ہیں۔ آج اُن سے مڈبھیڑ بھی ہو گئی۔ بلکہ سیما کے لیے پریشانی کے دروازے کھل گئے۔

☆......☆......☆

مغرب کی نماز ادا کر کے وہ فارغ ہوئی تھی کہ سیما کی والدہ کا فون آ گیا۔ ماں سے بات کر کے وہ ہلکی پھلکی ہوگئی اور تیار ہونے لگی۔

حماد بھی تھوڑی دیر بعد آ گئے۔ آج اس نے حماد کی پسند کا سوٹ پہنا تھا۔ حماد نے اُسے پُرشوق نظروں سے دیکھا۔ سیما شرما گئی۔

آج جلدی سے فریش ہو جائیں۔ جناب آپ کی پسند کی ڈش آپ کی منتظر ہے حماد کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی سے تھوڑا گھبرا کر مسکراتے ہوئے سیما نے اسے واش روم کی جانب بھیجا اور خود خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کچن میں آ گئی۔

کھانا کھا کر وہ فارغ ہی ہوئے تھے کہ ناصر انکل کی آمد ہوگئی۔ ماسوائے سیما کے سب کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ جیسے عید کا چاند دیکھ لیا ہو۔ سیما کا ارادہ آج ویک اینڈ کی وجہ سے آؤٹنگ پر جانے کا تھا۔ مگر اب معاملہ کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے سبب وہ شدید کوفت کا شکار ہو رہی تھی۔ کمرے میں آئی تو موڈ آف ہو رہا تھا۔ اتنے میں حماد آ گیا۔

گویا ناصر انکل سے جان چھڑا کر آیا ہے۔ سیما نے یہی قیاس کیا۔

''چلو بھئی......'' وہ گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔

سیما سر ہلا کر بنا کچھ کہے بیگ اُٹھا کر اس کے ہمراہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

ساس امی اور ندا ناصر انکل کے پاس بیٹھی تھیں۔ حماد خود ہی وضاحتی بیان دینے لگا۔ سیما نے محض 'ہوں' کہا۔

اس وقت وہ صرف اور صرف حماد کی قربت اور اُس کی باتیں اپنے درمیان چاہتی تھی۔ حماد نے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا۔ رومان پرور اور دل پزیر سا ماحول یکسر تبدیل ہو گیا۔

سیما پر گاہے بگاہے وہ اِک پیار بھری نگاہ ڈال لیتا۔ سیما کو یہ لمحات جی جان سے عزیز لگ رہے تھے۔

کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم کھانے کے بعد،

تھوڑی سی واک کر کے وہ گھر آ گئے۔ سیما نے اس دوران یہی اندازہ لگایا کہ اگر شریکِ حیات کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہو۔ وہ آپ کے ساتھ خوشگوار رویہ رکھے، آپ کے اور اپنے حقوق و فرائض کا خیال رکھے تو زندگی سمجھوتے سے نہیں، بلکہ محبت کے سہارے بسر ہوتی ہے۔ یوں ایک دلفریب رات اپنے اندر کرنوں کی برسات لیے ان پر سایہ فگن تھی۔

دن اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ ناصر انکل آتے رہتے۔

سیما ان کے آنے پر خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتی۔ جانے کیوں اسے ناصر انکل کی آنکھوں میں عجب خباثت سی محسوس ہوتی تھی۔ شاید...... جو سوائے اس کے کسی اور کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ سیما جتنا نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے دل میں اس بات نے جڑ پکڑ لی تھی کہ ناصر انکل اوپر سے کچھ اور، اور اندر سے کچھ اور ہیں۔

اس دن ندا نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ رات اسے ہلکا سا بخار تھا۔ ساس امی کو کسی کی تقریب کے لیے جانا تھا۔ سو وہ ناشتے کے بعد چلی گئیں۔ سیما دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد ندا کمرے سے لاؤنج میں آ گئی اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ اُس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ خاصی کمزور لگ رہی تھی۔ سیما مسکرا کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''ناشتے میں کیا لو گی؟'' کالی جینز پر پیلا کرتا پہنے، دوپٹے سے بے نیاز، سیما کو اُس کا حلیہ دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ پھر وہ روک ٹوک بھی نہ کر سکتی تھی۔

''بس چائے کے ساتھ دو سلائس دے دیں۔'' وہ جمائی روکتے ہوئے بولی۔

اتنے میں ڈور بیل ہوئی۔ صغرا نے آ کر بتایا کہ ناصر انکل آئے ہیں۔ سیما کے چہرے پر بل آ گئے

اس کے برعکس ندا کے بے رونق چہرے پر یکدم قمقمے سے جل اٹھے ان کی آمد کا سُن کر...... وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے خدایا! میں تو بور ہو رہی تھی۔ بھابی پلیز چائے ڈرائنگ روم میں بھجوا دیں، ناصر انکل کے لیے بھی، میں ان سے ان کے شکار کے قصے سن لوں جو ادھورے رہ گئے تھے۔'' ندا بنا سیما کی بات سنے دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں جا پہنچی جہاں ناصر انکل اپنے قصائص سنانے کو بیٹھے تھے۔

سیما چند لمحے میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ پھر کچن میں آ کر اس کا مطلوبہ آرڈر پورا کرنے لگی۔ ذہن تھا کہ اُن دونوں پر ہی اٹکا تھا۔

مرد اور عورت کے اکیلے ہونے پر تیسرا شیطان آن وارد ہوتا ہے۔ پتہ نہیں اس گھر کا ماحول ایسا کیوں ہے؟ اس بات پر کسی کی توجہ ہی نہیں۔

ایک غیر مرد، جس کی بیوی انتقال کر گئی تھی ایک بیٹا باہر کے ملک اور بیٹی دوسرے ملک بیاہی ہوئی تھی۔ اکیلے رہتے تھے اور حماد وغیرہ ان کی تنہائی دور کرنے کے خیال سے انہیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت دیئے ہوئے تھے۔

''اُف میں کیا کروں؟'' سیما کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

صغرا اپنا کام کر رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آوازیں سیما کے کانوں میں آتی رہیں۔ جو سیسہ پگھلانے کے مترادف تھیں۔

گھنٹے بعد ساس امی بھی آ گئیں اور وہ بھی ڈرائنگ روم میں براجمان ہو گئیں۔ صغرا کی مدد سے سیما نے کھانا بھجوا دیا اور خود غسل کے ارادے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ دماغ تھا کہ کھول رہا تھا۔ عجب واہموں میں گھرا تھا۔

نماز ادا کر کے قدرے سکون ملا۔ حماد سے کیا

بات کرتی۔ محض شک اور وسوسوں کی بنیاد پر، سو فی الحال خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

☆......☆......☆

''یہ بس بھی آج ہی خراب ہونی تھی۔ حماد اس وقت آفس میں مصروف ہوتا تھا اور گھر سے خاصا دور اور ندا کا سکول بھی اچھا خاصا دور تھا۔ میں ناصر بھائی سے کہتی ہوں کہ وہ ندا کو اسکول سے لے آئیں۔'' ساس امی نے خود ہی سوال و جواب کیے اور ناصر انکل کو فون کھڑ کا دیا اور مطمئن ہو گئیں۔

سیما دوپہر کے کام سمیٹ کر کمرے میں آ گئی، اس کا کمرہ اوپر تھا۔ وہ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر یونہی باہر دیکھنے لگی کہ آنکھیں ساکت ہی تو رہ گئیں۔

ندا، ناصر انکل کی بائیک سے اُتر رہی تھی کہ یکدم ناصر انکل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی حرکتوں اور آنکھوں سے ہوس صاف ظاہر تھی۔

ندا نے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر انہوں نے کسی شکاری کی طرح شکار اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا، اور مسلسل دبا رہے تھے۔

''تمہارے ہاتھ تو بہت نرم و ملائم ہیں ندا؟'' وہ عجیب آواز و انداز میں بولے تو ندا بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

'' انکل مینی کیور کرواتی ہوں ہر پندرہ دن بعد......'' سیما کو ان کی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔

'' اچھا...... انکل او کے بائے، ہاتھ چھڑا کر معصومانہ انداز میں کھلکھلائی اوپر کی جانب آنے لگی اور ناصر انکل کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کا آئینہ دار لگ رہا تھا سرخ و تپا ہوا۔

سیما کا جی چاہا کہ ان کے سر پر جا کے کوئی بھاری چیز دے مارے اور سب کو اُن کی اصلیت دکھائے۔ مگر کیسے؟ کیا ثبوت تھا اس کے پاس۔ اس کی آواز تو

نقار خانے میں طوطی کے برابر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے شکاری لگات لگائے بیٹھا ہے اور موقع کی تلاش میں ہے۔ سیما اس کے آگے سوچتی تو جان نکلنے لگتی۔ کیا کرے کیا کرے۔ بے بسی سے سوچتی وہ سوچوں میں غوطہ زن تھی کچھ دن اور گزرے۔ موسم بدلا، تو ناصر انکل کو شدید بخار نے آن دبوچا۔

پھر کیا تھا، یہیں سے سوپ، ڈبل روٹی اور پرہیزی خوراک تیار ہو کر جانے لگی کبھی صغرا حماد اور کبھی ساس امی ندا کے ساتھ چلی جاتیں۔

ایک دن حماد زبردستی اسے ان کی عیادت کے لیے لے گیا۔

اب وہ خاصے بہتر تھے۔ سیما کو دیکھتے ہی ایک خاص چمک عود کر ان کی آنکھوں میں کروٹیں لینے لگی اور سیما کے اندر نفرت کی ایک لہر اٹھتی رہی۔

بہروپیا، فراڈیہ، مکار، سیما نے جانے کیا، کیا خطاب و القاب دل ہی دل میں انہیں دیے اور غصہ دبا کر بیٹھی رہی۔

حماد انہیں فروٹ و جوس کھانے پینے کے مشورے دے رہا تھا۔ سیما اوپری دل سے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد سب واپس آ گئے۔

بے چارے اکیلے ہیں۔ ایک لڑکا صفائی کرنے آتا ہے بس، باہر کا کھانا کھا کر ہی تو ان کی یہ حالت ہوئی ساس امی کو ان پر بہت ترس آ رہا تھا۔

سیما خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ جو ماں بیٹا آپس میں کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

شکاری بھی عجیب ہوتا ہے۔ پہلے باریک بینی سے ارد گرد شکار کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے محسوسات دیکھتا رہتا ہے۔ دبے پاؤں، آگے...... بنا آہٹ کے آگے بڑھتا ہے۔

جب بہت قریب پہنچ جاتا ہے تو ایک ہی وار میں اسے دبوچ لیتا ہے اور شکار بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ تب شکاری احساسِ فتح سے چُور چُور دکھائی دیتا ہے۔ اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے پر مطمئن فرحاں وشاداں، ناصر انکل کافی بہتر تھے۔ البتہ کمزوری بہت ہوگئی تھی۔

ندا اسکول سے آکر اکثر و بیشتر ناصر انکل کی خیریت دریافت کرنے انہی کی طرف چلی جاتی۔ ساس امی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا کہ وہ ان کی تنہائی دور کرتی ہے وہ بھی شکاریات کے قصے سنا سنا کر اس کا دل بہلاتے ہیں۔

وہ مطمئن ہو کر کہتیں جبکہ سیما کا دل ڈوبتا رہتا۔

آج بھی ندا کو اسکول سے آئے پندرہ بیس منٹ ہوچکے تھے کیونکہ اس کی بس آکے جا چکی تھی۔ شاید وہ ناصر انکل کی طرف تھی یہ کافی دنوں سے اُس کا معمول تھا۔ سیما نے ساس امی کے کہنے پر ناصر انکل کے لیے سوپ بنایا۔

''چلو سیما ہم انہیں دیکھ آئیں اور سوپ بھی دے آئیں۔'' ساس امی نے دوپٹہ پھیلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ تو سیما نہ چاہتے ہوئے بھی باؤل ڈھک کر ان کے ساتھ ہولی، ان کا پورشن اوپری منزل پر تھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے وہ دروازے تک آگئیں۔ جو کھلا تھا، دستک کیا دینی تھی، دونوں اندر آگئیں۔

عجب پُراسراری سی خاموشی تھی اندر، بیڈ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ دونوں دبے پاؤں آگے بڑھیں، اندر کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔

سیما کے ہاتھ سے باؤل پھسلنے لگا۔ ندا کا بیگ اور دوپٹہ صوفے پر تھے۔ ناصر انکل کے بیڈ پر ندا لیٹی تھی۔ اس کا سر ان کی گود میں تھا۔ ناصر انکل نے اس کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ ندا بس ان کے شکار کے قصے سننے میں محو تھی۔ اچانک ناصر انکل بولے۔

پھر کیا تھا، شکاری یوں جھپٹا، یہ کہتے ہوئے ان کے ہونٹ ندا کے گالوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ساس امی جھٹکے سے آگے بڑھیں اور ندا کو کھینچا۔ دونوں حواس باختہ رہ گئے۔

اس سے قبل کہ ناصر انکل اپنے مذموم ارادے میں کامیاب ہوتے۔ ساس امی ندا کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئیں سب کچھ چشم وزن میں ہوا۔

سیما کے اندر جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ اس نے سوپ کا باؤل میز پر رکھا۔ ندا کا بیگ اور دوپٹہ اٹھایا اور شرمندہ شرمندہ ناصر انکل کے پاس جا کر حقارت سے بولی۔

''ہر شکار اتنی آسانی سے شکار نہیں ہوتا انکل۔

بیٹیوں کی عزت کرنے والی دعاؤں کے لب ابھی اس کی بارگاہ میں قبول ہو رہے ہیں۔ آپ میں ذرا سی بھی غیرت موجود ہے تو آج کے بعد ہمارے گھر کی دہلیز پار نہ کیجیے گا۔ ایک معصوم بچی جو آپ کو باپ کا درجہ دیتی تھی۔ اُس کا مان توڑ دیا آپ نے بلکہ ہم سب کے لیے آج کے بعد آپ بے اعتبار اور ناقابل بھروسہ ہو چکے ہیں۔

شکر ہے کہ ہماری غفلتوں سے بھی پردے اٹھے، آپ کے عمل نے بتا دیا کہ رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ نامحرم کبھی محرم نہیں بن سکتے۔ شرم آنی چاہیے آپ کو، نہ آپ نے اپنی عمر کا لحاظ کیا نہ مرتبے کا، اللہ کا صد شکر کہ اس نے ہمیں بچالیا۔ ورنہ آپ نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

یہ کہتے ہوئے سیما نے ان کی جانب انتہائی نفرت سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ بیڈ پر ناصر انکل سر تھامے اپنی شکست کا ماتم کر رہے تھے کہ شکاریات کے اس دور میں انہیں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نگہت غفار

بہاریں میرے دامن میں

''اچھا یہ بتاؤ تمہاری طلاق کے بعد عدنان نے کبھی تم سے ملنے کی کوشش نہیں کی یا فون پر بات کی؟'' میں نے اُسے چپ ہوتے دیکھ کر سوال کر ڈالا۔ ''آنٹی جی! اب عدنان ایک بار پھر میری طرف بڑھے۔ آنٹی جی، بہت وقت ہوگیا ہے میں امی کو......

آج پورے بارہ سال تین ماہ بعد اپنے اسکول جارہی تھی مجھے ریٹائرمنٹ لیے ہوئے بارہ سال اور تین ماہ ہوگئے تھے اتنے عرصے بعد پھر ایک بار میں نے ویسی ہی تیاری کی جیسے سروس کے دوران کرتی تھی۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ میں اسکول میں ویل ڈریس اور پُروقار، بردبار ٹیچر مانی جاتی تھی۔

جب میں آفس میں داخل ہوتی تب اکثر ٹیچرز کہتیں کہ ہم نے کہہ دیا تھا نگہت باجی آگئیں کوئی بھی پوچھتا تمہیں کیسے پتہ وہ مسکرا کر کہتیں۔ پرفیوم کی خوشبو بتارہی ہے کیونکہ ہمیں چھینکیں آتی ہیں اور میں ہنس پڑتی۔ تمہید کا مطلب یہ ہے کہ آج بھی اس نے لائٹ اسکائی بلو ساڑھی ہم رنگ بلاؤز پہنا ایک ہاتھ میں کنگن اور دوسرے پر گھڑی باندھی ابھی کنگھی کرنے ہی لگی تھی گیٹ بیل چیخ پڑی یا اللہ اب کون آیا مجھے ویسے ہی دیر ہورہی ہے میں جھنجلائی۔

دروازہ کھولا تو پولیو کے قطرے پلانے والی لڑکی تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ عتیقہ سے میری تیسری ملاقات تھی اُس کے ساتھ والی لڑکی نے اُس کو پکارا تو میں جان گئی اُس کا نام عتیقہ ہے۔

''ماشاء اللہ آنٹی جی...... آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ بہت ہی اچھی کیا کہیں جارہی ہیں۔'' میں نے مسکرا کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ میں اپنے اسکول جارہی ہوں۔

ارے اس ٹائم دس بج رہے ہیں میں نے بتایا کہ ''بیٹا میں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے آج کسی کام سے جارہی ہوں۔ اچھا! ایک پھر اُس ستائشی نظروں سے دیکھا۔ میں گھر میں شلوار قمیض میں رہتی ہوں۔

''فاکہہ اور ارحم کو بلادیں آنٹی۔'' اُسے جیسے اپنی ڈیوٹی کا خیال آ گیا۔

''او کے بیٹا ابھی فاکہہ کو بلاتی ہوں ارحم تو اپنی نانی کے پاس ہیں۔''

میں نے تفصیل بتائی کہ بیٹا دو بہوئیں میری اوپر ہوتی ہیں۔ میں گراؤنڈ فلور پر رہتی ہوں میرے ساتھ ایک بہو رہتی ہے لیکن اُس کا بیڈروم بھی اوپر ہے۔ میں نے آواز دی تو میری بہو فرحت اپنی گول مٹول سی بلبلو سی فاکہہ کو لے آئی عتیقہ نے فاکہہ کے گال انگلیوں سے چھوئے اور پھر بے ساختہ جھک کر اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''آنٹی میرا ابھی ڈھائی سال کا بیٹا ہے۔ اچھا میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

''کس کے پاس چھوڑ کر آتی ہو۔'' میں نے واجبی سا سوال کیا تو اُس نے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے مجھے دیکھے بنا آہستہ سے بولی۔

''وہ اپنی دادی کے پاس ہے میری ڈیورس ہو چکی ہے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد میری ساس نے بیٹے پر زور دیا اور زبردستی یہ رشتہ ختم کروا دیا۔

اُس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اُتر آئی۔

مجھے بتاؤ کیا ہوا میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھے بہت پسند تھی میں نے تو پہلی ہی ملاقات میں اُس کی آنکھوں کو دیکھ سمجھ لیا تھا کہ یہ لڑکی ان آنکھوں سے اپنے اندر کا دکھ چھپانا چاہتی ہے جو چھپتا نہیں صاف عیاں ہوتا ہے یہ دکھ ہر کسی کو نظر نہیں آتا مجھے نظر آیا مگر میں نے گھر والوں سے اس کا ذکر نہ کیا۔ پھر سب کہتے ہاں لکھ دیں کوئی کہانی زبردستی کہانی تیار کرلیں بچے کہتے ارے امی جان...... آپ کو تو ہر ایک کے اندر چھپی کہانیاں تلاشتی رہتیں ہیں ڈسٹرب ہوتی ہیں ٹھیک طرح سے نہ کھاتی ہیں نہ سوتی ہیں۔ بہوئیں کہتی آپ آرام کیا کریں دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا کریں۔ اس لیے میں نے عتیقہ کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھی اور میرا خیال درست نکلا۔

''آنٹی میری دوست مجھے آواز دے رہی ہے ابھی میں چلتی ہوں پھر کسی روز سناؤں گی۔'' وہ بولی تو میں نے کہا۔

''میں تمہاری کہانی لکھوں گی۔'' اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

''سچ آپ رائٹر ہیں پھر تو میں بہت جلد آؤں گی، او کے، اللہ حافظ۔'' ''اللہ حافظ وناصر میں نے دعا دی اور وہ چلی گئی۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا مجھے لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت

گئیں عتیقہ کا بہت شدت سے انتظار تھا۔ میری اس بے چینی کو گھر والے بھی محسوس کر رہے تھے بڑی بھو نے کہا۔

''آنٹی عتیقہ نہیں آئی نا؟''

''ہاں بیٹا...... پتہ نہیں کیا مجبوری ہوگئی۔'' دوسری بھو نے کہا۔ خالہ ممی آپ کہانی شروع تو کردیں جب وہ آجائیں پھر مکمل کر لیجیے چھوٹی بولی۔

امی وہ ہم دونوں کو دیکھ کر کتنی خوش تھی کہ کس طرح ساس بہوئیں بدنام ہیں اور ہوتا بھی ہے کہ یہ روایتی بن جاتی ہیں۔ لیکن آپ اور فرحت لگتا ہی نہیں ساس بہو ہیں۔ مجھے حسرت آتی ہے جب آپ جیسی ساس بہو نظر آتی ہیں۔ اُس کو آجانا چاہیے تھا میں نے کہا تو اُسی لمحہ بیل بجی۔

ملازمہ اماں نے آکر بتایا کہ ''بیٹا عتیقہ آئی ہے کہتی ہے نگہت آنٹی سے ملنا ہے۔'' اوہ میں خوش ہوگئی اماں اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھائیں میں آرہی ہوں۔ میں نے ہاتھ سے اپنے بال درست کیے اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ آج چہرہ صاف نظر آرہا تھا اُس نے منہ پر سے نقاب ہٹادی تھی وہ ایک معصوم سی پیاری سی دکھی لڑکی تھی۔ اُس نے اپنی کہانی شروع کی۔

''یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرے اور عدنان کے درمیان بہت زیادہ انڈراسٹینڈنگ ہوگئی تھی ہم دونوں میں عہد و پیماں ہوگئے تھے اور اُمید یہ تھی کہ بہت جلد اپنے اپنے والدین کو راضی کرلیں گے عدنان میری خالہ کا بیٹا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ شہریار مجھے تو... کر چاہنے لگا ہے وہ میرا کلاس فیلو تھا میں گریجویشن کر رہی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور بولا کہ میں تمہیں چار سال سے پسند کرتا ہوں تم نے کبھی بھی میرے احساسات، حرکات وسکنات سے اندازہ لگایا اور نہ میری محبت کا جواب دیا۔ ''عتیقہ میری ماں کو راضی کرنا بہت بڑا مرحلہ ہے مگر میں تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں کسی بھی صورت سے تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میں پریشان ہوگئی۔ مگر شہریار میں تو اپنے کزن سے

پیار کرتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں کرسکتا۔

''عتیقہ میں...... ایگزام کے بعد شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر...... عدنان......'' شہریار میں عدنان کے بغیر مرجاؤں گی...... میں رو پڑی۔ شہریار مرد ہو کر رو پڑا اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے اُس کی تپتی آنکھوں کی تپش نے مجھے پگھلا کر رکھ دیا۔

میں دیر تک بلک بلک کر روتی رہی جب آنکھ کھول کر دیکھا تو شہریار نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں صاف کر کے چاروں طرف دیکھا مگر شہریار کہیں نظر نہیں آیا تو میں نے اپنی کتابیں سمیٹی اور بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی یہ میری بھول تھی کہ میں یہ سمجھی تھی کہ شہریار بنا کچھ کہے غائب ہوگیا اس کا مطلب ہے کہ وہ میرے حق میں دست بردار ہوگیا۔ مجھے رہ رہ کر اُس کا خیال آرہا تھا۔ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی سامنے ایک خاتون بیٹھی تھیں اجنبی تھیں پہلے میں نے اُن کو نہیں دیکھا تھا۔ میں انہیں سلام کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے چینج کیا اور کچن کی طرف جانے لگی امی نے کہا۔

''عتیقہ چائے اور ناشتہ لے کر آؤ۔ میں سمجھی امی کی کوئی دوست ہوں گی۔'' میں نے چائے بنائی اور اُس کے ساتھ سموسے بسکٹ، نمکو، فروٹ، مٹھائی لے کر کمرے میں پہنچی تو خاتون نے مجھے دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

''بیٹا یہ شہریار کی اماں ہیں اُردو کم سمجھتی ہیں بولنا بھی نہیں آتا ان کی زبان پشتو ہے۔ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ لے کر آئی ہیں تم شہریار کو جانتی ہو۔'' امی نے سوال کیا تو میں کچھ نہ کہہ سکی۔ پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی سارا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑی بستر پر گر کر میں بہت روئی۔

''یا اللہ میں کیا کروں۔'' خاتون نے بڑی مشکل سے اپنا مدعا بیان کیا اور چلی گئیں۔

رات کو امی اور ابا میں بڑی دیر تک کچھ باتیں ہوتی رہیں اور پھر طے پایا کہ شہریار کا رشتہ بخوشی منظور کرلیا گیا۔ میری اور عدنان کی محبت کی 'پسند' کی ہار ہوگئی۔ شہریار جیت گیا وہ کیسے؟ تو اُس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ماں نے موقع پر اُسے دیکھ لیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مجھے بہو بنانا پڑا۔

جب میں شہریار کے گھر میں دلہن بن کر داخل ہوئی تو ایکدم بدل چکی تھی میں نے تہیہ کرلیا۔ مصمم ارادہ کہ میں اب شہریار کو اپنی زندگی کا اپنے وجود کا مالک سمجھوں گی اب مجھ پر اور میرے وجود کا ہر حصہ صرف اور صرف شہریار کا ہے اُس پر پورا پورا حق شہریار کا ہے۔

''عدنان'' میری محبت میرا پیار میری طلب تھا مگر اب سب کچھ شہریار ہے میرا سائبان، میرا تحفظ میرا احصار ہے۔ اب میرا نام اُس کے نام کے ساتھ جڑا ہے میری زندگی کی دوڑ سانسوں کی لڑی...... شہریار سے جُڑی ہے۔ میرا مان میری خوشی میرے دکھ سکھ کا ساتھی یہ ہی ہے میں سر جھکائے بیٹھی تھی میں نے اپنے ذہن سے دل و دماغ سے تصورات سے خیالوں سے سوچوں سے...... عدنان کو نکال دیا تھا اور اُسے شادی کے بعد بہت کم دیکھا اور ملی۔ جہاں میں ہوتی وہ نہ ہوتا اور جہاں وہ ہوتا میں نہیں ہوتی۔ نجانے کیوں مجھے تو اُس سے آنکھ ملانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اُس سے بات کرنے کے لیے میں ڈرتی تھی نہ جانے زبان سے کیا کچھ نکل جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شہریار نہ دیکھ لے اور اگر دیکھ لے تو نہ جانے کیا سوچے۔

یہ لوگ ویسے بھی عزت، آن، عورت، بیٹی، بیوی کے لیے بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں، بہت محتاط...... بڑی آن بان والے، غیرت دار...... ہر بات کو ان کا مسئلہ بنا کر دشمنیاں پشتوں تک چلاتے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ 'عدنان' کوئی تکلیف کوئی زک یا نقصان نہ پہنچے۔ اس میں میری ہی غرض سمجھ لیں کہ میں 'عدنان' کی حفاظت اور بقا کے لیے ایسا کچھ نہیں کرتی۔

شہریار مجھ سے بے پناہ پیار کرتے تھے لگتا جیسے وہ مجھے کانچ کی نازک سی گڑیا سمجھتے ہیں بہت خوش تھی اور گھر میں ایک نند اور ایک دیور ساس اور سُسر تھے میں اب سب کی بہت خدمت کرتی اُن سب کا بہت خیال رکھتی بہت ہی فرمانبردار اور کیئرنگ بیوی، بہو اور بھاوج تھی نند اور دیور تو اردو بولتے سمجھتے تھے صرف ساس کا مسئلہ تھا۔

میں نے پہلے ہی دن سے محسوس کیا تھا کہ میری ساس کو جیسے مجھ سے اللہ واسطے کا بیر تھا وہ ہر وقت اپنی زبان میں بڑبڑاتی رہتیں اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اُن کی آنکھوں سے میں بہت حد تک اُن کی باتیں سمجھنے لگی تھی۔

ان ہی دنوں میں شاہ گل کی آمد بہت زیادہ ہوگئی تھی یہ شہریار کی خالہ کی بیٹی تھی دودھ جیسی رنگت بھرا بھرا سا جسم وہ جب آتی مجھے دیکھ کر کچھ کہتی لگتا جیسے ہر قدم ہر لمحہ میرا مذاق اڑاتی ہے آج کل میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ اسفند ہونے والا تھا۔ میرے ڈیل ڈول پر ہنستی تھی میں سب سمجھ رہی تھی مگر ضبط کر جاتی ہماری ساس اس کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھیں مگر شہریار نے آخر کار اماں کو منالیا میں بہو بن کر آ گئی تھی مگر لگتا جیسے میری ساس کو اس بات کا دکھ ہے اور اب قدم قدم پر میرے ساتھ بہت غلط سلوک کرتیں۔

اسفند ہو گیا ابھی وہ چند روز کا تھا میری ساس کی برداشت سے باہر ہو گیا اب وہ مزید مجھے گھر میں رکھنا نہیں چاہتی تھیں بار بار شہریار سے کہتی کہ اپنی بیوی کو طلاق دو......

میں ہر کام اُن کی مرضی اور خواہش کے مطابق کرتی۔ ہر بات اُن کی مانتی ہر فیصلہ آنکھیں بند کر کے قبول کرتی میری نجی زندگی میں وہ حد سے زیادہ انٹرفیئر کرتیں حد تو یہ ہے کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بھی اُن کی مرضی شامل رہتی۔ اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے میں اُن کا ہی حکم چلتا۔ لیکن اُس کے باوجود بھی اُس عورت کو چین تھا نہ قرار وہ بالکل غیر مطمئن تھی۔

آخر ایک روز اُس عورت نے جو ماں بھی تھی اُس نے اپنے بیٹے کو ایک بہت ہی غلط بہت ہی خراب شریفوں

کے سننے کے لائق نہیں تھی وہ بات ماں نے بیٹے سے کہی تو شہر یار تڑپ اٹھا آنکھیں پھاڑے دیر تک ماں کو گھورتا رہا اُس کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ اُس کے وجود کا ہر حصہ حرکت میں تھا دانت پیستے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھا اور لائٹ آف کر کے بیڈ پر گر پڑا...... اور پھر دوسری صبح...... میں طلاق کے کاغذات لے کر امی ابا کی دہلیز پر لوٹ آئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

مجھے بھی اس طلاق کا بہت دکھ تھا مگر...... شہر یار تو مجبور تھا اُسے مجبور کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ 'طلاق' غصے کی حالت میں دی جاتی ہے جبکہ غصہ حرام ہے اور 'طلاق' بہت زیادہ غصے میں غیض وغضب میں دی جاتی جب دونوں فریقین ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے گزارا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سوائے 'طلاق' کے کوئی دوسری صورت 'کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تب 'طلاق' دی جاتی ہے۔ مگر یہ کیسی 'طلاق' ہے کہ ماں نے ایسی اخلاق سے گری ہوئی نازیبا بات کی تو...... بیٹے کو مجبوراً دل پر پتھر رکھ کر اُن کاغذات پر سائن کرنے پڑے اُس ظالم عورت نے میرا بیٹا بھی چھین لیا۔

عتیقہ زاروقطار رونے لگی میں نے آگے بڑھ کر عتیقہ کو گلے سے لگایا بہو نے جلدی سے ٹھنڈا پانی لاکر پلایا۔ راحیلہ، طیبہ اور فرحت تینوں نے بھی عتیقہ کو گلے سے لگایا سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کا ساتھ دے گا آپ دل چھوٹا نہ کریں ٹینشن نہ لیں بس نماز پڑھیں۔ قرآن کی تلاوت روزانہ کریں پھر دیکھیں اپنا ہر معاملہ اللہ رب العزت کی پاک اور یکتا ذات واحد پر چھوڑ دیں اپنے آپ اور اپنے مسائل اور مرادوں کو...... اُس کے دربار میں حاضر کریں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چند لمحے بعد میں نے سوال کیا۔

''یہ بتاؤ بیٹا عدنان کی شادی ہوگئی؟''

''جی نہیں آنٹی جی۔'' انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی انہوں نے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ اب شادی نہیں کریں گے۔

شہر یار نے ماں کی ضد پر شاہ گل سے شادی تو کر لی مگر وہ انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی وہ اُسے مختلف طریقوں سے ٹارچر کرتے اور یہ دیکھ کر بھابھی اذیت میں ہے وہ تڑپ جاتیں۔ اور جب وہ شہر یار کو برا کہتیں چیختی چلاتیں تو شہر یار کہتے۔ میں ایسا ہی رویہ رکھوں گا جسے میں بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا اُس کے ساتھ میں خوش رہ سکتا ہوں اور نہ میں اُس کو خوش رکھ سکتا ہوں۔

میں نہیں کر سکتا شاہ گل سے پیار میں نہیں دے سکتا اُسے ازدواجی زندگی کا امرت...... میں جس سولی پر لٹک رہا ہوں۔ میں اُسی سولی پر آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اماں آپ نے بہت ہی نازیبا اور تکلیف دہ بات کی۔ ایک ماں پر سے میرا یقین اٹھ گیا ہے۔ اب میں مزید کوئی گھناؤنا، گھٹیا، الزام نہ دینا چاہتا ہوں نہ سننا چاہتا ہوں نہ دہرانا چاہتا ہوں۔ آپ کی ایک ضد نے مجھے اور عتیقہ کو دکھ اذیت 'ناکامی' بربادی کے پاتال میں پھینک دیا ہے۔ ہم دونوں کا صبر' ہماری تڑپ' ہماری بے بسی، ہماری اذیت ناک ہار آپ سے کچھ نہیں مانگ رہی۔ آپ کے پاس کیا ہے جو آپ ہمیں دیں گی۔ جو چیز آپ کے بس میں تھی وہ تو ہمیں دے دی ہے آپ نے...... اب مزید مجھے ٹارچر نہ کریں۔ وہ زور سے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہاری طلاق کے بعد عدنان نے کبھی تم سے ملنے کی کوشش نہیں کی یا فون پر بات کی؟'' میں نے اُسے چپ ہوتے دیکھ کر سوال کر ڈالا۔

''آنٹی جی! اب عدنان ایک بار پھر میری طرف بڑھے۔ آنٹی جی...... بہت وقت ہو گیا ہے میں امی کو تو ساری تفصیل بتا کر آئی تھی مگر ابا کو نہیں وہ پریشان ہوں گے۔ میں انشاء اللہ دوبارہ جلد ہی آؤں گی تب امی کو بھی ساتھ لاؤں گی وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا بالکل بیٹا موسٹ ویلکم ضرور آنا امی کے ساتھ ہم لوگ انتظار کریں گے۔ میری بہوؤں نے بھی یک زبان ہو کر

کہا وہ اقرار میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی پھر باری باری رومیسا کو ارحم کو اور فاکہہ کو پیار کیا اور اللہ حافظ کہتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ڈائننگ ٹیبل پر چلی آئی۔

کچھ دن بعد عتیقہ پھر چلی آئی میں تو اُس کی منتظر ہی تھی۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' میں نے محبت سے پوچھا۔ وہ مسکرا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آنٹی اچھی ہوں۔''

''اچھا بتاؤ عدنان نے تم سے کیا کہا؟''

''آنٹی وہ ایک دن گھر چلے آئے میں اتفاق سے اکیلی تھی وہ بولے۔

''اوہ...... یہ تو اور بھی بہتر ہوا...... تمہاری عدت کے ختم ہونے کا انتظار تھا اماں نے بتایا کہ تم اب مل سکتے ہو عتیقہ سے...... دیکھو تمہیں کہنے یا بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ کیا چاہتا ہوں؟ تمہیں یہ اطلاع تو مل گئی تھی نا کہ میں نے شادی نہیں کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پھر دے دیا شاید اللہ تعالیٰ کو ہم پر رحم آ گیا۔

شاید ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ کچھ بھی ہو...... کہیں بھی جائیں۔ لوٹ کر پھر اُسی منزل پر آ گئے جہاں سے چلے تھے۔

نہ تم نے والدین کی نافرمانی کی نہ میں نے اپنی ہار کو اَنا کا مسئلہ بنایا اور بگڑا ہوا کام یوں بن گیا۔

''اب تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اب بھی میں تمہیں روزِ اول کی طرح پیار کرتا ہوں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی روح میں سمو لینا چاہتا ہوں۔ سر جھکائے بیٹھی عتیقہ کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

عدنان...... شہریار نے مجھے فون کیا تھا وہ کہتا ہے تم حلالہ کرلو پھر میں تمہیں اپنا لوں گا میں تم سے دور نہیں رہ سکتا...... اب میں کیا کروں؟ اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

عزیز از جان دوست پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے تم آرام سے اطمینان سے جب تنہائی میں اس بارے میں سوچو ہر پہلو اور ہر زاویے سے سب کچھ پرکھو، اچھی طرح جانو، عقل سے کام لو تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟ تمہارے لیے کون بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔ عدنان نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دھیرے سے تھپتھپایا۔

''ریلیکس ہو کر سوچو میں آج ہی جواب نہیں مانگ رہا ہوں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو...... میں پھر آؤں گا تمہیں ایک بات بتا تا چلوں اس بات کی کیا گارنٹی ہوگی کہ تم کسی سے حلالہ کرنا چاہو تو وہ شخص تمہیں طلاق ہی نہ دے پھر...... وہ شخص میں بھی ہوسکتا ہوں، اوکے...... اللہ حافظ۔ وہ چلا گیا۔

اچھا تو پھر تم نے عدنان کو کیا جواب دیا اپنی زندگی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟ میں نے عتیقہ سے سوال کیا۔ آنٹی جی ابھی میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں عدنان کا پرپوزل قبول کرلوں گی۔ اس کے لیے میں نے استخارہ نکلوایا تو یہ میرے حق میں بہتر آیا مگر اب سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ کیا خالہ خالو اس رشتے کو قبول کریں گے بھی یا نہیں وہ رو دینے کو تھی۔

''دیکھو بیٹا ویسے تو میں غیر ہوں مجھے تمہارے پرسنل معاملات میں دخل اندازی کرنے کا بالکل بھی حق نہیں ہے لیکن اگر میں تمہارے خالہ خالو یا والدین سے بات کروں تو کیا مناسب ہوگا؟''

آنٹی جی! پلیز آپ میری مدد کیجیے میں آپ کا احسان تا حیات نہیں بھولوں گی۔'' وہ عاجزانہ انداز میں بولی۔

''اوکے بیٹا میں بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے مشورہ کرلوں ویسے مجھے امید ہے کہ گھر کا کوئی فرد بھی میری بات کو رد نہیں کرے گا وہ ضرور میرا ساتھ دیں گے۔''

اور ایک دن میں عتیقہ کے ساتھ اس کے گھر چلی آئی۔ اس کے خالہ خالو بھی آ گئے تھے۔

تب میں نے اُن کو مخاطب کیا بھائی منصور اور صالحہ بہن دیکھیں اگر آپ عتیقہ کو اپنے عدنان کے لیے مانگتی اور نجمہ بہن اور سلیم بھائی آپ کے رشتے کو رد کرنے کے بعد شہریار سے شادی کرتے تو وہ قصوروار ہوتے صورت حال آپ کے سامنے ہے آپ کے رشتے سے قبل ہی شہریار کا رشتہ آ گیا۔ اور عتیقہ نے والدین کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ اُس نے بھی مشرقی بیٹی کا کردار نبھایا اور پھر اُس کے نصیب میں یہ داغ لگا یہ نصیب کی ستم ظریفی تھی۔ اب اگر یہ دونوں شادی کے مقدس بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں تو آپ لوگوں کو دونوں کی خوشی اور بقاء کے لیے 'ہاں' کر دینا چاہیے۔ آپ کے بچے فرمانبردار اور بہت ہی صبر وشکر کرنے والے ہیں۔ وہ حالات سے مقابلہ کرنا جانتے ہیں اپنے والدین کی عزت بھی رکھنا جانتے ہیں اُن کا احترام بھی کرنا آتا ہے انہیں...... اگر آپ لوگ مجھے بھی بہن سمجھتے ہیں تو میری سفارش کو قبول کر لیجیے۔'' میں نے بڑے ہی پیار اور اپنائیت سے کہا تو سب نے سر آنکھوں پر یہ رشتہ منظور کر لیا۔ مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر شخص خوش و مسرور تھا۔

شادی کی تیاریاں دھوم دھام سے ہو رہی تھی سب خوش تھے مگر عتیقہ کی خالہ زاد اور شائستہ ناشائستہ بنی ہوئی تھی وہ بالکل بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی۔ وہ اس شادی میں بالکل بھی حصہ نہیں لے رہی تھی۔ ساری شاپنگ ہوگئی تھی اماں نے کہا کہ بیٹا کم از کم تم شادی اور ولیمے کا جوڑا لے آؤ اُس نے تنک کر کہا۔

''ہاں ضرور ارمانوں سے خرید کر لاؤں گی کیونکہ دلہن طلاق یافتہ ایک بچے کی اماں جو ہے۔ اُس نے برا سا منہ بنایا۔

''نہیں میں نہیں لاؤں گی میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' اماں منہ دیکھتی رہیں۔

شائستہ اتنا غرور اتنا تکبر اور بڑا پن اچھا نہیں ہوتا نہ جانے کب؟ کون؟ کن حالات سے دوچار ہو جائے۔

ایسی بات نہ کرو جو پروردگار کی ناراضگی کا باعث بنے۔ ہر وقت توبہ استغفار کرو اپنے اور سب کے حق میں نیک تمنائیں دل میں رکھو اور اچھی دعائیں کیا کرو۔ اگر اُسے طلاق ہوئی ہے تو اُس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ سب کچھ معلوم رکھ کر تم انجان بن رہی ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اتنے صبر وشکر سے بیٹھے ہوئے عدنان کو اللہ تعالیٰ نے اُس کی محبت اُسے لوٹا دی۔ تو ہمیں کھلے دل اور خوشی کے ساتھ اُس کے حصے کی خوشیاں اُسے لوٹانا چاہیے۔ میرے بچے کی اپنے بھائی کی خوشیوں میں تمہیں بھی خوش رہنا چاہیے۔

''بس...... بس اماں آپ تو بس موقع ڈھونڈھتی ہیں مجھے ذلیل کرنا کا...... وہ غصے سے بولی۔ تو اماں نے کہا۔

''شائستہ عقل سے کام لو۔ ہم اگر کسی کو کچھ نہیں دے سکتے اور اُن سے چھین بھی نہیں کوئی تم اپنے ہی بھائی کی خوشیاں چھیننا چاہتی ہو وہ سنے گا اُسے بھی صدمہ ہوگا ڈرو...... اُس برے وقت سے کہ میں نہیں...... وہ رب تمہیں ذلیل نہ کرے...... اب بھی توبہ کرو...... اور خوشی سے بھائی کی شادی کی تیاری کرو۔ اماں کمرے سے نکل گئیں۔ وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے عدنان کے والدین برأت کی گاڑی میں جا رہے تھے۔ عدنان بائیک پر تھا کہ اچانک ایک زبردست حادثہ پیش آیا اور براتیوں سے بھری بس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا عدنان کے والدین موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ عدنان کی زندگی میں یہ کیسا بھیانک موڑ آیا کہ وہ یتیم ہوگئے کئی دنوں تک وہ سنبھلنے نہ پائے۔ ابھی شادی کی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی کہ یہ المناک سانحہ پیش آ گیا۔

اس گھٹے گھٹے غم زدہ ماحول میں عتیقہ نے عدنان کو حوصلہ دیا۔ اُس نے رات دن صبح و شام قدم قدم پر عدنان کو اس ماحول سے نکالنے کے لیے اُس کا ساتھ دیتی رہی۔ اُس بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹنا بہت ہی

مشکل اور دشوار گزار مرحلہ تھا مگر...... وہ زیادہ تر خالہ کے گھر پر ہوتے۔ خالہ اور عتیقہ ہر ممکن اُس کے غم اور دکھ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق اُس کے لیے بہتر سے بہتر ماحول رکھتے اُس کے وجود کو اُس کے دل کو بالکل نازک سا کانچ کا برتن سمجھ رہے تھے۔ آخر وہ سنبھل ہی گیا...... اور اُسے سنبھلنا تھا کیونکہ...... اس دنیا میں آنا جانا تو لگا ہے آج ماں کی آغوش تو کل گور کا گھپ اندھیرا...... کہا جاتا ہے کہ مرنے والے کے پیچھے کوئی نہیں مرتا...... چاہے اُس کا کتنا ہی قریبی رشتہ ہو، جگر کا ٹکرا ہو...... یا سر کا سایہ، زندگی کا ساتھی ہو، یا شفیق سایہ...... جو بچھڑ گیا سو بچھڑ گیا...... چند لمحے، چند دن، چند سال اور پھر ...... وہی زندگی وہی زندگی کی روٹین عدنان بھی سنبھل گیا تھا۔ وہ آج بہن کے گھر گیا کہ تاریخ طے کی جائے۔

عدنان...... تم پاگل ہو گئے ہو...... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جو ایک طلاق شدہ ایک بچے کی ماں ملی ہے تمہیں؟ کیا تمام کنواری لڑکیوں کا کال پڑا ہے؟ کیوں احمقانہ حرکت کر رہے ہو تم؟ یہ دیکھو ایک سے بڑھ کر ایک یہ جتنی اچھی ہیں اتنی ہی مالدار ہیں اعلیٰ خاندان کی ہیں۔ عدنان نے سامنے پڑی تصویروں پر نظر ڈالے بغیر کہا آپ نے آج سے پہلے بھی کئی بار یہ حربہ آزمایا۔

آپ کو میرا جواب اور فیصلہ معلوم ہے لہٰذا آج دوٹوک فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ آپ تاریخ لینے جائیں گی یا نہیں؟ ہاں 'یا' ناں میں جواب دیں۔ اچھا تو تم نے بالکل سیریس ہو کر سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اگر ناں کہوں بھی تو تم عتیقہ ہی کو گھر میں لاؤ گے۔ تو میرا بھی آخری فیصلہ ہے آج سے تمہارے ساتھ میرا 'جینا' مرنا' ختم سمجھو۔ اب تم جا سکتے ہو شائستہ نے بڑی ہی سرد مہری سے کہا اور ریموٹ لے کر ٹی وی آن کیا اور آواز بڑھا دی۔

او کے میں نے آخری بار یہ کوشش کی تھی۔ جیسے آپ کی مرضی میں نے سمجھا تھا کہ یتیم تنہا بھائی پر آپ کو اب زیادہ پیار آئے گا۔ اور چلیں جیسے آپ کی مرضی جیسے آپ کا فیصلہ......

اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ بہن کے گھر سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

"نہیں یار...... وہ کسی صورت نہیں مان رہی ہیں۔ چھوڑ دو اُن کا پیچھا...... ارے حد تو یہ ہے کہ اپنوں نے صاف لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ آج سے میرے اور اپنے رشتہ سے دستبردار ہو گئیں۔ انہوں نے اپنا 'مرنا' 'جینا' ختم کر لیا ہے۔

"ارے یہ کیا کہہ رہے ہو عدنان؟" پھر تم نے کیا جواب دیا عتیقہ بے حد پریشان اور ڈپریس ہو گئی۔ یار میں کیا کہتا؟ میں بھی اب بہت تھک گیا ہوں۔ پہلے ہی میں نے کتنی اذیتیں، مصیبتیں اور تکالیف برداشت کیا؟ اب مجھ میں مزید ہمت نہیں ہے اب میں اس زندگی کے تارِ عنکبوت میں اُلجھنا نہیں چاہتا تم خالہ، خالو سے بات کرو کہ یہ معاملہ ہے۔

وہ بہت ہی مجبور بے بس اور پریشان نظر آرہا تھا۔ عتیقہ کو اُس پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا اُس نے آگے بڑھ کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بہت ہی پیار اور اپنائیت سے تسلی دی۔ عدنان ہمت نہیں ہارتے...... تم مرد ہو مضبوط، بھرپور قوت ارادی رکھنے والے...... دیکھو جب ہم مصیبت اور پریشانی میں اُلجھتے ہیں تو اُس دم اپنے رب کو یاد کرتے ہیں ایک وہی سہارا مالک و مختار ہے ہمارا اُس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ جنم دینے والی ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ تو پھر جس نے اس کائنات کو اس کائنات کے ہر ذرے کو چرند پرند انسان درخت پھول پودے پانی ہوا، ہمیں زندگی گزارنے کے لیے ہمہ قسم کی آسائشیں میسر کی ہیں۔ تو ذرا سوچو تو اُس 'رب' کی ذات یکتا اور عظیم ترین ہے وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔ وہ ہماری جنم دینے والی ماں سے ستر گناہ زیادہ ہم سے محبت کرتا ہے ہمیں پیار کرتا ہے ہمارے دکھ درد اور مسائل دیکھتا ہے سنتا ہے۔ تم آج بلکہ

ابھی سے نماز شروع کردو۔

"قرآن پاک کی روزانہ تلاوت کرو اُس دونوں جہاں کے مالک ومختار کو دل کی تمام تر گہرائیوں سے تڑپ کر پکارو اپنی حاجت اُس کے دربار میں پیش کرو۔ پھر دیکھنا تمہیں کیسا جواب ملتا ہے؟ پلیز عدنان عتیقہ نے عدنان کی نم آنکھوں کو چوم لیا۔

ارے بابا اب تو مسکرا دو عتیقہ نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو عدنان نے بھی اُس کی جبین پر خوبصورت سی یاد ثبت کردی۔ دونوں ہنس پڑے۔

"یہ ہوئی نا بات...... ارے یار تم تو بڑے بزدل نکلے۔" وہ ہنسی۔ تو ایک بار پھر عدنان سنجیدہ ہوگئے۔

"تم یہ کیا کہہ رہی ہو عتیقہ بی بی...... میں اور بزدل جان عزیز! جان عدنان! تم کو شاید یاد نہ ہو مگر میں ماضی کا اذیت ناک اِک اِک لمحہ بھولا نہیں۔ جس روز مجھے تمہاری انگیجمنٹ کی خبر ملی تھی بس اسی لمحے سے آج تک میں کیسے پل صراط سے گذرا ہوں کن کن لمحوں کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے؟

میں نے وہ راتیں وہ دن وہ پل کیسے برداشت کیا یہ میں جانتا ہوں۔ میں اتنے عرصے میں اک پل کے لیے بھی تم سے غافل نہیں ہوا میں نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کیا؟ یہ میں جانتا ہوں اور اب جس سانحہ سے گزرا ہوں کیا وہ معمولی نوعیت کا تھا؟ جب میں نے یہ سب ضبط، صبر اور نہایت ہی صبر اور بُردباری سے برداشت کیا ہے؟ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ ڈیئر دوست...... تم تو مجھے بزدل نہ کہو۔ اُسے معصومیت سے عتیقہ کی طرف دیکھا۔

عتیقہ نے اپنے کان پکڑ لیے اچھا بابا سوری...... آئی ایم ویری سوری۔ رئیلی اینڈ سو سوری بس...... عدنان نے مسکرا کر اِس کے گال چھو لیے۔ تم ایک کام کرونا، عدنان کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا۔ کیا کام ہے؟ عتیقہ نے پوچھا۔

"ارے یار ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف فرشتہ بنا کر آنٹی کو بھیجا ہے تم نگہت آنٹی کے پاس جاؤ نا...... وہ ضرور ہماری مدد کریں گی۔ عدنان کا چہرہ کھل اٹھا تھا ابھی چند لمحے پہلے اُداس، پریشان سے عدنان کو جیسے لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئی ہو۔ عتیقہ بھی فوراً تیار ہوگئی۔

"ٹھیک ہے میں کل ہی آنٹی سے جا کر بات کرتی ہوں۔"

ملازمہ نے آکر بتایا کہ عتیقہ بی بی آئی ہیں۔ میں رائٹنگ ٹیبل پر مصروف تھی عتیقہ ہی کی کہانی لکھ رہی تھی۔ میں سارے پیپر فائل میں رکھے اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

علیک سلیک کے بعد وہ بولی۔ "آنٹی جی میں آپ کو بہت ڈسٹرب کرتی ہوں جس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ مگر اب تو عدنان بھی آپ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اب زندگی کے ہر مسئلے اور کام کے لیے آنٹی سے مشورہ لیں گے وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں ہماری مشکل اور کڑی گھڑی میں انہوں نے ہی تو ہمارے والدین کو راضی کیا تھا اب...... آپا کو بھی وہی راضی کرلیں گی ورنہ...... تو پھر دوسری صورت میں مجھے آپا کی ضرورت نہیں رہے گی میرے خالہ خالو...... میرے والدین ہوں گے۔

"آنٹی جی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ شائستہ آپا کو......" وہ ادھورے جملے کے ساتھ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"دیکھو بیٹا میں نے کبھی زندگی میں اس قسم کا رسک نہیں لیا۔ پہلی مرتبہ میں نے یہ کام کیا۔ اب بار بار مخالفین پیدا ہوتے جائیں گے۔ میں کس کس کو سمجھاؤں گی اور تم بتا رہی ہو کہ یہ بہت بدتمیز' ضدی اکھڑ مزاج ہے تو بیٹا ایسے لوگوں سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ وہ مجھے بدتمیزی سے کچھ کہہ دیگی تو پھر...... میں بھی...... چپ تو نہیں رہوں گی۔ میں نے بات ختم کرکے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے سر جھکا لیا۔

"جی آنٹی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں وہ جانے کے لیے بڑی بے دلی سے کھڑی ہوگئی۔ میں نے کہا بیٹا مائینڈ نہیں کرنا میں دعا کروں گی

تمہارے حق میں انشاء اللہ رب بہتر ہی کرے گا۔

''جی آنٹی......'' وہ نگاہیں جھکائے بہت مضمحل نظر آرہی تھی۔ مجھے اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر دکھ ہوا۔

''اچھا...... یہ بتاؤ وہ یہاں آسکتی ہے؟'' عتیقہ چند لمحے سوچ کر بولی۔

''شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔'' میں بھی چند لمحے شش و پنج میں رہی۔ وہ چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میں نے اتنی تو مدد کر دی ہے اب...... ایک چانس اور سہی...... اتنا سب کرنے پر بھی ان لوگوں کی بدنصیبی ہی سمجھو کہ بات پھر اٹک کر رہ گئی۔ دونوں کو تھوڑی سی خوشی ملی چند دنوں کی اور پھر وہی ٹینشن وہی بے بسی، وہی اُداسی، وہی ہجر کی لمبی راتیں، وہی آہ و فغاں، وہی محرومیاں، تڑپتے سسکتے لمحات......

ایک دن سوچنے کے بعد میں نے عتیقہ کو فون کیا اور کام کرنے کی حامی بھری وہ لڑکی خوش ہوگئی۔

''آنٹی مجھے پتہ تھا اب میری مدد ضرور کریں گی۔''

''اچھا یہ بتاؤ شائستہ کے گھر کیسے جانا ہوگا۔ سب نے اس کی خوشی بھانپتے ہوئے پوچھا۔

''میں اور عدنان آپ کے پاس آجائیں گے اور آپ کو ان کے گھر لے جائیں گے مگر آنٹی ہم باہر سے ہی چلے جائیں گے کیا یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کچھ توقف کے بعد کہا ٹھیک ہے آج ہفتہ ہے، ہم لوگ پیر کو چلتے ہیں۔ عتیقہ نے شدت بھرے لہجے میں پھر میرا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا۔

پھر میں نے شائستہ کو راضی کر ہی لیا وہ اتنی بری نہیں تھی بس سسرال اور ملنے جلنے والوں کے طعنوں سے پریشان تھی۔

اور پھر زوروں پر تیاریاں ہونے لگیں اور عدنان کے پاس کچھ بھی تیار نہیں تھا۔ اتنے کم دنوں میں تیاری ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا لیکن میں دونوں طرف مصروف تھی اب ہر کام میں ہر شاپنگ پر وہ لوگ مجھ سے ہی رابطہ کرتے تھے۔ میں بھی بہت خوش تھی جیسے میرے بچوں کی شادی ہو رہی ہو۔ ہر چیز ہر بات ہر کام میں میری مرضی شامل ہوتی اور پھر وہ وقت آ ہی گیا۔

☆......☆......☆

عتیقہ حجلہ عروسی میں مہکتی سانسوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے عدنان کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی تمام تر دعائیں میرے لیے تھی۔ اُس کی فرینڈز اور کزنز اُس سے ریکویسٹ کر رہی تھیں کہ یار نگہت آنٹی کا تعارف ہماری اماؤں سے کروا دو کیا پتہ کب ہمیں اُن کی ضرورت پڑ جائے۔ بہت قیمتی اور نایاب ہیں۔ ارے انمول ہو۔ تین چار آوازیں ایک ساتھ ابھریں عتیقہ ہنسنے لگی۔

''نہیں جی ایسے قیمتی، نایاب اور انمول ہیرے کو میں کسی کے حوالے کبھی نہیں کروں گی، اچھا...... دیکھا کیسی بے مروت نکلی اپنا کام ہوگیا اپنا مطلب نکل گیا تو کیسی آنکھیں پیشانی پر چڑھا لیں اس نے۔

شائستہ شور مچاتی کمرے میں پہنچی ارے لڑکیوں چلو بھاگو ہماری بھابی تھک گئی ہوگی اُسے آرام کرنے دو۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے عتیقہ کی طرف دیکھا تو عتیقہ نے بھی مسکرا کر گردن جھکالی۔

یہ لو میرا اکلوتا پیارا سا ہینڈسم سا سب سے بڑھ کر تمہیں پیار کرنے والا بیٹا بھائی اب تمہارا ہوا شائستہ نے آگے بڑھ کر بھائی اور بھابی کی بلائیں لے لیں۔

رات کا سفر اپنی منزل کی طرف رواں تھا گو پیار کا سفر بھی لمبا تھا جان لیوا تھا کانٹوں سے اٹا ہوا تھا مگر اب پھولوں کی مہکتی پگڈنڈیاں تھیں سرسبز لہلہاتے لمحے تھے گنگناتی فضائیں تھیں۔ زیرو بلب کی ہلکی ٹھنڈی روشنی تھی اور دو مدتوں سے ملنے کی خواہش رکھنے والے اللہ کے اس انعام پر خوشی مسرت اور طمانیت سے بھرے ایک دوسرے میں جذب ہو رہے تھے اور کھڑکی سے جھانکتا چندا مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

ناولٹ

ام ایمان قاضی

کچھ اَن کہی...

''حقیقت میں اس عورت کی جگہ ہے یہ جہاں آج تم کھڑی ہو۔ اس کا یہاں آنا طے تھا۔ یہ میرا اس سے وعدہ تھا جو میں نے آج پورا کر دیا ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو تم یہاں سے جا سکتی ہو۔ مگر میرے بیٹے کو لیے بغیر۔'' اس شخص کو اس وقت نہ تو اس عورت کی......

وہ کسی مجسمے کی مانند ساکت دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جہاں سے ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ باہر گیا تھا۔ چیخ چلا کر اپنے ارادے اس پر واضح کر کے اپنے دل میں اُس کی وقعت کیا ہے یہ بتا کر تب ہی سے وہ بالکل ایسے ہی بیٹھی۔ آج کا دن اُس کے لیے ایک ایسی خوشی لے کر آیا تھا جس کا کوئی انت نہیں تھا وہ اپنی قسمت پر نازاں ہوگئی تھی جب جب یہ سوچا تھا کہ وہ مغرور اور اکھڑ ابندہ اسی کا ہونے والا ہے جس کو اپنا بنانے اور جس کا خود ہونے کی خواہش اُس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی تھی اور جسے وہ خود سے بھی عیاں کرنے سے ڈرتی تھی اور جسے خدا نے بن مانگے اُس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

اس نے اپنا پور پور اُس کے لیے سجایا تھا اور وہ منتظر اُس کی نظر میں اپنے لیے ستائش دیکھنے کی متمنی تھی۔ پھر جب وہ آیا تھا اُس کا دل گویا کانوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ چند لمحے کی فسوں خیز خاموشی کے بعد جیسے کوئی آتش فشاں پھٹا تھا اور اس کے شریکِ حیات سے نکلنے والے الفاظ اسے اپنی اوقات اور حیثیت باور کرا گئے تھے۔ سفید پڑتے چہرے اور کپکپاتے لبوں سے اس نے اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہا تھا مگر مقابل کچھ سننے پر آمادہ ہوتا تب ناں...... وہ صرف اپنی سُنا کر اُس کے روپہلے البیلے جذبات کو اپنے الفاظ، لہجے اور قدموں تلے روند کر جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

جلال احمد کی رضیہ سے شادی اُن کے ماں اور باپ کی ضد کا نتیجہ تھا جو کہ اُن کی اماں کی بھتیجی اور ابا کی بھانجی تھی۔ اَن پڑھ رضیہ معمولی شکل و صورت کی تھی مگر اماں، ابا کے نزدیک وہ جلال کے جیسی ہی اہمیت رکھتی تھی ایک تو اُس کا قریبی رشتہ پھر مربعوں کی اکلوتی اور تنہا وارث تھی رضیہ۔ جبکہ ایم اے پاس جلال کو رضیہ اور اُس کی دولت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنے ساتھ دفتر میں کام کرنے والی طرحدار اور خوبصورت سی شکیلہ کا اسیر تھا۔ مگر ماں باپ کی روایتی حق نہ بخشنے والی دھمکی،

اور اماں کا تین دن کھانا نہ کھانا رنگ لے آیا اور جلال کو رضیہ کو بیاہ کر آنا پڑا تھا۔

کم رو رضیہ کبھی بھی جلال کے دل تک رسائی نہ پاسکی تھی۔ شہیر حسن کی پیدائش تک بھی وہ دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح تھے جو ساتھ ساتھ تو چل رہے تھے مگر دونوں میں محبت' اعتماد اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کم گو اور دبوسی رضیہ اور زیادہ اپنی ذات ے خول میں سمٹتی چلی گئی جب شوہر کا ایسا بیزار رویہ دیکھا تو اب اُس کی کل کائنات شہیر حسن کی ذات تھی۔ شہیر حسن چھ سال کا ہوا تو جلال احمد اور رضیہ دونوں کے والدین حج کے دوران ہونے والی بھگدڑ کا شکار ہوگئے اور اپنے پیاروں کی وفات کے محض تین ماہ بعد جلال احمد شکیلہ کو بیاہ کر لے آئے۔ اور رضیہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''حقیقت میں اس عورت کی جگہ ہے یہ جہاں آج تم کھڑی ہو۔ اس کا یہاں آنا طے تھا۔ یہ میرا اس سے وعدہ تھا جو میں نے آج پورا کر دیا ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو تم یہاں سے جاسکتی ہو۔ مگر میرے بیٹے کو لیے بغیر۔''

اس شخص کو اس وقت نہ تو اس عورت کی آنکھوں میں اپنی کم مائیگی پر بہتا پانی نظر آیا تھا نہ اپنی اس قدر تذلیل پر اُس کا زرد پڑتا چہرہ اور نہ ہی اپنے ماموں زاد اور پھوپوزاد کی شتی القلبی پر لرزتا کانپتا جسم' اُسے بس اس بات سے مطلب تھا کہ وہ اپنے کون سے عمل سے اپنی دلپسند عورت کو خوش کر سکتا تھا' بھلے ہی وہ عمل کسی اور کا دل چیر دیتا یا روح فگار کر دیتا اور ساڑھے چھ سالہ بچے نے پہلی بار یہ جانا تھا کہ برا عمل کیسے اچھی بھلی شکلوں کو بھی مسخ کر کے دکھاتا ہے جیسے اس وقت اسے اپنے باپ اور اپنی سوتیلی ماں کے خوبصورت چہرے کسی عفریت کی مانند نظر آرہے تھے۔ وہ ہولے ہولے قدم بڑھاتا اپنی ماں کے پاس آ گیا جو اس کے باپ کے قدموں میں گری زار و قطار روتی ہوئی گریہ کررہی تھی کہ وہ ساری زندگی اس کے قدموں کی ڈھول بن کر گزارنا چاہتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس بچے کو ماں کا ایسے گڑگڑانا پسند نہیں آیا تھا وہ اُس کا دوپٹہ کھینچ کر اُسے اٹھنے کے لیے کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے' تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں' ان میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر اوپر شفٹ کرلو' ہم جب واپس آئیں تو یہ کام ہو چکا ہونا چاہیے۔'' جلال احمد نے احسان کرنے والے انداز میں کہا اور اگلے ہی پل شکیلہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر اُسے گھر سے باہر لے کر گیا تھا۔ یہیں سے شہیر حسن کے دل میں اُس کے باپ نے اپنی نفرت کا بیج بویا تھا جسے بعد میں نفرت اور بیزاری کا پانی ان کی بیگم شکیلہ دیتی رہی تھیں جو آج بڑھ کر اپنی جڑیں مضبوط کر کے ایک تناآور درخت تھا۔

☆......☆......☆

''اے اٹھو۔'' اُسے جھنجھوڑ کر بے دردی سے جگایا گیا۔ رات چار بجے تک تو وہ اس کی باتوں کو سوچ سوچ کر روتی رہی تھی تب کہیں جاکر نیند نے اکڑے ہوئے جسم' دکھتی آنکھوں اور چکراتے دماغ پر غلبہ پایا تھا۔ اتنا زیادہ کہ وہ عروسی لباس میں آڑی ترچھی سوگئی تھی۔ اب ایکدم اٹھنے پر دماغ ایک بار پھر گھوم گیا کان کا ایک آویزہ سوتے ہوئے گال کے نیچے دبا رہا تھا۔ وہ جگہ اب سرخ تھی اور ہلکی سی چبھن کا احساس بھی تھا۔ سامنے کھڑے خود کو شعلہ بار نظروں سے تکتے وجود پر نظر پڑتے ہی اُسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ حواس باختہ سی وہ بیڈ سے نیچے اتری۔

"آئندہ سے مجھے کوئی بات دہرانی نہ پڑے۔ نہ ہی میں اپنی بات کے بعد ناں سننے کا عادی ہوں۔ ان لوازمات کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں چاہ کے رشتے ہوں۔ سراہنے والی آنکھ اور دل ہو جبکہ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے نہ ہی میری طرف سے کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت ہے۔" وہ غور سے اُس کا سراپا دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔

"جلد از جلد اِن فضولیات سے چھٹکارا پا کر باہر آؤ اور مجھے ناشتہ بنا کر دو۔" حکم دیتا وہ وہاں سے جا چکا تھا جبکہ عبا اس قدر تذلیل پر اپنی ہاتھوں میں منہ چھپا کر ایک بار پھر رو پڑی۔ وہ تو ہمیشہ اُس کی خاموشی اور لیے دیے انداز کو اُس کی بے نیازی سمجھتی تھی مگر وہ تو اُس کی نفرت تھی۔

دوسری عورت کی گرہستی پر اپنے گھر کی بنیاد رکھنے والی شکیلہ کو جلال احمد کی محبت بھی حاصل تھی اور اعتماد بھی' اس کے باوجود کچھ اندیشے ہر وقت اُس کا جی ہولائے رکھتے۔ جلال احمد کی پہلی بیوی کو اس نے کبھی کسی قابل نہ جانا تھا کہ اپنی قدر و قیمت جلال احمد کے دل میں کیا تھی۔ جانتی تھی اُس کی آنکھوں کا کانٹا تو جلال احمد کی اولاد تھی۔ اُس کا بیٹا شہیر حسن جو بظاہر تو چپ چاپ رہتا مگر اُس کی آنکھوں میں چھپی سرد مہری اور نفرت ابھی سے اُس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

اوپر والے پورشن میں بھجوا دینے کے باوجود رضیہ کو اُن دونوں کے ہر کام کے لیے نیچے آنا پڑتا کہ رضیہ کی اس گھر اور اپنے خاوند کے دل میں بے قدری دیکھ کر شکیلہ کے حاسدانہ پن کو شہہ ملی تھی اور اس نے رضیہ کو گویا جوتے کی نوک پر رکھ لیا تھا۔ ایسے میں اس کے بیٹے کا رویہ شکیلہ کو بڑا کھلتا جب رضیہ بھی شکیلہ یا جلال کے کسی کام میں

مصروف ہوتی تب وہ لڑکا کبھی کبھی جارحانہ انداز اپنا لیتا۔ ضد کرتا کہ پہلے اُسے توجہ دی جائے اُس کا کام کیا جائے۔

"عبا! کیا بات ہے بیٹا! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ اٹھو شاباش نہا دھو کر نئے کپڑے پہنو اور خوب تیار ہو جاؤ۔ یہی دن تو ہوتے ہیں عورت کے سجنے سنورنے کے' پھر تو بچوں کے بعد یہ سنورنے نکھرنے کے سارے چاؤ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔" اُس کی ساس ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور اسے صوفے پر گہری سوچ میں مستغرق دیکھ کر پیار سے کہا اور خود آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکیوں سے دبیز پردے ہٹانے لگیں جنہوں نے کمرے میں اندھیرا پھیلایا ہوا تھا۔

عبا چونک کر سیدھی ہوئی۔

"ہونہہ سجنا سنورنا کیسا آنٹی جی...... آپ کے بیٹے نے جب بیوی کا درجہ دیا ہی نہیں ...... پھر یہ سب باتیں تو تب اچھی لگتی ہیں جب دل کی خوشی ساتھ ہو۔" وہ دل ہی دل میں اُن سے مخاطب ہوئی۔

"بس آنٹی دل ہی نہیں کر رہا تیار ہونے کو' میں بس باہر آ ہی رہی تھی۔ آج مجھے آپ سے بریانی بنانا سیکھنی ہے۔" وہ زبردستی خود کو فریش ظاہر کرتی بولی۔

"یہ نہ بتایا کہ آپ کے لاڈلے کا حکم ہے کہ آئندہ اگر اس کی ماں گھر کا کوئی کام کرتی نظر آئی تو اُس کی خیر نہیں ہے اور خبردار جو وہ اُسے پیسٹری بن کر گھومتی پھرتی نظر آئی تو اور سب سے بڑی قدغن یہ کہ اُن کے بیڈروم کی کوئی بھی بات باہر گئی تو وہ دن کیا وہ لمحہ اُس کا اس گھر میں آخری لمحہ ہوگا۔ یہ آخری بات یاد آتے ہی عبا تھرا اٹھی اور اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔ وہ ارے

ارے کرتی رہ گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا! سجنا سنورنا عورت کا حق ہے اور ان دنوں کا سجنا تو عورت کی خوشی کو ظاہر کرتا ہے۔ کام کا کیا ہے، ساری زندگی پڑی ہے کرنے کو، میری اکلوتی بہو ہو تم، میں تو ایک سال پہلے تمہیں کچن میں بھی نہ گھسنے دوں۔ چلو شاباش پہلے خوب اچھا سا تیار ہو کر مجھے دکھاؤ پھر ایک چکر نیچے خالہ کے پاس لگا آؤ۔ تیسرا دن ہے تم نے ایک دفعہ بھی جھانک کر نہیں دیکھا وہاں۔" ان کے اس نئے آرڈر نے عبا کی مزید جان نکالی۔ نیچے جانے پر تو جیسے ہی صاحب بہادر کا آرڈر یاد آیا اُس کی آنکھیں خوف سے ابل پڑیں۔ اس نے کہا تھا۔

"جتنی نیچے والوں سے دور رہو گی اتنا تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ ایک بار نیچے گئی تم تو پھر اوپر آنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔"

"نہیں......" چیخ سے مشابہہ آواز اُس کے حلق سے نکلی جس نے اُس کے ساتھ ساتھ اُس کی ساس کو بھی ڈرا دیا۔

"نہیں...... نہیں...... میں...... میں نے نیچے نہیں جانا۔ میں ابھی آپ کو تیار ہو کر دکھاتی ہوں پھر آپ اور میں مل کر پہلے تھوڑی سی گپ شپ کریں گے پھر مل کر کچن میں جائیں گے۔" تیزی سے کہتی وہ اُن کو حیران پریشان چھوڑ کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

"یہ شادی کے بعد عبا کچھ عجیب حرکتیں نہیں کرنے لگی۔ بتاؤ بھلا نیچے نہیں جانا اور خالہ صاحبہ سمجھیں گی کہ میں نے کوئی پابندی لگائی ہے۔ خود کی اتنی اونچی ناک کہ ایک بار بھی مڑ کر بچی کی خبر نہیں لی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔

انسان زیادتی اور ظلم کر کے بھول جاتا ہے مگر وہ خالق کائنات جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں کے جتنی محبت کرتا ہے اس کے پاس انسان کی نیت کے مطابق پھل موجود ہے جسے وہ اپنے طے کردہ وقت کے مطابق انسان کو دان کرتا ہے۔ بہت خواہش کے باوجود شکیلہ بیگم کے ہاں اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ ڈاکٹروں سے لے کر پیروں فقیروں کے آستانے سب آزما کر دیکھ لیے مگر اُن کے نصیب میں بے اولادی کا دکھ رقم تھا سو سہنا پڑا۔ اس محرومی کو بھی شکیلہ بیگم نے رضیہ کے کھاتے میں درج کر کے از خود بیر تو باندھا سو باندھا جو ہفتے میں ایک آدھ دفعہ جلال احمد پتہ نہیں خوف خدا کے باعث اوپر جاتے تھے یا مرے ہوؤں کا کچھ خیال تھا وہ بھی بند کرا دیا۔

"بہت میسنی بنتی ہے وہ آپ کی چہیتی جسے میرا دل جلانے کو آپ نے میرے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ آج تک اس نے دل سے قبول نہیں کیا مجھے اور اب کی بار جب میں حساب کروایا ہے تو اس میں اسی میسنی کا نام آیا ہے کہ کالا جادو کرا رکھا ہے اس نے۔ ویسے بھی پڑھی لکھی تو کچھ نہیں ہے نا مراد جو کسی گناہ ثواب کا پتہ ہو۔" پڑھی لکھی شکیلہ بیگم نے ایسے دلگیر انداز میں واویلا کیا کہ رضیہ پر ہاتھ اٹھانا ہی پڑا تھا جلال احمد کو، آخر کو چہیتی بیگم کو اتنا بڑا صدمہ دیا تھا رضیہ نے اور وہ جو اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں، گال پر ہاتھ رکھے چپ چاپ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

شکر ہے شہیر حسن گھر پر نہیں تھا ورنہ نجانے کیا ہو جاتا۔ ویسے بھی عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ بولنے لگا تھا۔ باپ جب بلا وہ بھیجتے نیچے جانے کا نام ہی نہ لیتا۔ اگر جو کبھی پدرانہ شفقت سے مجبور اوپر آتے تو اُٹھ کر یا تو کمرے میں بند ہو جاتا یا پھر باہر نکل جاتا۔ اس بات کو شکیلہ بیگم اپنے رنگ

میں بیان کرتیں۔
''دیکھا..... اب آگیا نہ میری بات کا یقین تمہیں جلال احمد! کہ تمہاری بیگم صاحبہ صرف زبان کی کم گو اور شکل کی بھولی ہے ورنہ کرتو توں میں تو پوری ہے ناں۔ آپ کی اولاد کو آپ سے متنفر کر رہی ہے کم بخت..... مجھ سے تو چلو خدا واسطے کا بیر ہے دونوں ماں بیٹے کو' آپ تو باپ ہیں اس کے مگر سلام تک کرنا گوارا نہیں کرتا وہ آپ سے' آج کم عمری میں یہ تیور ہیں اس کے' کل آپ کا گریبان پکڑے گا سو پکڑے گا' مجھے تو ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دینا ہے اس نے۔''
مگرمچھ کے آنسو بہا کر شکیلہ بیگم نے ایک نفرت بھری فضا کو باپ اور بیٹے کے درمیان مزید موافقت کو ہوا دی تھی۔
پانچ دن بُری طرح بخار میں پھنکنے کے بعد آج اُن پر نقاہت حد سے بھی سوا تھی۔
''بے مروت لوگوں میں جا کر وہ بھی ایسی ہوگئی ورنہ خالہ کی صورت دیکھے بغیر دن نہیں گزرتا تھا اس لڑکی کا..... مجھے ہی جا کر خبر لینی چاہیے اُس کی۔'' سوچتے ہوئے وہ آج بہت دنوں بعد ریلنگ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ اوپر پہنچ کر جو منظر نظر آیا وہ دل میں احساس محرومی کو مزید ہوا دے گیا۔ مختصری ٹیبل کے گرد وہ دونوں ماں بیٹا بیٹھے ناشتہ کرتے ہوئے کوئی بات کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں چپ ہوگئے جبکہ سامنے کچن کے دروازے سے گرم پراٹھا لاتی عبا ٹھٹک کر رُک گئی۔
''ارے آئیں ناں آپ رُک کیوں گئیں؟''
اُن کے سلام کے جواب میں عبا کی ساس اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے خوشامد سے بولیں جبکہ اُن کے بیٹے نے ایسا کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ نہ تو اُن کے سلام کا جواب دینے کی زحمت کی نہ ہی اپنی ماں کی طرح ظرف دکھایا گیا اس سے الٹا ماتھے پر بل ہی پڑ گئے تھے اس کے......
''شادی کے بعد لڑکیاں پیا کو پا کر ماں باپ کو بھول جاتی ہیں۔ سنا تو تھا مگر اب تو دیکھ بھی لیا۔'' سانسوں کو ہموار کرتے وہ کرسی پر بیٹھ کر عبا سے مخاطب ہوئیں۔
''یہ میلو ڈرامہ تو چلتا رہے گا۔ تم چل کر میرے کپڑے استری کرو فوراً مجھے نکلنا ہے آفس کے لیے' اور جوتے بھی اچھے سے پالش کردو۔'' وہ کھنکھار کر اٹھا اور اپنی خالہ کے آگے ناشتا رکھتی عبا سے مخاطب ہوا۔
''جی..... وہ میں..... میں نے آپ کے تین چار سوٹ کل استری کر دیے تھے اور آج کے لیے کپڑے نکال کر رکھ آئی ہوں۔ شاید آپ نے دیکھا نہیں۔'' عبا کو خالہ کے سامنے اُس کا یہ انداز نجانے کیوں اچھا نہیں لگا۔ وہ گھبرا کر بولی تھی جبکہ خالہ نے اس کے اس انداز خشمگیں نظروں سے عبا کی ساس کی طرف دیکھا وہ خود بھی بوکھلا گئیں۔
''ہاں ہاں بیٹا! تم نے دیکھا نہیں ہوگا۔ تمہارے کپڑے تیار ہیں' وہ ویسے بھی جب سے شادی ہوئی تھی بیٹے کے تیور دیکھ کر اُلجھن میں تھیں۔ عبا اس کا اپنا انتخاب تھی۔ اپنی مرضی سے شادی کے لیے ہاں کی تھی اس نے' پھر وہ ایسا رویہ کیوں اپنا رہا تھا۔
''امی! آپ بیٹھیں آرام سے۔'' اس نے نرمی سے ماں کو کرسی پر بٹھا دیا۔
''اور تم نے سنا نہیں کہ مجھے وہ اسکائی بلیو سوٹ ابھی ابھی پریس کیا ہوا چاہیے جو کل تم نے دھویا تھا۔ اور تم ابھی تک کھڑی منہ تک رہی ہو۔ ہزار بار کہا ہے کہ مجھے عورت کا مرد کے آگے زبان

چلانا ہرگز پسند نہیں ہے۔'' وہ چلایا تو عبا تیزی سے پلکیں جھپکتی اندر بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے وہ خود بھی جانے لگا۔

''اس لیے تمہارا بیٹا میری بچی کو بیاہ کے لایا تھا کہ اس پر ظلم کر سکے شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور اپنا رویہ دیکھا ہے اس نے۔'' خالہ اپنی فطرت کے مطابق صبر نہ کر سکیں اور ترخ کر بولیں۔ عبا کے پیچھے ترنگ سے چلتا وہ مڑ کر واپس اُن دونوں کے پاس آیا تھا۔

''آپ کی عبا کی زندگی تو اب ایسے ہی گزرنے والی ہے۔ اسے خوشی سمجھیں یا ظلم...... ہاں اگر نہیں منظور تو پھر آپ اپنی عبا کو واپس لے جا سکتی ہیں مستقل...... ہمیشہ کے لیے۔'' ٹیبل پر دونوں ہاتھ ٹکاتے اس نے چبا چبا کر یہ الفاظ خالہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کیے تھے ایسے کہ اس کے لہجے کی سردی ان دونوں کے اندر تک اتر گئی۔ خالہ اور امی دونوں ساکت رہ گئیں۔

''نن...... نہیں ایسا کچھ مت کرنا...... میں...... میں چلتی ہوں۔'' خالہ ہکلاتی ہوئی اٹھیں اور دوبارہ سے سیڑھیاں عبور کر گئیں۔

''بیٹا! کیا ہوگیا ہے کیوں ایسے ہو گئے ہو......؟ تم تو ایسے کبھی بھی نہیں تھے۔ تم تو میرے بہت فرمانبردار...... ادب و آداب رکھنے والے بچے ہو۔'' امی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما اور آنسو بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُن کا بیٹا کسی سے ایسا رویہ رکھ سکتا ہے۔

اس نے ماں کے ہاتھ نرمی سے اپنے چہرے سے ہٹائے انہیں آنکھوں سے لگا کر پھر چوما اور پھر چھوڑ دیا۔

''میں آپ کا بیٹا ہوں امی! کبھی بھی ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ جس سے آپ کو تکلیف پہنچے لیکن میری کچھ اُلجھنیں سلجھانے تک آپ خاموشی سے صرف دیکھیں گی۔ بولیں گی یا روکیں ٹوکیں گی نہیں۔ پھر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے آپ جا کر اپنی سُست الوجود بہو کو دیکھیے کہ میرے کپڑے تیار ہوئے کہ نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کی تاریخ میں، میں آفس شاید ہی پہنچ سکوں۔'' اس نے اتنی جلدی مچائی کہ امی کو اس کے کمرے کی طرف جانا پڑا۔ حالانکہ آج وہ اس سے عبا سے اس کے ایسے رویے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھیں۔

☆......☆......☆

اس کے میٹرک میں بہترین رزلٹ کی خبر سے جلال احمد بے حد خوش ہو کر ڈھیروں مٹھائی کے ہمراہ اوپر آئے تھے۔ اس شہیر حسن نے کہیں باہر جانے یا کمرے میں بند ہونے کی بجائے خود پر بے نیازی کا خول چڑھائے رکھا تھا۔ پھر جب جلال احمد نے اُسے گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرا تھا وہ ویسے ہی ٹس بیٹھا رہا تھا کسی قسم کی کوئی گرمجوشی نہ دکھائی۔

''آپ کو ہی جلدی تھی اوپر آ کر بیٹے کی خوشی میں شریک ہونے کی جس کی کامیابی کی خبر بھی آپ کو لوگوں نے دی اور اس کا رویہ بتا رہا ہے کہ اسے آپ کا یہاں آنا ہرگز پسند نہیں ہے۔ ان کی خوشیاں منانے کو یہ دونوں ماں بیٹے ہی کافی ہیں۔'' شکیلہ بیگم جو ساتھ ہی تھیں کو شہیر کا رویہ ایک بار پھر اُن باپ بیٹے کے درمیان نفرت بھری دیوار کو مزید اونچا کرنے پر مجبور کر گیا۔

''نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... میں اور شہیر بتانے آنے ہی والے تھے۔'' سدا کی ڈرپوک رضیہ بیگم نے گھبرا کر کہا جبکہ شہیر حسن اب

نہ تو بچہ تھا نہ ہی باپ کی اس گھن گرج میں آنے والا جو جب جب شکیلہ بیگم کے کہنے میں آ کر رضیہ پر چیختے تو ماں کی آغوش میں دبک جایا کرتا تھا۔

''امی کی ضرور ایسی کوئی خواہش ہوگی مگر میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی کسی کو بھی بتانے والی میری کامیابیوں پر دعائیں میری ماں کرتی رہی ہیں اور میری تربیت میں انہی کا ہاتھ ہے تو میری خوشیوں پر حق بھی انہی کا ہوا ناں۔'' اس نے خشمگیں نظروں سے شکیلہ بیگم کو گھورا جو چاہتی ہی یہی تھیں کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے مقابل آ کر آخر ایک دوسرے کو دیکھنا ہی پسند نہ کریں۔

''میری باتوں پر تو یقین نہیں آتا آپ کو۔ اب دیکھ لیا ناں جس اولاد کو ہمیشہ سونے کا نوالہ کھلایا وہ کیسے منہ کو آ رہا ہے۔''

''افوہ...... ہر بات میں تمہارا بولنا فرض نہیں ہے۔'' زندگی میں پہلی دفعہ جلال احمد نے جھنجلا کر شکیلہ بیگم کو ٹوک دیا۔ وہ منہ بنا کر دوسری جانب دیکھنے لگیں۔ جلال احمد نے ایک لفافہ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔

''یہ کچھ رقم رکھ لو بیٹا...... اب تم نے کالج جانا ہے تو کافی رقم کی ضرورت ہوگی؟'' رضیہ تو شوہر کی اتنی عنایت پر ہی کھل اٹھیں جبکہ شکیلہ بیگم کے منہ کے زاویے بری طرح سے بگڑ گئے۔ شہیر حسن کچھ لمحے ٹیبل پر پڑے لفافے کو دیکھتا رہا پھر جھٹکے سے سر اُٹھا کر باپ کو دیکھا۔ کیا تھا اُس کی نظروں میں کہ جلال احمد تاب نہ لا سکے اور نظریں جھکا لیں، پھر کھڑے ہو گئے۔

''اچھا ہم اب چلتے ہیں، پھر آئیں گے۔ تم بھی نیچے کا چکر لگا لیا کرو۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولے تھے۔

''اپنی رقم اٹھاتے جایئے جلال صاحب!''

اُس کی بات اور انداز پر جلال صاحب کو جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

''جب سے یہ عظیم خاتون آپ کی زندگی میں آئی ہیں اور آپ نے رشتے ناتے، حقوق و فرائض بھول کر صرف انہی کے فرمودات کے تحت زندگی بسر کرنا شروع کی تھی، ہم نے تب سے ہی آپ کی ان نوازشات کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا۔ آخر کو ہمارے خرچ کی رقم آپ اپنی بیگم صاحبہ کو دیتے تھے کہ پہنچا دی جائے یہ پتہ کیے بغیر کہ وہ رقم کہاں گئی؟ حقداروں تک پہنچی بھی یا نہیں؟'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تو اتنی اچانک بات کھل جانے پر شکیلہ بیگم بغلیں جھانکنے لگیں۔

''حساب کے کھاتے تو مت کھولیں جلال صاحب، خود سے آنکھیں ہی نہیں ملا پائیں گے۔ بہت چھوٹی عمر سے ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر میں اپنا اور اپنی ماں کا خرچا اٹھانا سیکھ گیا ہوں۔ ارے ہمارا حق تو ایک طرف میری ماں کو تو گھر کی ملازمہ سمجھ کر بھی آپ نے کبھی اُس کے کام کا معاوضہ تک نہیں دیا۔ آخر کو صبح نیچے جاتی ہیں تو مغرب کے وقت سارے کام نمٹا کر ہی آتی ہیں آپ کے۔'' اُس کی زبان سے جیسے شعلے نکل رہے تھے مگر لہجہ ہموار تھا۔

''جلال صاحب پر تو یہی صدمہ طاری تھا کہ اُن کی اکلوتی اولاد اُن سے اتنا دور ہو گئی کہ اسے اُن کو باپ بلانا بھی گوارا نہیں تھا، نام لیا تھا اُن کا۔

''بہر حال آج سے میں وہ سلسلہ بھی تمام کرتا ہوں۔ میری ماں آپ کی بیگم کی خدمت کرنے ہرگز نیچے نہیں جائیں گی۔ جاتے ہوئے اپنی رقم اٹھاتے جایئے گا۔'' آخر میں پتہ نہیں کیا ہوا کہ اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے اپنے کمرے

میں گھس گیا۔

☆......☆......☆

خالہ تو جب سے عبا کے یاں سے آئی تھیں۔ خون کے گھونٹ پیے جا رہی تھیں۔ شوہر جو باہر گئے تھے۔ واپس آئے تو تیری طرح اُن کی طرف لپکیں۔

''ارے لاوارث سمجھ لیا ہے کیا میری بھانجی کو...... وہ کچھ بھی کرے گا اور عبا کی خالہ خاموش رہے گی تو یہ بھول ہے اُس کی' ابھی کے ابھی چلیں اور خبر لیں اس خبیث کی۔ آپ کی خاموشی اسے مزید شیر بنا رہی ہے۔'' وہ زور زور سے بولیں اس قدر کہ ہانپ ہانپ گئیں پھر اپنا عبا کے گھر جانا اور اُس کے شوہر کا رویہ بڑھا چڑھا کر بتا دیا۔

''میرے خیال میں مجھے کسی کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے ساری دنیا کی بیویاں ہی شوہروں کے کام کرتی ہیں اس میں ایسی کوئی قابل گرفت بات نہیں ہے۔ اگر اس نے اپنی بیوی کو کپڑے استری کرنے کو کہہ دیا تو۔'' بیزاری سے کہہ کر انہوں نے اخبار اٹھا لیا۔ اُن کی بے نیازی دیکھ کر وہ جل ہی گئیں۔

''ٹھیک ہے! اب جو کروں گی میں خود ہی کروں گی۔ میری بچی کو لاوارث سمجھ لیا ہے اس ظالم نے۔ اس کے ماں باپ مر گئے تو کیا ہوا۔ خالہ تو زندہ ہے ابھی۔'' خالہ چیزیں یہاں وہاں پٹخ کر اپنا غصہ اُن پر نکالنے لگیں۔

کچن کو سمیٹ کر ایک طائرانہ نظر یہاں وہاں ڈالنے پر مطمئن ہو کر اس نے دودھ گلاس میں ڈالا اور اپنے کمرے میں آ گئی جہاں وہ لیپ ٹاپ سے اُلجھا ہوا ملا۔ عبا نے گلاس خاموشی سے جا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود جا کر خاموشی سے سائیڈ میں پڑے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں پہلے دن سے ہی اس کا بسیرا تھا۔ اس پر نظریں جمائے جمائے نجانے کب دماغ قلابازیاں کھاتا کچھ عرصہ پیچھے چلا گیا۔

☆......☆......☆

اس کی خالہ کب اُن کے گھر آئیں اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ ہاں ہوش سنبھالنے پر خالہ کو اپنے ہاں ہی دیکھا تھا کہ نانا' نانی کی وفات کے بعد اُس کی امی بہن کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ ابو کی خواہش تھی کہ خالہ کی شادی اُن کے بھائی کے ساتھ ہو۔ امی اور خالہ بھی رضامند تھیں مگر اچانک ہی خالہ کو اپنے دفتر میں کوئی صاحب پسند آ گئے تھے تو خالہ نے کسی کو بھی بتائے بغیر کورٹ میرج کر لی تھی اور امی' ابو کی بے تحاشا ناراضی پر وہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھیں۔ نہ تو پھر اس گھر میں خالہ کا پھر کبھی ذکر ہوا اور ناں خالہ نے دوبارہ مڑ کر اُن سب کی خبر لی تھی۔

کئی سال گزرنے کے بعد خالہ ایک بار امی کو بازار میں ملیں وہیں دونوں بہنیں خوب جذباتی ہوئیں۔ خالہ نے معافی مانگی تو امی نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ پھر یہ معافی خالہ پر اُن کے گھر کے دروازے ایک بار پھر کھول گئی تھی۔ ابو اگرچہ خالہ سے اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے مگر خالہ کبھی کبھار آ جاتیں۔ امی اور عبا بھی خالہ کے گھر جاتے تھے۔ پھر ایک بار جب وہ خالہ کے گھر آئی تھی۔ اُسے گھر کھلا ہوا ملا تھا۔ مگر گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ خالہ کے نمبر پر کال کرنے پر پتہ چلا کہ وہ اوپر والے پورشن میں تھیں اور اُسے بھی اوپر ہی آنے کو کہا تھا۔ اسی دن اُسے پتہ چلا تھا کہ اوپر والے پورشن میں خالہ کی سوکن اپنے بیٹے کے ساتھ رہائش پذیر تھیں اور خالہ کے شوہر کی

جب طبیعت خراب ہوگئی تو خالہ کو بھی جانا پڑا تھا۔ خالہ کی سوکن بہت نرم خو اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ ستی ساوتری قسم کی۔ وہ جتنی دیر بھی وہاں رہی تھی۔ اس نے اُن خاتون کو اپنے شوہر کے گرد پروانہ وار نثار ہوتے ہی دیکھا تھا۔ جبکہ خالہ مسلسل اُن کو تنقید کا نشانہ بناتی رہی تھیں اُسے یہ بات بری لگی تھی۔

پھر اُس نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔ سنجیدہ اور سرد مزاج سا خالو کا بیٹا جس کا رویہ اُسے سب کے ساتھ عجیب سا لگا تھا۔ وہ کسی کو بھی ملے یا سلام کیے بنا سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس کی والدہ خوامخواہ وضاحتیں دیتی رہی تھیں کہ وہ چونکہ آفس سے تھکا ہارا آیا ہے تو اس لیے کسی سے بات چیت نہیں کی۔ خالو چپ چاپ لیٹے رہے تھے جبکہ خالہ اُن کی اس وضاحت پر ہونہہ کر کے رہ گئی تھیں پھر عبا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نیچے لے آئی تھیں۔

☆......☆......☆

''مراقبے سے باہر نکل کے لائٹ آف کرو۔ مجھے سونا ہے۔'' اس نے اس کے کان کے پاس آ کر اتنی زور سے کہا تھا کہ نیم دراز عبا جو خیالوں میں نجانے کتنی دور نکل گئی تھی ہڑبڑا کر سیدھی ہوگئی۔

''اُف کان کے پردے پھاڑنے ہیں کیا میرے...... آرام سے بھی کہہ سکتے تھے یہ بات۔'' وہ خفگی سے کہہ کر اٹھی۔ دل ابھی تک تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

''تین دفعہ شرافت سے ہی کہا تھا مگر کانوں میں ناک تک میل بھری تھی۔ جسے نکالنا ضروری تھا۔'' اپنا تکیہ سیدھا کرتے اس نے اطمینان سے کہا۔ عبا لائٹ آف کر کے صوفے پر آ بیٹھی۔ نائٹ بلب میں شاید آرام سے بات کرسکوں اس سے۔ اس نے سوچا اور گلا صاف کرتے ہوئے بات کرنے کے لیے پر تولنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ نیند میں چلا جائے۔

''وہ...... سنیں!'' اُس کی جھجکتی ہوئی آواز نے تیزی سے شوہر نامدار کی سماعتوں تک کا سفر طے کیا۔ شہیر حسن کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

''ہوں...... کہو...... مگر جلدی...... میں ویسے بھی عورتوں سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا۔''

''عورت؟'' عبا بڑبڑائی۔

''میں آپ کی بیوی ہوں شہیر جیسے بہت سے لوگوں کے درمیان آپ اللہ اور رسول ﷺ کو گواہ بنا کر لے آئے ہیں۔'' اب کے اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

''مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ جس شہیر کو میں شادی سے پہلے جانتی تھی آپ وہ ہیں؟ یا جس اجنبی شخص کے ساتھ میں گزشتہ اکیس دنوں سے رہ رہی ہوں وہ حقیقت ہے آپ کی...... اور...... اور اگر یہ حقیقت ہے۔ آپ کی مجھ سے بیزاری...... میری تذلیل خصوصاً دوسروں کے سامنے تو پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

شہیر حسن کے دل میں صرف ایک پل کو ملال جاگا تھا مگر اگلے ہی پل ایک تلخ مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی تھی۔

''میں نے تمہیں اتنا حق کبھی دیا ہی نہیں کہ تم میری ذاتیات میں دخل اندازی کرسکو۔ تم سے شادی میری ماں کی خواہش تھی اور اپنی ماں کا ہر حکم مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر تمہیں یہ زندگی پسند نہیں ہے تو واپس اپنی خالہ کے پاس جاسکتی ہو۔ مجھے ویسے بھی تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہہ کر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ گویا بات ہی ختم کردی اور عبا اس قدر

تذلیل پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ آنسو خود بخود اُس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اُس کی آنکھیں اور دل بھلا کیسے دھوکا کھا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

امی اور ابو کی حادثاتی موت کے بعد جب خالہ مستقل اسے اپنے پاس لے آئی تھیں تو کتنا عرصہ ہی زندگی جمود کا شکار رہی تھی۔ پھر جیسے وقت پر گہرے سے گہرے حادثے بھی اپنی دھول ڈال کر اُسے بھولنے میں مدد دیتا ہے اُسے بھی دی تھی۔ وہ یہ غم بھولی تو نہیں تھی کہ بھولنے والا تھا ہی نہیں ہاں زخموں پر کھرنڈ آجانے والی کیفیت تھی۔ پھر جیسے ہی وہ معمول کی طرف لوٹی تھی معمولات زندگی میں خالہ کی سوکن سے بہت متاثر ہوئی تھی چپ چاپ ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے والی وہ سنجیدہ سی عورت جن کا بیٹا بہت اکھڑا اور بدمزاج تھا کہ ایک دو بار خالہ کے کہنے پر اسے رضیہ بیگم کو بلانے جانا پڑا تھا۔ ایک بار تو وہ سو رہا تھا اُس کی بچت ہو گئی تھی۔ دوسری بار جب اس نے خالہ کا پیغام آنٹی کو دیا تھا۔ بیسن پر منہ دھوتا وہ تیر کی تیزی سے اُس تک آیا تھا۔

''کیوں کس لیے آئے میری ماں؟ جا کے کہہ دو اپنی خالہ سے کہ اُن کی مفت کی نوکری کے دن ختم ہو گئے ہیں اب۔ آئندہ تم یہ پیغام لے کر آئیں تو اُٹھا کے اوپر سے نیچے پھینک دوں گا تمہیں۔ نہ یہ آج آرہی ہیں نہ آئندہ کبھی آئیں گی۔ جو کرنا ہے کرلیں نیچے والے......'' اُس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ اتنے غصے سے بولا تھا کہ عبا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اُس کی امی نہیں ہیں...... ہیں کیا کہہ رہے ہو بیٹا! بچی بے چاری کو کیوں ڈانٹ رہے ہو؟'' کرتی رہ گئی تھیں مگر اس کے بس میں اس سے زیادہ ضبط نہیں تھا۔

دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی وہ نیچے آئی تھی اور آ کر کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ خالہ پوچھتی رہ گئیں کہ رضیہ کو بلانے گئی تھی۔ کیا ہوا' مگر وہ کمرہ بند کر کے روتی رہی تھی۔ اس کے دل کو اچھا لگنے والا وہ شخص جس کے انداز اور غصے سے وہ بے حد خائف تھی۔ اس کا ایسا انداز بھلا دل کیسے سہتا' سو خالہ سے اس تذلیل کا ذکر تک نہ کیا تھا اس نے وہ تو گھنٹہ بعد آنٹی خود ہی نیچے آئی تھیں اور شکیلہ بیگم سے درخواست کی تھی کہ وہ شہیر کے آفس جانے کے بعد نیچے آئیں گی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی سب کام نپٹا جایا کریں گی دوسرے وہ اُس کی موجودگی میں ان کو نہ بلوایا کریں۔ حالانکہ عبا کے آنے کے بعد خالہ کے زیادہ تر کام عبا کرتی تھی مگر شکیلہ بیگم کو سوتن پر حکومت کا جو چسکا پڑا تھا اس سے ان کے حاکم طبیعت کو تسکین ملتی تھی۔ اس سے دستبردار ہونے کو ہرگز تیار نہ تھیں اور انہیں شہیر حسن تو زہر لگا کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپکتی نفرت سے وہ خائف بھی تھیں سو اُن کی یہ بات مان لی تھی۔

بہت گہری سوچ میں گم تھا وہ' عجیب سے موڑ پر آ کر زندگی ٹھہری سی گئی تھی بلکہ کسی حد تک اُلجھن کا شکار ہو چلی تھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ اُس کو کسی طور سلجھا نہ پا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں جس لڑکی کو وہ صرف ایک انتقام کے لیے اپنی زندگی میں لے کر آیا تھا نجانے کیوں اس کے ساتھ ویسا سلوک نہیں کر پا رہا تھا جیسا اس نے منصوبہ بنایا تھا۔ اُس کی امی نے جس پل شادی کے لیے اس کے سامنے عبا کا نام رکھا تھا وہ فوراً سے بیشتر انکار کر دینا چاہتا تھا مگر ایک اچھوتا خیال آنے پر اُس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اور اس نے فوراً ہی

ہاں کہہ دی تھی۔ سترہ سال پہلے شکیلہ بیگم نے اُن کی زندگی میں آ کر اس کی ماں کو جوزک پہنچائی تھی اور جس کا سلسلہ آج تک جاری وساری تھا اسے لگا عبا اُس کا بدلہ لینے کا بہترین ذریعہ تھی۔

اس نے شادی کی پہلی ہی رات نہ صرف اس کو خوب برا بھلا کہا بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے وہ اُس کی ماں کی خواہش پر یہاں لائی گئی ہے صرف انہی کی خدمت کے لیے...... وہ اپنی مرضی کی شادی کرے گا۔ اُسے خوب بے عزت کرنے کے بعد اُس کی آنکھوں کے آنسو اور زرد پڑتا چہرہ نجانے کیوں اُسے اندر سے بے چین کر گیا۔

"نہیں مجھے! اس پر ترس نہیں کھانا۔ شکیلہ بیگم کو ویسے ہی کر کے دکھانا ہے جیسے وہ آج تک ان کی زندگیوں سے کھیلتی آئی تھی۔" شکیلہ بیگم کے ظلم وستم یاد آتے ہی وہ موہوم سا خیال بھی مٹ گیا جو اس کو روتے دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اُسے یونہی روتا چھوڑ کر آرام سے کروٹ بدل کر سو گیا تھا کہ اس وقت یہ تصور ہی بے حد خوشگوار تھا کہ جب وہ اپنے ساتھ اپنے خاوند کا پہلی رات ہی کیا تذلیل بھرا رویہ اُس کے خاوند نے اپنایا' اپنی چہیتی خالہ کو بتائے گی تو شکیلہ بیگم کے تلملاتے چہرے کا خیال ہی اُسے اتنا مزہ دے گیا کہ وہ نئی نویلی دلہن کو بھول کر گہری نیند سو گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں اُس کا رویہ اُس کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتا گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اس کے نیچے جانے پر بھی پابندی لگا دی تھی مگر کیا تھا کہ ہر زیادتی کے بعد تھوڑی دیر کو دل میں ایک ملال ضرور جاگتا تھا کہ اس میں اس کا کیا قصور...... مگر پھر سوچتا کہ اس کی ماں اور خود اس کا کیا قصور تھا۔ جو شکیلہ بیگم جب سے ان کی زندگی میں آئی تھی اس کی ماں کو تو نوکرانی کا درجہ دیا تھا سو دیا تھا اُسے بھی باپ کی شفقت اور محبت سے محروم کر دیا تھا۔ اس نقطے پر آتے ہی سارے ملال دھواں بن کر کہیں اڑ جاتے۔

آفس میں وہ بہت دنوں سے عائزہ کے بدلے بدلے انداز محسوس کر رہا تھا اور اپنے اندازے کو پرکھنے کے لیے اس نے اس دن نجانے کیا سوچ کر اُس نے اپنے گھر چلنے کی دعوت کیا دی وہ خوشی سے کھل گئی پھر آفس میں صنف مخالف سے بے حد لیے دیے والا انداز رکھنے والے شہیر نے اپنے گھر عبا کے سامنے عائزہ سے بے تکلفی کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ عائزہ کے پوچھنے پر کہ عبا کون ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی امی کی دور پرے کی رشتہ دار ہے ماں باپ کی وفات کے بعد اُس کی امی اُسے یہیں لے آئی ہیں۔ عبا نے اُن کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے اپنے شوہر کے ان الفاظ پر بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا اور اس کی چہرے کی مسکراہٹ اور جتانے والے آنکھوں کے تاثر نے اُس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی بھر دی۔ اُس کی ساس آج گھر کی کچھ خریداری کے سلسلے میں باہر تھیں سو شہیر نے موقع کو مناسب سمجھتے ہوئے اُسے جی بھر کر جلایا کلسایا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ وہ جا کر اپنی خالہ سے یہ سب بیان کرے تاکہ جب اُس کی خالہ اپنی سگی کے دکھ پر تڑپیں تو ان کی حالت دیکھ کر اُس کے سینے میں برسوں سے بھڑکتی آگ پر کچھ تو سکون کے چھینٹے پڑیں گے۔ دونوں کو کھانا سرو کر کے وہ خود اپنے کمرے میں آ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بری طرح سے رو دی تھی جتنے بھی خود پر

بے نیازی کے خول چڑھا لیتی تھی تو ایک روایتی مشرقی لڑکی ہی جس شخص نے اس دل کو دھڑکنا سکھایا تھا۔ نکاح کے دو بولوں نے اُس کی محبت کو اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر دیا تھا۔ اُس کی بے رخی' بے اعتنائی اور ناگواری سہنا پھر بھی آسان تھا مگر آج ایک دوسری عورت سے التفات سے بری طرح توڑ گیا تھا۔

''ایسے مت کریں میرے ساتھ شہیر' میں مر جاؤں گی۔'' وہ روتے روتے خود سے بڑبڑا رہی تھی جب اُس کی تیز آواز اُس کے کانوں میں پڑی وہ اُسے زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔ عبا اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی جلدی سے اٹھی اور باہر آئی۔

''تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کہ جب گھر میں مہمان آئے ہوں تو میزبان کو چھپ کے نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ چائے بناؤ جا کے۔'' اس کے روئے روئے چہرے نے اگرچہ دل میں ایک ہلکی سی چبھن پیدا کی تھی مگر اس نے لہجے کی تیزی میں اس کو چھپا کر تحکمانہ انداز میں اُسے کہا۔ چائے پیتے ہی وہ عائزہ کو چھوڑنے جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تب اُس کی ساس کی بھی واپسی اسی وقت ہوئی تھی اور کھانے کی میز پر اہتمام دیکھ کر استفسار کیا تب عبا نے ہلکے سے بتایا تھا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ آیا تھا۔ اُن کی حیرت کی حد نہ رہی۔

''لڑکی...... کون تھی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں امی! بتایا نہیں بس فون کر کے اچھا سا کھانا تیار کرنے کا کہا تھا۔'' اُس نے ہلکی آواز میں بتایا۔ جلال احمد کی آمد پر وہ بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

''بھئی آج تو میں اپنی بیٹی کو لینے آیا ہوں۔ تمہاری خالہ بھی بہت اداس ہے۔ تمہارے لیے اور کچھ طبیعت کی خرابی کی بھی شکایت ہے اُسے۔ تمہیں دیکھ کر اچھا محسوس کرے گی۔'' جلال احمد نے دونوں کے سلام کے بعد کہا تھا مگر رضیہ نے بے حد اصرار سے کھانے میں شریک ہونے پر مجبور کیا تو وہ کھانا کھانے بیٹھ گئے تھے اور چائے پینے کے بعد ایک بار پھر اپنی بات کو دہرایا تھا۔

''عبا! اٹھو بچے نیچے چلو! اور یہ صاحبزادے نظر نہیں آ رہے؟'' انہوں نے بیک وقت بیوی اور بہو دونوں کو مخاطب کیا۔

''جی ابھی تو یہیں تھا۔ کھانا گھر پر ہی کھایا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے نکلا ہے۔'' رضیہ نے کہا اور پھر عبا سے مخاطب ہوئیں۔

''چھوڑو بیٹا! میں یہ سب کر لوں گی۔ تم جاؤ اپنی خالہ سے مل آؤ جا کر۔''

''مگر وہ شہیر......'' عبا نے گھبرا کر بات ادھوری چھوڑی۔

''جاؤ بیٹا! میں اُسے بتا دوں گی۔'' انہوں نے محبت سے کہا تو وہ ہچکچاتی ہوئی کسی تیاری کا تکلف کیے بغیر بس دوپٹہ ٹھیک کر کے خالو کے ساتھ ہی نیچے چل دی۔ پتہ تھا کہ اگر اُس کی ساس نے کہہ دیا ہے تو اب بیٹے کو بھی بتا دیں گی۔ دوسرا بہت دن ہو گئے تھے خالہ کو دیکھے اُن سے ملے ہوئے۔ اس دن کے شہیر کے رویے کے بعد وہ دوبارہ اوپر نہیں آئی تھیں۔

خالہ واقعی ہی میں اُسے پہلے سے کمزور لگیں۔ اُسے والہانہ انداز میں خود سے لپٹا کر پیار کیا۔

''بے وفا لڑکی! سسرال کو پیاری ہوتے ہی خالہ کو بھول گئیں۔ مجھ سے تو اب اس گھٹنوں کے درد کے باعث اوپر چڑھنا محال ہے مگر تم نے بھی قسم کھا رکھی ہے نیچے نہ آنے کی یا یہ بھی صاحب

بہادر کا آرڈر ہے کہ نیچے نہیں جانا۔'' انہوں نے لگے ہاتھوں اس کی گوشمالی کر ڈالی۔

''نہیں نہیں خالہ...... مجھے کسی نے منع نہیں کیا بس ویسے ہی گھر کو سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ آپ بتائیں آپ کو کیا ہوا؟ اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہیں؟'' وہ اُن کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔ جبکہ خالو ان دونوں کو مصروف دیکھ کر خود باہر نکل گئے تھے۔

''مجھے چھوڑو تم اپنا حال دیکھو۔ کہیں سے لگ رہا ہے کہ نو بیاہتا ہو۔ ہاتھ' کان' گلا زیور سے خالی ہو تب بھی نو بیاہتا کے چہرے پر جھلکتی خوشی ہی اُن کی خوشحال زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ تم تو خود مجھے اتنی کمزور لگ رہی ہو اور آنکھوں کے گرد حلقے دیکھو ذرا شیشے میں جاکے' تم خوش تو ہو ناں شہیر کے ساتھ عبا' ابھی کے ابھی بتادو مجھے...... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو بچے' تمہارے خالو سے کہہ کے دماغ درست کرادوں گی اُس کا۔'' خالہ کو بہت دنوں بعد عبا نے پرانے جلالی روپ میں دیکھا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔

''ارے نہیں خالہ! بس پہلے پہلے تو دوسرے گھر کے لوگوں کے مزاج' عادات کو سمجھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے ناں۔ آنٹی تو بہت نائس اور بے ضرر خاتون ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے' کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ اُن کا بس نہیں چلتا کہ کسی گڑیا کی طرح سجا کر رکھیں مجھے...... ہاں شہیر تھوڑے موڈی ہیں لیکن بقول آنٹی کے اکلوتے ہیں تو تھوڑے لاڈلے ہیں بس۔'' وہ اپنے ہاتھوں پر نظر ٹکائے کچھ سوچ' کچھ جھوٹ ملا کر اُن کو مطمئن کر گئی۔

سارا دن وہاں گزار کر وہ دھڑکتے دل سے واپس گھر آئی تھی کہ نجانے شہیر کا موڈ کیسا ہو آخر کو بغیر اجازت کے گئی تھی نیچے جس کا وہ پہلے ہی منع کر چکا تھا۔ آنٹی سے مل کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔

''وعلیکم السلام! اسنا آئی ہو اپنی ڈیئر آنٹی صاحبہ کو میرے ظلم وستم کے قصے۔'' اُس کے آہستہ سے سلام کے جواب میں وہ کتاب سے نگاہ اٹھائے بغیر بولا۔

''شکر ہے آپ نے خود اپنے منہ سے تسلیم تو کر لیا کہ آپ جو سلوک مجھ سے روا رکھ رہے ہیں وہ ظلم وستم کے زمرے میں آتا ہے۔ اور خاطر جمع رکھیے میں ہرگز اُن لڑکیوں میں شامل نہیں ہوں جو اپنی سسرال سے پریشانیوں کی گٹھڑی لے کر میکے جاتی ہیں اور وہ بوجھ لے جاکر ماں باپ کے کندھوں پر دھر آتی ہیں۔ خالہ نے میرے والدین کے مرنے کے بعد مجھے ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اب اُن کا ہی احسان مجھ پر بھاری ہے۔''

میری پریشانیاں اور مسائل میرے اپنے ہیں اور انہیں میں نے خود حل کرنا ہے۔ ان کا خالہ سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی میں انہیں یا کسی کو اپنے گھریلو معاملات میں اُلجھانا چاہوں گی۔

''دھلے کپڑوں کا ڈھیر جو وہ دھو کر گئی تھی غالباً آنٹی نے تار سے اُتار کر اندر لا کر رکھے تھے۔ انہیں ایک ایک کر کے تہہ کرتی وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''ٹھیک ہے یہ حربہ کارگر نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں...... اور سہی...... یہ تو طے ہے مس عبا شہیر! کہ تمہاری خالہ کو اس کے کیے کی سزا ضرور دوں گا اور وہ بھی تمہارے ذریعے۔ اسے بھی تو احساس ہو کہ دوسرے کے گھر کی بنیاد کو مکر وفریب سے

کمزور کر کے اس پر اپنے گھر کی بنیاد رکھنے سے کیسے دل اجڑتے ہیں باپ کے ہوتے ہوئے کیسے بچے شفقتِ پدری سے محروم ہو جاتے ہیں۔

''اس پر نظر جمائے جمائے وہ سوچتا چلا گیا۔

''سنو! چھوڑو یہ سب صبح کر لینا۔'' کتاب رکھ کر اس نے عبا سے کہا اور اُس کی آنکھوں کا مخصوص تقاضہ سمجھ کر اس نے باقی کپڑے ویسے کے ویسے رہنے دیئے اور بجھے دل سے اس کے قریب آگئی۔ گزرے ان دنوں میں صرف یہی وقت ہوتا تھا جب وہ کچھ نرم الفاظ کی بھیک اس کی جھولی میں ڈالتا تھا ورنہ اس کے ہر لفظ اور انداز کی بے رخی چیخ چیخ کر بتاتی تھی کہ وہ اُس کی زندگی میں اَن چاہی ہے۔

اگلی صبح رضیہ کے پاس گاؤں سے ان کی خالہ زاد بہن کا فون آیا تھا جو بے حد بیمار تھیں اور اپنے مشکل کے دن میں اپنی واحد خونی رشتہ دار کو اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھیں سو ماں کے بے حد اصرار پر شہیر آفس جانے سے پہلے انہیں گاؤں جانے والی بس پر بٹھا آیا تھا پھر اس بیمار خاتون کے بیٹے کو جو کہ اُس کا کزن ہوتا تھا رشتے میں' اُس کو کال کر کے بتا دیا تھا اپنی ماں کے آنے کا تاکہ وہ انہیں اسٹاپ سے گھر لے جائے۔

عبا کا تو سارا دن رضیہ کے ساتھ ہی گزرتا تھا سو وہ بہت اُداس ہوگئی اُن کے جانے سے پھر کام سمیٹ کر نیچے خالہ کے پاس آگئی تھی۔ پھر خالہ کے گھر ہی اُس نے دوپہر کا کھانا بنایا اور کھایا تھا اور شہیر کے لیے لے کر اُس کے آفس آنے سے پہلے پہلے واپس گھر آگئی تھی۔ اُس کے آنے پر وہ حسبِ معمول اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ کھانا ٹیبل پر لگانے تک وہ تازہ دم ہو کر آ گیا تھا۔

''ویسے مائیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ اماں گھر پر نہیں ہیں تو گھر کیا ساری دنیا ویران لگ رہی ہے۔'' ٹیبل پر بیٹھتے اس نے گویا عبا کے دل کی آواز کو زبان دی تھی۔ وہ کیا کہتی خاموش بیٹھی پلیٹ میں چاول یہاں سے وہاں کرتی رہی۔ شہیر نے بغور اُس کو دیکھا اور نظر چرالی۔ اب جو فیصلہ وہ کرنے والا تھا اس میں اسے جذباتی نہیں ہونا نہ اُس کے بارے میں سوچنا ہے' نہ ہی دل کو اُس کی جانب مائل ہونے دینا ہے جو کچھ دنوں سے ہمک ہمک کر اُس کی حمایت کے راگ الاپ رہا تھا مگر وہ سوچ چکا تھا کہ اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کے لیے وہ کسی کی بھی نہیں سنے گا۔ نہ اپنے دل کی' نہ اپنی ماں کی اور نہ عبا کی۔'' حسبِ معمول وہ اپنی ہی سوچوں میں گم سامنے بیٹھی عبا کو فراموش کر چکا تھا۔

''کیا ہوا...... آپ کھانا نہیں کھا رہے...... اچھا نہیں بنا کیا؟'' اس کی مسلسل چپ اور ذہنی غیر موجودگی کو محسوس کر کے عبا نے پوچھا۔ وہ چونک گیا۔

''نہیں! کھا رہا ہوں۔ تم سے ایک بات کرنی ہے مجھے۔ یہ سب سمیٹ کر کمرے میں آجاؤ۔'' اس نے اسی سوچنے والے انداز میں ایک دو چمچ اور لیے اور ٹشو سے منہ صاف کر کے جاتے جاتے اس سے کہا تھا۔

اب نجانے کون سا بم سماعتوں پر پھوڑنا باقی رہ گیا ہے کیونکہ اس کے ساتھ گزارے ان دنوں میں کوئی ایک خوشگوار جملہ بھی تو اس کے پلو سے نہیں بندھا تھا جس کو سوچ کر وہ خوش ہو لیتی۔ ایک سے بڑھ کر ایک تلخ بات اس کے منہ سے نکلتی اس کے جذبات اور احساسات کا خیال کیے بنا۔ جلد ہی اس نے ٹیبل سمیٹ کر اپنے لیے چائے

بنائی اور اپنا کپ لے کر کمرے میں آ گئی۔
''آپ پئیں گے چائے......'' ٹیبل پر کپ رکھتے اُس نے پوچھا۔ پھر ایک لفظ نہیں سن کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔
''میں شادی کر رہا ہوں۔'' ہر قسم کی بری اور تلخ بات کی توقع کی تھی اس نے وہ اُسے جتا تا رہا تھا کہ وہ اُس گھر میں اُس کی ماں کی پسند سے آئی ہے۔ وہ اپنی پسند سے اپنی مرضی کی لڑکی اپنی زندگی میں لائے گا۔ خالہ اور ساس کے سامنے کتنی بار اُسے سست' لاپرواہ کہہ کر ڈانٹ دیتا۔ خصوصاً خالہ کے سامنے اس کے پکے کھانے میں ہزار نقص نکال کر کھانا پرے کر دیتا۔ مگر آج جو بات اس نے کہی تھی وہ ان سب سے جدا تھی۔ اُسے اندر باہر سے جلا گئی تھی کہ گرم چائے چھلک کر اُس کے ہاتھ کو سرخ کر گئی تھی۔
''سی......'' کی آواز کے ساتھ ڈھیروں آنسو باہر آ کر اُس کا بھرم رکھ گئے تھے۔ ایک پل میں وہ اُس تک پہنچا تھا۔
''ایسے ہی نہیں پھوہڑ کہتا میں تمہیں...... اب دیکھو کیسے ہاتھ جلالیا۔'' اس کے ہاتھ پر کریم لگاتا وہ نجانے اپنا کون سا روپ اس پر آشکار کر رہا تھا۔
''وہ میرے ساتھ آفس میں کام کرتی ہے۔ اس دن میں اُسے اپنا گھر دکھانے لایا تھا۔ تمہیں دکھ ہو رہا ہوگا یہ سن کر...... لیکن کوئی کیسے اپنی پوری زندگی ایک ناپسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزار سکتا ہے...... میں بھی انسان ہوں۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔ تم یہیں رہو گی۔ اسی گھر میں تمہارے ساتھ وہ کبھی نہیں ہوگا جو ابا نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیا تھا۔'' اب وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا اپنی سوچ اس سے ایسے شیئر کر رہا تھا جیسے کسی قریبی ساتھی سے دوسرے کے متعلق بات کر رہا ہو۔
''کچھ کہو گی نہیں؟'' اس کے جھکے سر کو دیکھتے اس نے کہا۔
''آپ کی زندگی ہے...... آپ بہتر جانتے ہیں آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ آپ کو اسی وقت ہی انکار کر دینا چاہیے تھا جب آپ کی امی نے میرے لیے آپ کی مرضی پوچھی تھی۔ میری زندگی کیوں خراب کی آپ نے؟'' چیخ کر کہتے وہ اُس کے قریب سے اُٹھ کر دور جا کھڑی ہوئی اُس کی طرف پشت کیے بے دردی سے آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا اور پھر مڑی۔
''اس سے زیادہ اپنی تذلیل کی اجازت میں آپ کو نہیں دے سکتی...... آپ ایک چھوڑ دس شادیاں کریں لیکن یہ مت بھولیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ مجھے چھوڑ دیں آپ...... ایک احسان آپ نے مجھے اپنانے کا کیا تھا دوسرا اور آخری احسان مجھ پر یہ کر دیں مجھے چھوڑ دیں۔'' بالکل سپاٹ انداز میں اس نے کہا۔ اگرچہ ایسا کہتے ہوئے دل پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ عورت کے لیے مرجانے کے برابر ہوتا ہے اس شخص کو چھوڑ دینے کی بات کرنا جو آپ کے جسم وجاں اور دل کا بلاشرکت مالک ہو مگر بعض اوقات جب بات ذات کی نفی کی آ جائے تو وہ یہ قدم اٹھا ہی لیتی ہے۔
''تمہیں تو میں نہیں چھوڑوں گا عبا کیونکہ تم میری ماں کی خوشی ہو اور اپنی ماں کو میں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا ویسے بھی میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہاری حیثیت' مرتبے اور مقام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔''
''کون سی حیثیت...... مرتبہ اور مقام شہیر

صاحب...... جس کے بارے میں آپ نے مجھے پہلی ہی رات باور کرادیا تھا کہ آپ کی زندگی میں کیا ہے۔ ایک عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے یہ تکلیف نہیں۔ آپ کو مجھے آزاد کرنا ہوگا۔ وہ پھٹ پڑی۔ وہ رات ان دونوں پر ہی بھاری تھی۔ عبا تو صوفے پر بیٹھے بیٹھے ساری رات روتی رہی تھی جبکہ اُسے تکلیف میں دیکھ کر وہ کہاں سکون میں تھا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔

''اب جب میری کامیابی اور انتقام قریب ہے تب میں کیوں خوشی محسوس نہیں کررہا ہوں۔'' کروٹ بدلتے اس نے عبا کی سسکیوں کو اپنے دل پر دستک دیتے سنا۔ عائزہ کو اس نے آفس میں پہلے ہی دن خود پر ملتفت دیکھا تھا مگر دلچسپی نہ ہونے کے باعث کبھی اُس کی پذیرائی نہ کی تھی مگر عبا کے لیے شادی کے لیے ہاں بھرتے ہی اُس نے اُسے اپنے انتقام میں ایک مہرے کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ ایک عورت جو اس کے دل کو پہلی بار اچھی لگی تھی اس سے اتنی تلخ حقیقتیں جڑی تھیں کہ وہ دل کی آواز پر لبیک ہی نہ کہہ سکا تھا۔ نکاح جیسے خوبصورت رشتے نے دل کی پکار کو تیز کردیا تھا جسے وہ عبا کی تذلیل کرکے دبا دیتا تو کبھی تحقیر کے ذریعے اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا۔ عجیب دوراہے پر آ کھڑا ہونے کے باوجود شکیلہ بیگم سے نفرت اور انتقام کی آگ اُسے سوجھ بوجھ بھلائے دے رہی تھی۔ اب وہ ایک ایسی عورت کو اپنے اس انتقام کی نظر کرنے والا تھا جس سے اس کو محبت تھی مگر عبا کو تکلیف میں دیکھ کر شکیلہ بیگم بھی تڑپے گی یہ سوچ اُس کے محبت بھرے جذبوں کو پیچھے دھکیل کر نفرت کی مہمیز کو تیز سے تیز کررہی تھی۔

صبح کے ٹائم جا کر اُس کی آنکھ لگی تھی۔ سوجی آنکھوں اور دُکھتے سر کے ساتھ عبا نے پُرسکون سوئے شہیر کو دیکھا تو دل کیا کہ ابھی جا کر اُسے جھنجوڑ کر جگادے اور گریبان سے پکڑ کر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب لے۔

''یہ تو طے ہے شہیر حسن! تم سے شدید محبت کے باوجود میں اب تمہارے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہوں۔'' فیصلہ کن انداز میں وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور وارڈروب کھول کر نچلے خانے سے ایک بیگ نکالا اور اپنے کپڑے اور جو ضرورت کی اشیاء سامنے نظر آتی گئیں بلا سوچے سمجھے اس میں ڈالتی چلی گئی۔ پھر اس نے بیگ اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور ایک زخمی نگاہ اس ستمگر پر ڈال کر نیچے اترتی چلی گئی۔

خالہ' خالو کوئی سامنے نظر نہ آیا اور نہ ہی فی الوقت وہ کسی کا سامنا چاہتی تھی۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ اپنے بستر پر جا کر ڈھیر ہوئی اور اپنے آنے کا سبب یاد آنے پر ایک بار پھر ڈھیروں ڈھیر رونا تھا اور وہ تھی' ایسی ہی کیفیت میں رات سے بے آرام جسم و دماغ کو جلد ہی نیند نے آلیا۔

خالو نماز سے فارغ ہوکر آئے تو خالہ کو ناشتہ بنانے کا کہہ کر خود اخبار لے کر بیٹھ گئے۔

''سنیں جلال احمد! عبا کا کمرہ کھلا دیکھ کر میں اندر گئی تو بچی وہاں بے خبر سورہی ہے ساتھ ہی بڑا سا بیگ دھرا ہے۔ وہ اتنی سویرے کیوں آئی ہے اتنے بڑے بیگ کے ساتھ' کہیں آپ کے اس خردماغ بیٹے نے نکال تو نہیں دیا میری بچی کو...... ایسا ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا سن لیں آپ۔ یہ جوڑوں کے درد نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ورنہ ابھی کے ابھی پوچھ کے آتی اوپر سے۔'' وہ ناشتے کی ٹرے سامنے رکھتے ہوئے فکرمندی سے گویا ہوئیں۔

''اُفوہ! بچی ہے...... آ گئی ہے ماں باپ کے گھر رہنے تو اب تم پیچھے مت پڑ جاؤ اس بات کے' سونے دو بچی کو اور سکون سے بیٹھ کر ناشتہ کرو۔''

اگر چہ اندر ہی اندر انہیں بھی عبا کا اتنی صبح آنا کھٹکا تھا مگر ظاہر کیے بنا ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شکیلہ بیگم بھی ست روی سے ناشتہ کر رہی تھیں مگر دل میں یہی کھد بد لگی تھی کہ عبا تو اُن کے بہت اصرار پر بھی نہیں آتی تھی رہنے کہ خالہ اوپر سے نیچے دن میں دو تین چکر تو لگا ہی لیتی ہوں پھر رہنے کا کیا جواز بنتا ہے۔

''کیا بات ہے شہیر! کوئی پریشانی ہے کیا؟'' شہیر کی طرف سے پذیرائی کے بعد عائزہ تیزی سے شہیر کے قریب آئی تھی اور اب بریک ٹائم ملتے ہی تیزی سے اُس کے پاس آئی تھی کہ آج کا دن جب سے وہ آیا تھا بے چین اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

''ہوں...... کچھ نہیں۔ بس رات دیر تک فائلز لیے بیٹھا رہا ہوں۔ نیند نہیں پوری ہوئی۔ آؤ لنچ کرلیں۔'' وہ اُسے لیتا ہوا نزدیکی کیفے آ گیا جہاں بریک ٹائم میں تقریباً تمام آفس ورکرز ہی لنچ کرتے تھے۔ کبھی کبھار شہیر اس ٹائم گھر بھی چلا جاتا تھا کہ پندرہ منٹ کی ڈرائیو تھی صرف آفس سے' مگر زیادہ تر باقی ممبران کے ساتھ وہ بھی یہیں لنچ کرنے آتا تھا۔

''پاپا نے کل مجھے بلایا تھا شہیر! میرے لیے دو پرپوزلز ہیں ان کے پاس...... وہ اُن میں سے کسی ایک کو فائنل کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک دو دن میں میرا جواب چاہیے انہیں ورنہ' وہ خود ہی جوان کو مناسب لگا اُسے او کے کر دیں گے...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں ان کو کیا جواب دوں۔'' لنچ کے بعد جب وہ چائے کا آرڈر دے کر بیٹھے تو عائزہ نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے شہیر کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا وہ اُس کی بات کا مطلب سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

''پھر...... تم کیا چاہتی ہو......'' وہ سوچ سوچ کر گویا ہوا۔ عائزہ نے تحیر سے اُسے دیکھا۔

''کیا تم نہیں جانتے شہیر کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ کیا تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کہ تم میری زندگی میں پہلے اور آخری مرد ہو جس کے ساتھ میں نے زندگی گزارنے کا خواب دیکھا ہے۔ پہلے کس کے ساتھ تم نے مجھے اس طرح ہوٹلنگ کرتے دیکھا ہے۔ میں اپنی حدود و قیود کا خیال رکھنے والی لڑکی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر تک چلی گئی ہوں۔ یہاں تک آ ئی بیٹھی ہوں تو ہر کسی کے ساتھ ایسا ہی ہوگا میرا رویہ۔'' بولتے بولتے اُس کی سانس پھول گئی۔

''میں نے اپنے دل میں بہت اونچی جگہ دی ہے تمہیں اور ویسے ہی وہی جگہ تمہیں زندگی میں دینا چاہتی ہوں۔ اس جگہ جاب کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دل نے تمہاری ہمراہی کے گیت گانے شروع کر دیے تھے۔ دو سال تمہاری بے اعتنائی سہی ہے اب جا کے تمہارا رویہ مجھے بتانے لگا ہے کہ محبت کا یہ سفر شروع میں نے اکیلے ضرور کیا تھا مگر اب کچھ عرصے سے تم بھی میرے ہمسفر ہو۔ پھر انجان بننے کا کیا مطلب ہے؟'' وہ پھٹ پڑی۔

شہیر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ کیا کہتا کہ ایک عورت سے انتقام لینے کی اس رہ گزر میں وہ اُس کو خوامخواہ گھسیٹ لایا تھا۔

''میں نے اس سب سے انکار نہیں کیا عائزہ! تم ایک اچھی لڑکی ہو مجھے پتہ ہے کہ تم ایک اچھے

اور شریف خاندان سے ہو۔ اور یہاں میرے ساتھ بیٹھی ہو تو کیوں بیٹھی ہو؟ میں بہت قدر کرتا ہوں تمہاری...... لیکن......''

''لیکن......'' عائزہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''لیکن مجھے وقت چاہیے تھوڑا سا......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''وقت چاہیے...... کیوں شہیر...... تم برسرِ روزگار ہو' گھر ہے تمہارا ذاتی' شادی کے لیے مناسب عمر بھی' پھر کس بات کا وقت' پاپا کا مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ وہ مزید انتظار نہیں کریں گے۔ میں تو اسی دن تمہارا نام اُن کے سامنے رکھنا چاہتی تھی مگر سوچا کہ تمہیں پہلے بتادوں۔'' وہ بے چینی سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں تمہارے پاپا سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔ اصل میں ابھی کچھ خاندانی مسائل ہیں جن کو سلجھانا ہے مجھے...... میری ماں میری شادی اپنی بھانجی سے کرنے کی خواہاں ہیں اور امی کو راضی کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اُن سے بات کرنے کے لیے میں کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ کبھی بھی راضی نہیں ہوں گی اور تمہارے پاپا ایسے کسی بڑے کے بغیر کیسے مجھے رشتہ دے سکتے ہیں؟ یہ ہے ساری کہانی اب بتاؤ۔'' اس نے جھوٹ سچ ملا کر ایک کہانی بنائی اور عائزہ کو سنادی۔ عائزہ کے منہ سے ایک طویل سانس نکلی۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔ نو پرابلم...... پاپا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ سمجھ جائیں گے میری بات...... ویسے شہیر تمہاری امی تو مجھے بہت اچھی اور سافٹ لگیں اگر تم مناؤ گے تو مان جائیں گی۔ ویسے بھی وہ دور گزر گیا جب والدین بچوں پر اپنی مرضی کے فیصلے ٹھونس کر انہیں ناپسندیدہ زندگی گزارنے پر مجبور کرتے تھے۔ تم ضد سے پیار سے کچھ بھی کر کے اُن کو منالو......'' اُس کے اقرار کے بعد عائزہ کا موڈ بہت خوشگوار ہوگیا تھا وہ اُس کی ماں کی ناراضی کو ایک عام سی بات سمجھی تھی۔

''پتہ نہیں مجھے ان کا ماننا مشکل بلکہ ناممکن لگ رہا ہے کیونکہ وہ اپنی بھانجی سے بہت پیار کرتی ہیں۔ فی الحال تمہارے پاپا کی رائے جان لیتے ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔'' وہ سوچ سوچ کے بولا تھا۔

جانتا تھا کہ امی تو کبھی بھی اُس کی دوسری شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گی مگر وہ سوتن کا دکھ کیا ہوتا ہے شکیلہ بیگم کو اس بات کا احساس ضرور دلانا چاہتا تھا وہ بھی اُن کی بھانجی کے ذریعے جس سے وہ بے حد پیار کرتی تھیں۔ عبا کے لیے دل میں محبت ہونے کے باوجود وہ اُسے یہ دکھ دینے کا تہیہ کر چکا تھا کیونکہ اُس کے اندر کا انتقام اُس کی محبت پر غالب آچکا تھا۔

''غضب خدا کا! یہاں تک نوبت آگئی اور تم نے مجھے اب بتایا ہے...... کیا کمی ہے میری بچی میں جو وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ سانپ کا بچہ سپنولیا ہی ہوتا ہے کم بخت نے مجھ سے دشمنی نکالی ہے میں جانتی ہوں اس کی ماں بھی ایسی ہی ہے گھنی...... میسنی' اوپر اوپر سے شریف دکھنے والی مگر اندر سے گنوں کی پوری...... اسی کی شہ ہے یہ سب...... ساس کی شہ ہے۔'' خالہ مٹھیاں بھینچے زور زور سے بول رہی تھیں اس پل ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جا کر شہیر کا گلا دبا دیں۔

''کسی کے دل پر کسی کا کیا زور خالہ! جس طرح شہیر کی امی خالو کو پسند نہیں تھیں انہوں نے آپ سے شادی کی تھی۔ بالکل اسی طرح میں بھی

صرف اس کی ماں کی پسند پر اس گھر میں ہوں۔ اب وہ اپنی پسند کی بیوی لانا چاہتا ہے۔ اس سب میں آنٹی بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں ہے آپ ان کو مت کوسیں۔ بس میں نے سوچ لیا ہے کہ میں نے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔ میں کیسے اپنے شوہر کو ایک دوسری عورت کے ساتھ برداشت کرسکتی ہوں۔ ہزار دعوے ہیں اس شخص کے اس کے گھر میں جو مقام اور جگہ ہے میری وہ وہی رہے گی وہ مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گا مگر میں کیسے......'' عبا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جب سے وہ اٹھی تھی اس وقت سے کئی بار رو چکی تھی۔

''ارے خدا کی مار پڑے کم بخت پر! میرا اور اُس کی ماں کا بھلا کیا مقابلہ وہ ایک کم صورت اَن پڑھ عورت تھی جسے تمہارے خالو کے سر زبردستی منڈھ دیا گیا تھا۔ وہ شروع سے ہی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کے خواہاں تھے اور اس شادی کی اجازت خود رضیہ نے ایک نہیں کئی بار انہیں دی تھی جبکہ تم میں کیا کمی ہے بیٹا' پڑھی لکھی' خوبصورت سلیقے والی میری بچی سب سے بڑی بات اس خبیث کی مرضی شامل تھی۔ وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے۔'' اُسے روتے دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھیں اور شہیر کو کوسنے لگیں۔

''ایک تو تمہاری ساس جا کر بیمار بہن کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئی ہے۔ وہی آ کر اُسے سمجھا سکتی ہے مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے تمہارے میاں کو اور تمہارے خالو سے بھی۔ ہم نے بات کی تو اُس نے کل کی کرنی آج ہی کر لینی ہے۔ کوئی فون نمبر ہے وہاں کا' تمہارے خالو سے کہہ کر فون کرواؤں وہاں۔''

''نہیں نہیں خالہ! اُن کو مت پریشان کریں۔ اُن کی کزن بہت بیمار ہیں۔ آنٹی ویسے بھی زیادہ دن رُکنے والی نہیں ہیں۔ آ جائیں گی ایک دو دن میں اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں نے اب پلٹ کر اس گھر نہیں جانا۔ ساری زندگی اُن چاہی بن کر گزارنے سے بہتر ہے میں اس رشتے سے الگ ہی ہو جاؤں۔'' آنسو پونچھ کر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ شکیلہ بیگم بس اُس کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''پاپا کو تم بہت پسند آئے ہو شہیر لیکن تمہاری امی کی طرح وہ بھی ضد پر اڑ گئے ہیں کہ میری بیٹی کوئی گری پڑی تو ہے نہیں کہ ایسے ہی کسی لڑکے کے ہاتھ پکڑا دوں۔ اُس کا رشتہ لینے اُس کے ماں باپ کو میرے گھر کی دہلیز تک آنا ہوگا۔ کچھ کرو شہیر' پاپا اب میرا رشتہ کرنے میں دیر نہیں کریں گے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔'' وہ بے حد پریشانی سے اُسے بتا رہی تھی آج ایک بار پھر وہ اسی کیفے میں لنچ بریک میں موجود تھے۔ شہیر دو دن پہلے ہی عائزہ کے پاپا سے ملا تھا اور وہی جھوٹی سچی اُن کو بھی سنائی تھی جیسے پہلے اُن کی بیٹی کو سنا چکا تھا۔ ویسے بھی اماں کے گاؤں سے لوٹنے سے پہلے وہ شادی کر لینا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ بے حد خفا ہوں گی مگر وہ انہیں منا لیتا مگر اُن کی موجودگی میں یہ کام ہرگز ممکن نہیں تھا۔

''میں نے کی تھی بات عائزہ! بار بار کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ زبردستی اپنی بھانجی میرے سر منڈھنے کو تیار ہیں۔ اب تو ایک ہی راستہ بچا ہے۔''

''وہ کیا شہیر؟ جلدی بتاؤ۔''

''وہ یہ ہے کہ ہم دونوں اپنے ماں باپ کو بتائے بغیر شادی کر لیں۔ مجھے تو یہی ایک حل سمجھ

میں آیا ہے ورنہ ستر فیصد اولاد کی طرح شاید ہم دونوں بھی اپنے والدین کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو جائیں گے۔'' شہیر نے دھماکا کیا' عائزہ بھی کچھ دیر سناٹے میں گھر گئی تھی۔

''شہیر پوری زندگی ہماری چھوٹی سے چھوٹی منہ سے نکلنے والی فرمائش کو پل بھر میں پورا کردینے والے والدین زندگی کے اہم اور بڑے فیصلوں میں اپنی مرضی کیوں ٹھونسنا چاہتے ہیں؟'' وہ بے حد دکھ سے بولی۔

''بہر حال میں ایک بار پھر پاپا سے بات کروں گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا شہیر! میں تمہیں کھو نہیں سکتی۔'' فیصلہ کن انداز میں کہتے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ سب کچھ من پسند ہونے جارہا تھا پھر بھی نجانے کیوں شہیر کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ وہ تین دن سے اُسے دیکھ نہیں پایا تھا تو دل ایک نظر اُسے دیکھنے کو مچل رہا تھا۔

اُس کی یادیں اُسے تنگ نہ کریں یہ سوچ کر گھر بھی بہت دیر سے جاتا اور رات آنکھوں میں کاٹ کر سویرے آفس آجاتا تھا۔ انتقام کے اس گورکھ دھندے میں وہ عبا کو مہرہ بنا کر شکیلہ بیگم کو سبق سکھانے چل پڑا تھا مگر دماغ نے اسے یہ باور بھی کروادیا تھا کہ عبا پر ظلم کرکے وہ خود بھی بہت کچھ کھونے والا تھا۔ دل کی خوشی بھی اور شاید ذہنی سکون بھی...... روزانہ کی طرح آج بھی وہ رات گئے ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔ جلال احمد اُسے اپنا انتظار کرتے ملے تھے۔

''اتنی دیر سے آتے ہو روزانہ گھر؟ ہاں بھئی بیوی کو ناراض کردیا۔ ماں بھی گھر نہیں ہے تو جو جی میں آئے کرو۔ باپ تو کسی کھاتے میں ہے ہی نہیں۔'' وہ اَن سنی کیے بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ ویسے بھی جس ذہنی پراگندگی کا شکار وہ اس پل تھا کسی بھی قسم کی باز پرس نہیں چاہتا تھا سو خاموش بیٹھا رہا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس بچی کا کیا قصور ہے کہ کبھی اُسے اپنی بے اعتنائی کی مار دیتے ہو' کبھی اُس کی خالہ سے ملنے پر پابندی تو اب شادی کے محض تین ماہ بعد وہ تمہارے لیے اتنی ناگوار ہوگئی کہ تم دوسری شادی کرنے چلے ہو صاحبزادے...... یہ مت بھولو کہ اُس کے ماں باپ نہیں ہیں تو کوئی تم سے پوچھنے والا نہیں ہے۔ جب وہ اس گھر میں آئی تھی میں نے تب سے ہی اُسے بیٹی مان لیا تھا اور وہ میری بیٹی ہی ہے۔'' شہیر تلخی سے مسکرایا۔

''بہت خوب جلال احمد صاحب! اٹھارہ سال میں آپ کو کبھی اپنی سگی اولاد کا تو خیال نہیں آیا۔ چہیتی بیگم کی بھانجی آپ کی بیٹی ہوگئی۔ خیر چھوڑیں یہ قصے تو پرانے ہوئے اب' کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جو قدم آپ کے لیے جائز تھا وہ میرے لیے کیوں نہیں؟ آپ بھی تو میری ماں پر سوکن لے آئے کیونکہ آپ کو بھی تو اپنی پہلی بیوی پسند نہیں تھی۔ میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلا ہوں تو پھر مجھ پر عذر کیوں؟'' تلخی سے بولا تھا۔

''آپ کی بیٹی کو پہلی بیوی بن کر رہنا منظور ہے تو شوق سے رہے یہاں کیونکہ دوسری شادی کرنے کا تہیہ تو میں کرچکا ہوں جس سے مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ چبا چبا کر کہتا وہ بالکل اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جلال احمد سمجھ گئے کہ وہ اس پل اس قدر باغی ہوچکا تھا کہ اس کے سامنے بات کہہ کر گنوانے والا معاملہ تھا سو تاسف سے اُسے دیکھ کر وہاں سے اٹھ گئے۔

اُن کے جانے کے بعد ہاتھ بالوں میں پھنسائے وہ کتنی ہی دیر سوچوں میں مگن رہا اسی

دوران اُسے عائزہ کی کال موصول ہوئی تھی جس میں وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی کہ اس کے پاپا نہیں مان رہے اب وہ جیسے کہے گا وہ کرنے کو تیار ہے۔ اپنے والد کی باتیں اور بازگشت ذہن میں آتے ہی اس نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کل کے دن کا پروگرام سیٹ کیا کہ وہ آفس آتے ہوئے گھر سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آئے' کل ہی وہ نکاح کرلیں گے کیونکہ رضیہ آج اُسے کال کرکے بتا چکی تھیں کہ وہ پرسوں واپس آ رہی ہیں۔ سوجو بھی قدم اٹھانا تھا اُن کے آنے سے پہلے اٹھانا تھا اُسے۔

''کاش تم شکیلہ بیگم کی بھانجی نہ ہوتیں عبا یا میرا سینہ ہی انتقام کی آگ سے نہ جل رہا ہوتا۔'' بیڈ پر لیٹتے ہوئے برابر کے بستر پر نگاہ گئی تو بے ساختہ اُس کا خیال آتے ہی اُس نے سوچا اور زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

صبح کاذب کے قریب جا کر کہیں نیند نے تھکے دماغ وجسم پر غلبہ پایا تھا نتیجہ آفس جانے کا ٹائم بھی گزر چکا تھا جب ایک بار آنکھ کھلنے پر کروٹ بدلتے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے سائیڈ ٹیبل پر پڑے ٹائم پیس پر نظر پڑتے ہی ساری تھکن اور نیند پل بھر میں اڑنچھو ہوگئی۔ آج آفس میں بہت ضروری کام نپٹانے تھے۔ پہلے پہل اسی خیال کے ساتھ ہی دیگر خیالات کی یلغار نے اُسے تیزی سے اُٹھ کر بھاگ دوڑ کرنے پر مجبور کردیا۔

اُسے خیال آیا کہ اس نے تو آج نکاح کا پروگرام بنایا تھا اسی سلسلے میں بھی کچھ ضروری کام کرنے والے تھے۔ ابھی وہ جوتے ہی پہن رہا تھا جب دھاڑ سے دروازہ کھول کر ہانپتی کانپتی شکیلہ بیگم داخل ہوئیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر آنے کے باعث اُن کی سانس بری طرح سے پھولی ہوئی تھی۔

''شہیر...... شہیر...... میرے بچے جلدی سے نیچے چلو۔ عبا ناشتہ بنا رہی تھی پتہ نہیں کیا ہوا بے ہوش ہو کر نیچے گرگئی۔ تمہارے ابا بھی ابھی باہر نکلے ہیں۔ فون بھی گھر پر بھول کر گئے ہیں۔ نجانے کیا ہوا ہے میری بچی کو...... دیکھو تو چل کر۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر شہیر کی سماعتیں ایک ہی جملے پر اٹک گئیں کہ عبا بے ہوش ہے۔

دل میں کب سے پنپتی محبت ایک دم اُمڈ کر سامنے آئی تھی۔ وہ شکیلہ بیگم کو ایک طرف ہٹاتا دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اترا تھا۔ واقعی وہ کچن کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے فوراً ہی اُسے کاندھے پر اٹھایا اور بیرونی دروازہ پار کرکے باہر آ گیا۔ مین روڈ تک چلنا پڑا تھا شکر ہے جلد ہی ٹیکسی مل گئی تھی۔ شکیلہ بیگم لاکھ کہتی رہ گئیں کہ وہ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر وہ اَن سنی کیے باہر نکل آیا تھا۔ صرف تین دنوں میں ہی وہ صدیوں کی تھکی ہوئی لگی تھی اُسے۔

آدھے گھنٹے میں ہی اُسے عبا کے ہوش میں آجانے کے ساتھ باپ بننے کی بھی خوشخبری ملی تھی۔ ایک لمحے کو وہ جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اُسے بلا کر پیشہ وارانہ انداز میں کافی ہدایات کی تھیں جس میں عبا کو ٹینشن سے بچانا اور اُس کی خوراک کا خاص خیال رکھنا تھا۔ وہ کسی سرشاری کے زیر اثر تھا جبکہ اس کے برابر میں عبا خاموش' بالکل گم صم اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجنے میں مگن تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں مین روڈ پر تھے۔ اس بار شہیر نے اُس کا ہاتھ تھام

رکھا تھا۔ پھر اس نے ٹیکسی کر کے اسے بیٹھنے میں مدد دی اور خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کے سیل پر مستقل کالز اور میسیجز آ رہے تھے۔

''شکیلہ بیگم سے انتقام کے چکر میں میں دو معصوم لڑکیوں کو تو رگید ہی رہا تھا کہ دونوں مجھ سے محبت کی قصور وار ٹھہری تھیں۔ مگر میں نے یہ کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسے میں اگر میری اولاد ہوگئی تو کیا ہوگا۔ کیا ایک اور شہیر جنم لے گا......؟ نہیں نہیں۔'' وہ سوچ کر لرز گیا۔

عبا سے چھپی محبت ایکدم ابھر کر سامنے آئی تھی اور آنے والے بچے کے لیے ابھی سے دل میں محبت کے سوتے پھوٹتے محسوس کر رہا تھا وہ' اُس نے ایک نظر پاس بیٹھی بالکل خاموش عبا پر ڈالی پھر کچھ سوچ کر جیب سے سیل نکال کر نمبر ملایا۔ پہلی بیل جاتے ہی دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

''وعلیکم السلام......ٹھیک ہوں میں......میری بات سنو......!'''آج جب میں تمہارے ساتھ مل کر اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ لینے والا تھا۔ تو اللہ نے مجھے ایسی خوشی سے نوازا ہے کہ اس کے بعد بھی اگر میں یہ فیصلہ لیتا تو شاید بہت سے لوگوں کا گناہ گار تو ٹھہرتا ہی خود کو بھی کبھی معاف نہ کر پاتا۔'' عبا نے چونک کر اُسے دیکھا پھر ٹیکسی چلاتے آدمی پر ایک نگاہ کی مگر وہ مگن انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ شاید وہ پروفیشنل لوگ بہت سے لوگوں کے بہت سے راز اپنے سینے میں چھپائے پھرتے ہیں۔

''مجھے معاف کر دو۔ تمہارا گناہ گار ہوں میں' کیونکہ تمہیں بیچ راہ میں لا کر چھوڑا ہے میں نے۔ شکر ہے کہ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے تم اپنے والد کی مرضی سے شادی کر لینا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ پھر کچھ لمحے رک کر دوسری طرف کی بات سنی۔

''مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے عائزہ کہ مجھے تم سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ محبت تو میں کل بھی اپنی بیوی سے کرتا تھا اور آج بھی اُسی سے کرتا ہوں بس کسی سے انتقام کا سودا دل و دماغ پر سوار تھا کہ نہ تو اس سے کبھی اظہار کر سکا نہ تمہیں آگے بڑھنے سے روک سکا تھا۔ اللہ نے مجھے مزید گناہوں سے بچانا تھا اس لیے تو مجھے ہدایت کا رستہ دکھانے کے لیے روشنی کی ننھی کرن عطا کی ہے عائزہ' مجھے معاف کر دینا کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ دنیا کا سب سے بہترین انتقام تو معاف کر دینا ہے۔ میرے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور کرم ہے اس پاک ذات کا مجھ پر کہ مجھے ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی اس نے سبق دے دیا۔ ورنہ تمہارے ساتھ' اپنی بیوی کے ساتھ اپنے بچے کے ساتھ' پتہ نہیں کتنے لوگوں کے دلوں سے کھیلنے چلا تھا میں......''

اُس کی آواز بھیگ گئی۔ عبا لمحوں میں ہی ساری کہانی جان گئی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ابل پڑے۔

شہیر حسن اب بھی عائزہ سے معافی تلافی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا مگر اب اس نے بات کرتے کرتے عبا کے آنسو پونچھ کر ایک بازو اس کے گرد حمائل کر کے جیسے ایک خاموش سہارا فراہم کیا تھا۔ کافی دنوں سے اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار عبا بھی شاید اسی انتظار میں تھی جو فوراً ہی اس کے کاندھے پر سر رکھ کر پُرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ اب زندگی کا سفر بہت حسین گزرنے والا تھا۔

☆☆......☆☆

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی   فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

افسانہ

ماہ وش طالب

دستک

" تم نے خط میں اپنے آنے کی اطلاع اور تاریخ دی تھی، عبداللہ تو اسی دن سے انتظار میں تھے، وہ آج صبح دس بجے نکل گئے تھے" بظاہر ضبط کرتی سکینہ کا لہجہ نمناک تھا۔ " اتنے ہجوم میں، میں کہاں نظر آیا ہوں گا ان کو، آپ لوگ مجھے تو بتا دیتے، وہ بیچارے وہاں پریشان ہو رہے ہونگے" تمیم کو......

الہٰی مسجد کے خاکستری میناروں سے صدائے اذاں بلند ہوتی دیرا لیح کی بستیوں تک گونجی تی، جہاں چونے کے پتھر کے درودیوار والے گھروں میں سے ایک گھر میں خوشی کا ساماں بندھا تھا، لہٰذا اہل مکیں پر دوہری نماز واجب ہوتی تھی، عبداللہ کو پروردگار نے پانچ سال بعد اولاد کی خوشی سے نوازا تھا، برآمدے میں پڑے پلنگ پر لیٹی سکینہ کے چہرے پر الوہی چمک تھی جس کے دائیں پہلو میں، کچھ گھنٹے قبل آنے والا بچہ تھا۔

امن کے پرندے مشرق سے اڑانیں بھر رہے تھے اور گلِ لالہ اپنے جوبن پر تھا۔

☆......☆......☆

پیلی دھوپ اس گھر کے آنگن میں پہرہ دیئے بیٹھی تھی، ایسے میں جاڑے کی شدت مانند ہوگئی۔

" اُمِ کلثوم سکون سے بیٹھ جاؤ، کیوں بے چینی پھیلائی ہوئی ہے؟" کمرے میں بستر درست کرتی سکینہ، کب سے صحن میں ٹہلتی اُمِ کلثوم کو دیکھ رہی تھی۔

جب تک تمیم بھائی نہیں لوٹ آتے، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

وہ بھی اپنی جگہ حق پر تھی، اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اس کا لاڈلا، اکلوتا بھائی گزشتہ چار برس سے مصر میں تھا،

پڑھائی مکمل ہونے پر آج وہ مستقل طور پر واپس دیرا لیح آ رہا تھا، عبداللہ صبح ہی اسے لینے کے لئے نکل گیا تھا۔

مگر انتظار کی راہ لمبی ہو رہی تھی اور مسافروں پر پریشانی بسیرا کرنے لگی۔ رابطے کا بھی تو کوئی ذریعہ نہ تھا۔

" اُمِ کلثوم، جاؤ، چھت پر سے کپڑے اتار لاؤ، کہر پھیل رہا ہے۔"

سکینہ خود تسبیح کے دانے گننے لگی۔ قبل اس سے کہ وہ پہلے قدمچے کی جانب بڑھتی، لکڑی کے دروازے پر ہوئی بے چین دستک، ان دونوں کو ساکت کر دینے کیلئے کافی تھی، سکینہ سے پہلے اُمِ کلثوم ڈیوڑھی کی جانب بڑھی، " بھائی!" صبر کا پھل پاتے ہی وہ بے اختیار خوش ہو کر تمیم کے سینے سے لگ گئی۔

" اُمّ! میری جان،،، کیسی ہو؟ " اس نے بہن کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ " تمیم عبداللہ!" سکینہ بھی آگے بڑھی، رسمی سلام ودعا کا تبادلہ ہوا۔

وہ کمرے میں لحاف اوڑھ کر بیٹھ چکا تھا اور آتش دان دھیمے شعلے بھڑکا رہا تھا۔ کچھ ہی پلوں میں اُم کلثوم اس کے لئے گرم گرم شوربہ الفریکتہ لے آئی۔

" ارے دل جیت لیا، جانتی ہو، وہاں ہوسٹل میں تمہارے ہاتھ کا بنا یہ شوربہ بار بار بہت یاد آتا تھا، جیو

ہزاروں سال، میری پیاری بہنا" تمیم کی پذیرائی پر اُمّ کلثوم یوں مسکرائی، جیسے گلِ لالہ شبنم کی پہلی بوند پر کھل اٹھتا ہے۔
سکینہ اسکا سامان دوسرے کمرے میں رکھ کر واپس آئی۔ " تمہارے ابو باہر سے ہی دکان پر چلے گئے کیا؟" سکینہ نے یونہی کہہ دیا، جانتی تھی سارا دن بھی تو دکان نہ کھول سکے اور ذراسی لاپروائی وہ مول نہیں لے سکتے تھے۔
" کیا مطلب؟ ابا کہیں گئے تھے؟" تمیم انجان تھا اور سکینہ یوں ہوئی جیسے گلاب کی پتی نوچ لی گئی ہو۔

☆......☆......☆

" تم نے خط میں اپنے آنے کی اطلاع اور تاریخ دی تھی، عبداللہ تو اسی دن سے انتظار میں تھے، وہ آج صبح دس بجے نکل گئے تھے" بظاہر ضبط کرتی سکینہ کا لہجہ نمناک تھا۔ " اتنے ہجوم میں، میں کہاں نظر آیا ہوں گا ان کو، آپ لوگ مجھے تو بتا دیتے، وہ بیچارے وہاں پریشان ہو رہے ہونگے" تمیم کو افسوس ہوا۔
" کہاں جا رہے ہو؟" اسے کمبل چھوڑ، باہر کی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر سکینہ نے استفسار کیا۔
" ابو کو لینے، آپ پریشان مت ہوں، دروازے کی کنڈی چڑھا لیں۔" وہ لمبے ڈگ بھرتا لکڑی کا گیٹ پار کر گیا۔
" چلو کلثوم، اٹھو اور مغرب کی نماز کی تیاری کرو۔ " سکینہ نے گم صم بیٹھی بیٹی کو ٹہوکا دیا۔
گلیوں میں بھٹکتی شیریں، بہت مشکل سے اس گھر تک پہنچی تھی " اللہ کے واسطے جلدی دروازہ کھولو۔ " وہ مضطرب سی خود کلام ہوئی، " اُف شیرین، تم نے ڈرا ہی دیا، کیا آفت آگئی ہے؟" کلثوم جو اس دھیان میں بھاگ کر دروازے کی طرف لپکی تھی کہ ابو اور بھائی ہونگے اسے دیکھ کر مایوس ہوئی اور نتیجتاً اسی پر کوفت کا اظہار کیا۔ " تمیم واپس غزہ کیوں جا رہا ہے؟" وہ تمیم کی خالہ زاد ہونے کیساتھ ساتھ منگیتر بھی تھی، مگر اسکے منہ سے تمیم کا یوں ذکر چونکا دینے والا تھا۔
" تمہیں کیسے معلوم ہوا" سکینہ بھی صحن میں آگئی۔
" میں اسی طرف آ رہی تھی، جب تمیم سے راستے میں ملاقات ہوئی۔"
"ہاں وہ تمہارے خالو۔"
" یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں بھیجا ہے، کیا نہیں

جانتے کہ حالات کس قدر خراب ہیں؟" اسے معلوم تھا، تبھی سکینہ کی بات کاٹ دی۔

" کیا ہوا حالات کو؟" اُمِ کلثوم دہل گئی۔

" حالات واقعی ہی بگڑ چکے ہیں، مگر سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ آدھے سے زیادہ افواہیں ہیں۔" سکینہ کی آواز کنویں سے آتی معلوم ہوئی، " ماسی رائی کا ہی پہاڑ بناتی ہے، اسرائیلی سفاکیت پر اتر آئے ہیں" آنسو شیرین کی پلکوں پر چمکنے لگے۔

☆......☆......☆

ساعتوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔

وہ جب وہاں پہنچا تو ایک نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔۔۔ جو اپنے ساتھ خون ریزی کی ایک نئی اور ناقابلِ یقین داستان لایا تھا۔ اس نے غزہ کے ہوائی اڈے کے علاوہ اطراف کے علاقوں کا بھی کونہ کونہ چھان مارا تھا، مگر اس کے والد عبداللہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ حالات قابو سے باہر نکل چکے ہیں، مصر میں رہتے ہوئے خبروں کے ذریعے اسے سب معلومات ملتی رہتی تھی، مگر وہ ہنگامہ آرائی ایک خاص علاقے یعنی یروشلیم تک محدود تھی، جسے وہ محض سیاسی چپقلش قرار دیتا رہا، خط وکتابت کے ذریعے گھر والوں سمیت سب کی خیریت کی خبر الگ سے مل جاتی تھی۔ مگر اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے ملک کو دوبارہ سے آزاد کرانے کا وقت آگیا ہے۔

وہ نجانے کن کن خفیہ رستوں سے بچتا بچاتا کسی چٹیل میدان میں پہنچ گیا، جہاں عورتوں کی چیخ وپکار اور شیلنگ اذیتناک تھی اور قبل اس سے کہ وہ مزید کچھ اور دیکھ پاتا، اسرائیلی فوج کی جانب سے مسلسل ہوتے پتھراؤ کی زد میں وہ بھی آ گیا۔ بڑی زوردار فائرنگ ہوئی تھی۔ اسکی پتلون میں جا بجا چھید ہو چکے تھے۔ اپنی زخمی ٹانگ سہلاتے وہ خود کو بچانے کی سعی میں بھاگا تھا، اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہا تھا مگر بھاگتے ہوئے وہ کسی سخت شے سے ٹکرایا تھا، اس نے بے دھیانی میں اس پر نظر کی، وہ کوئی گردن کٹی لاش تھی۔ اس نے رک کر دیکھا اور اسے لگا اس کی سانس گھٹ رہی ہے۔ وہ عبداللہ کی لاش تھی۔

☆......☆......☆

"ہاں" کچھ لمحوں کیلئے سکینہ کی آنکھ لگی تھی، پسینے سے تر بتر پیشانی لئے وہ اٹھ بیٹھی، اُمِ کلثوم فوراً اسکی جانب بڑھی، دونوں نے محض ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا اور پھر نظریں چرالیں۔ تمیم کو گئے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا، وسوسے یقین میں بدلنے کو تھے۔ شیرین انہیں تسلیاں دے کر واپس چلی گئی تھی اور وہ دونوں وہاں، ذاتِ واحد کے سہارے پڑی رہ گئیں۔

اُفق پر لہو رنگ لالی لئے ایک طویل دن کی شروعات ہو چکی تھی۔ اُمِ کلثوم قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹ رہی تھی، جب دروازہ زور سے بجا۔ "الٰہی خیر" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

☆......☆......☆

" صبر کرو، بھائی یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا۔" حملہ آور اس علاقے کو برباد کر کے اب آگے بڑھ چکے تھے، دو چار افراد جو قسمت سے بچ گئے تھے۔ وہ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد ایک دوسرے کے غم گسار بنے بیٹھے تھے۔

" کیا تمہارے سب گھر والے مارے گئے؟" وہ شخص پھر سے مخاطب ہوا اور تمیم، جو اس عرصے میں یہ بات واقعی ہی بھول چکا تھا کہ اس کی کوئی ماں اور بہن بھی ہے، بری طرح ٹھٹکا تھا، وہ دیوانہ وار اٹھا۔

" کہاں جا رہے ہو، کیا اس لاش کو یونہی چھوڑ جاؤ گے، ان (گالی) کے لئے جو مردہ کی بے حرمتی کرنے میں بھی لطف اٹھا رہے ہیں۔"

تمیم کے قدم تھم گئے۔ "میری بہن اور والدہ اکیلی ہیں، بتاؤ میں کیا کروں، مردہ کی حفاظت کروں یا زندوں کی آبرو بچاؤں؟"

جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا "اگر میں وہاں گیا تو وہ لوگ مجھ سے ابو کی بابت پوچھیں گے، ابتک تو انہیں حالات کا پتہ چل گیا ہوگا، نجانے کس اذیت میں ہونگے۔" "تم یہاں اس کو دفنانے کا انتظام کرو، میں جاتا ہوں۔"

"اور تم..... تمہارے اہل خانہ؟"

" وہ سب ذبح کئے جا چکے اور مجھے شاید انکے چیتھڑے اکٹھے کرنے کیلئے زندہ رکھا گیا ہے۔" اسکے الفاظ ہی نہیں انداز بھی ایسا تھا جیسے واقعی کسی جانور کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ تسلی دینے کی کوشش میں تمیم کی زبان لکنت زدہ ہو گئی۔ "میرے بھائی اگر میں لوٹ آیا

تو جو خبر مجھے مل سکی، میں تمہیں بتادونگا، اور اگر واپس نہ آسکا تو مجھ پر فاتحہ پڑھ لینا۔"

یہودی فوج نے دیرالبلح کے علاقے کو بھی گھیرے میں لے لیا تھا۔ دیواروں کے پار سے آتی سسکیوں اور دلدوز چیخوں نے دروازہ کھولتی اُمِ کلثوم کو تھرّا کر رکھ دیا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے قفل کھولا اور پھر وہ اپنی وحشت ناک چیخ پر قابو نہ پا سکی۔ ادھڑے پیراہن اور بازو کٹے وجود کے ساتھ شیرین کھڑی کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ سکینہ جہاں تھی وہیں ڈھے گئی۔ نجانے کس ہمت سے اُمِ کلثوم نے دروازے کو بند کیا تھا۔ " بھول جاؤ، تمیم کو، دفع کرو عبداللہ کو۔ دینِ حق کی خاطر سب قربان " ہکلاتے ہوئے کہتی، شیرین اپنے آپ میں نہیں لگ رہی تھی۔۔ وہ ہوش میں ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ "خبردار جواب کسی نے دروازہ کھولا"۔ شیرین نے اسے ٹھڈا لگایا اور اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اُمِ کلثوم گھسیٹ کر سکینہ کو بھی اندر لے گئی۔

" تو ہمارے مسلمان بھائی کہاں ہیں، وہ طاقتور تو میں کیوں سورہی ہیں، جو اسلام کے نام پر دنیا کے نقشے پہ قائم ہیں، وہ ان درندوں کے قدم اس پاک سرزمین پر بڑھنے سے روکنے کے لیے کیوں ہماری مدد کو نہیں آرہے، کیا ہم سب توحید اور ختم نبوت کی بنیاد پر ایک ہی لڑی کے موتی نہیں"، اُمِ کی آواز ہچکیوں کی زد میں تھی۔

" اللہ۔۔۔ بس اللہ ہے ہمارا۔ " شیرین کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں

" لیکن یہ ملعون یہودی کچھ بھی کرلیں، سمندر بھر لیں ہمارے لہو سے، اپنے ناپاک ارادوں سے ارضِ مقدس کو منہدم نہیں کرسکیں گے کبھی بھی"

" یہ۔۔۔ بر۔۔۔ بریت کی جو۔۔۔ مثا۔۔۔ل قائم کر رہے ہیں، اسے دیکھ کر تو چنگیز خان بھی دنگ رہ " شیرین جواب تک بیٹھی بھی نہ تھی۔۔۔ دھڑام سے پتھریلے فرش پر گر چکی تھی۔۔۔ اُمِ ایک بار پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔۔۔ سکینہ بھی ہوش میں آئی۔ لیکن وہ اپنے ہوش میں آنے پر پچھتانے لگی تھی۔ ایک بار پھر دروازے پر بے ڈھنگی سی دستک ہوئی۔۔۔ یہ آخری دستک تھی، جو متواتر ہورہی تھی۔۔۔ وہ دونوں ساکت و جامد بیٹھی رہیں، اس بار کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہ کی۔

☆.......☆.......☆

وہ اسکے بتائے گئے پتے پر پہنچا تھا، ساٹھ منٹوں سے وہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، اس نے بہتیرے واسطے دیے، مگر مکین شاید بالکل مایوس ہوچکے تھے اور بے یقین بھی، اردگرد بارود کی بو پھیلنے لگی تھی۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لوٹنا پڑا، اور ابھی وہ صرف گلی کے نکڑ سے ہی مڑا تھا کہ اپنے " ٹھاہ " کی دھماکے دار آواز سنی، اسے اپنا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا، اسے لگا وہ کئی ہزار ذروں میں بکھر رہا ہے۔

☆.......☆.......☆

" تمیم نے جیسے تیسے کر کے عبداللہ کو دفنا دیا تھا، مگر ایسا کرتے کرتے اس نے کئی سانسوں کو زندہ دفن ہوتے دیکھا تھا، خون بارش کی مانند بہہ رہا تھا کہ اسکی اپنی آنکھیں بھی لہو رنگ ہوچکی تھیں، انتظار، اذیت کا روپ دھارنے لگا تو وہ دیرالبلح کی جانب بڑھ گیا۔۔۔ پتھر، لاٹھیاں کھاتے، کبھی کسی لاش کو ڈھانپتے وہ جہاں پہنچا، تو وہ اس کا گھر نہیں تھا، وہ کٹے ابدان کا میدان تھا۔ سفید در و دیوار راکھ اور خون میں نہا گئے تھے۔ کوئی غیر مرئی قوت تھی، جو اسکے قدم آگے بڑھائے جارہی تھی۔ کپڑے اور جسمانی اعضاء ایک ساتھ بکھرے تھے اور پھر اسکی نگاہ ایک ہرے رنگ کی پوشاک پر پڑی، اس سارے عرصے میں وہ پہلی بار زاروقطار رویا تھا، وہ اسکی اُمِ کی پوشاک تھی۔

" اللہ اکبر، اللہ اکبر! " گریہ زاری کہ بعد اس نے کہا " اسی راکھ سے،،، اسی راکھ اور خون سے تمہاری نسلوں کو غسل دیا جائے گا۔۔۔ تم چاہ کر بھی ہماری جڑیں نہیں اکھاڑ سکتے، کوئی آئے گا،،، ہم میں سے ہی کوئی آئے گا، جو تمہیں شکست دیکر تمہاری نسلوں کو نیست و نابود کردے گا۔۔۔" وہ چیخ رہا تھا

" سن رہے ہو تم۔۔۔ اے ذلیل و رسوا ہونے والی قوم۔۔۔ سن لو،، ایسا ہی ہوگا۔۔۔ آؤ، ایک آگ کا گولہ مجھ پر بھی چلا دو، چاقو کے وار سے میری بھی گردن اڑا دو۔۔ لیکن تم حق کو پھیر نہیں سکتے۔ " چیختے چیختے اسکی آواز بند ہونے لگی تھی۔

امن کے پرندے اڑنا بھول چکے۔ مشرقی آسمان پر کبھی نہ پر چھٹنے والے سیاہ بادل چھا چکے تھے۔

گلِ لالہ پر پھر کسی نے شبنم گرتی نہ دیکھی۔ اور مسلے ہوئے سیاہ گلاب جابجا بکھرے تھے۔

☆☆.......☆☆☆

گنجے شیطان

اس نے کمرے میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور زور سے دیوار کی طرف پھینکا کہ شاید گدھ ڈر کر اڑ جائیں مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی گنجی گردنیں لپکانے لگے۔ ان کی آنکھیں انار گل کو دہکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ باہر ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چلنا شروع ہو چکی تھیں، انار گل نے ساتھ......

''جانے کہاں سے آگئے ہیں مُردار خور''
انار گل نے ذرا سا دروازہ کھول کر صحن میں جھانکا اور جھٹ سے پٹ دوبارہ بند کر لیا۔

''یوں کب تک میں کمرے میں بند رہوں گی، آدھا دن تو چڑھ آیا ہے''

اس کی بڑبڑاہٹ اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس نے سامنے کی دیوار پر نظر دوڑائی، دیو ہیکل گدھ قطار بنا کر دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لمبی گنجی گردنیں لپکا کر صحن میں جھانک رہے تھے، ان میں چھوٹی گردن والے سیاہ گدھ بھی تھے اور سرخ سر والے گدھ بھی جو کسی اور خطے سے آئے ہوئے لگتے تھے۔ انار گل کو ان کی آنکھوں سے وحشت جھانکتی صاف نظر آرہی تھی۔ مضبوط چونچ اور نوکیلے پنجے ہیبت طاری کرنے کے لیے کافی تھے۔

''جانے بخت خان کدھر رہ گیا، کل کا نکلا ہوا ہے شکار پہ، نا بیوی کی فکر نہ بچے کی''

انار گل نے بخار سے تھکتے ننھے بہرام کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، سر اسی طرح گرم تھا، پانی کی پٹیاں تو وہ رات سے کر رہی تھی مگر کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا بخار میں۔ بچے کی حالت دیکھ کر اپنے شوہر پر اسے دوبارہ غصہ آنے لگا جو کل سہ پہر سے غائب تھا۔

''حد ہوتی ہے لاپروائی کی، بیمار بچہ چھوڑ کر بھی کوئی جاتا ہے ایسے''

انار گل نے کھڑکی سے صحن میں جھانکا، ہوا ٹھنڈی ہو چلی تھی، سہ پہر کی دھوپ سہمی سہمی ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے برفباری ہوگی''

انار گل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ گدھوں کے غول کی وجہ سے ڈر کے مارے صحن میں نہیں جا رہی تھی۔ اس کے دل کے اندر یہ ڈر اور نفرت بچپن سے بیٹھا ہوا تھا جب اس کی لاڈلی بکری لالی نے گندم کھا کر پانی پی لیا اور اپھارے سے مر گئی، پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے لالی کے لیے گڑھا کھودنا ناممکن تھا، اس کے مردہ جسم کو پہاڑوں میں پھینکنا پڑا، وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اگلے روز لالی کو دیکھنے گئی تو گنجے گدھ کریہہ

چیخیں مارتے ہوئے اسے نوچ رہے تھے، اس دن سے ان کے لیے نفرت اور کراہت اس کے اندر پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس میں اضافہ بخت خان سے شادی کے بعد ہوا جو خود بھی ان سے نفرت کرتا تھا۔

"شکر ہے کہ اس مرتبہ کافی ساری خشک لکڑیاں اور چارہ جمع ہے، مہرو اور مرجان بھوکی نہیں مریں گی"

انارگل کو اپنی بکریوں کا خیال آیا۔ اس نے ایک بار پھر غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھا۔

"جانے بخت خان کدھر رہ گیا، خدا خیر کرے"

اب اس کا غصہ فکرمندی میں ڈھل رہا تھا، اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بلاوجہ بخت خان کو کوسے جا رہی ہے، گھر میں خشک گوشت کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا، اسی لیے وہ شکار پر نکلا تھا۔

"مگر جانے آیا کیوں نہیں اب تک"

انارگل کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

باہر اچانک گدھ آپس میں لڑنے لگے، ایک شور وغل تھا جو ہر طرف گونج رہا تھا، بہرام ایک دم سے سہم گیا۔

"بے بے، یہ کیسا شور ہے، بابا کہاں ہیں"

بہرام نے سہمے انداز میں کہا۔

انارگل نے بچے کو بازوؤں میں بھرلیا۔

"کچھ نہیں بے بے کی جان، پرندے ہیں، تم سو جاؤ، دودھ لا دوں تمہیں؟"

بہرام نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ اس کے لیے انگیٹھی پر ہی پتیلی میں دودھ گرم کرنے لگی، کمرے میں دھواں سا پھیل گیا۔ اسے گدھوں کی جلتی بلتی آنکھیں یاد آگئیں اور وہ خوف سے پھریری سی لے کر رہ گئی، کتنی مجنونانہ آنکھیں تھیں، جو درندے کی طرح آنچ دیتی محسوس ہوتی تھیں!!

جنت نظیر سوات کے شہر سیدو شریف کے علاقے

میں پہاڑوں میں گھری یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں وقفے وقفے سے بکھرے ستر اسی مکانات تھے، یہاں میدانی علاقوں کی طرح گھر مسلسل نہیں تھے، بلکہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنے ہوئے تھے، سردیوں کا سارا موسم گھروں میں بند ہو کر گزارا جاتا تھا اور ذخیرہ شدہ خوراک پر گزارہ کرنا مجبوری تھا، پہاڑوں کے درمیان ایک قدرتی جھرنا پانی کی ضرورت پوری کرتا تھا لیکن سردیوں میں یہ بھی جم کر برف بن جاتا تھا، ایسا ہی پتھروں سے بنا یہ چھوٹا سا مکان تھا جس میں بیس سالہ انار گل اپنے شوہر بخت خان کے ساتھ رہتی تھی، پانچ سالہ بہرام ان کا اکلوتا بیٹا تھا، بخت خان نزدیکی شہر سیدو شریف اور مینگورہ میں سیاحوں کے لیے گائیڈ کا کام کرتا تھا، جب تک سوات کی رونقیں بحال تھیں، بخت خان جیسے لوگوں کا روزگار اچھا چل رہا تھا کیونکہ سارا سال یہاں سیاحوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی مگر پھر کہیں سے طالبان آ دھمکے، باغات اجڑ گئے، رونقیں ویرانوں میں ڈھل گئیں، مینگورہ کا گرین چوک پھانسیوں اور لٹکتی لاشوں کی وجہ سے خونی چوک کے نام سے مشہور ہوا، گھروں پر قبضہ ہوا، کاروبار تباہ ہو گئے، مقامی باشندے نقل مکانی پر مجبور ہوئے، غرضیکہ مقامی لوگوں کی نفسیات کا ہر ہر تار خوف سے بُنا لگتا تھا، ایسے میں بخت خان بھی اپنے گھر تک سمٹ کر محدود ہو گیا، اس کے گھر کا چولہا پرندوں کے شکار، گھر کے صحن میں اگائی سبزیوں اور دو بکریوں، مہرو اور مرجان کے دودھ پر چلنے لگا، گرمیوں میں وہ سیدو شریف میں ٹرکوں کی لوڈنگ کا کام کرنے لگا، کچھ عرصہ اس نے مقامی شہد کی مکھیوں کے فارم ہاؤسز اور فش فارمز پر بھی کام کیا مگر کام ملنا بھی محال ہی ہو چکا تھا کیونکہ ہر بندہ بے روزگار تھا، زندگی سسکتی لڑھکتی آگے بڑھنے لگی، خاکی وردی والے جیالے آنے کے بعد مینگورہ کی حد تک تو معاملہ بہتر ہو چلا تھا، مگر زندگی ابھی معمول پر نہیں آئی تھی۔!!

ان علاقوں میں سردیوں میں زندگی کا پہیہ تھم جاتا اور ہر کوئی مکمل طور پر گھر تک محدود ہو جاتا تھا، گزارہ ذخیرہ شدہ خوراک پر چلتا تھا، اس بار بھی بخت خان نزدیکی جنگل اور پہاڑوں کی طرف شکار پر نکلا تھا تاکہ برفباری شروع ہونے سے پہلے پہلے کچھ گوشت ذخیرہ کیا جا سکے، اس کے علاوہ بکریوں کے لیے گھاس سکھا کر جمع کرنا اور لکڑیاں جمع کرنا بھی کئی روز سے جاری تھا، جنگل کی وجہ سے گھاس اور لکڑیوں کا تو کافی بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، اب صرف گوشت جمع کرنا رہ گیا تھا، یہ بخت خان کا روز کا معمول تھا لیکن آج تو دن ڈھل کر شام سر پر آ چکی تھی مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں رہ گیا تھا۔

دیوار پر بیٹھے گدھ جانے کن علاقوں کے تھے، جب سے یہاں انسان لاشوں میں ڈھلے تھے، دور دور سے گدھ آ کر یہاں مقیم ہو گئے تھے، مردہ انسانوں کی بساند جانے کہاں کہاں سے انہیں کھینچ لائی، مانو گدھوں کی تو دعوت ہی ہو گئی، اِدھر لاش لٹکی، اُدھر گدھ غول در غول چوک میں منڈلانے لگے، آبادیاں ویرانوں میں ڈھل گئیں، بھوک میں ان کی جھلاہٹ بھری چیخیں، کھانا ملنے پر خوشی سے لبریز خرخراہٹ نما آوازیں ہر طرف گونجتیں اور لوگ آنکھوں میں آنسو بھرے گھروں میں سہم جاتے، مردار خور تو یہ تھے ہی مگر اب تو ان کے منہ کو انسانی خون بھی لگ چکا تھا، ان کا ٹھکانہ پہاڑوں اور درختوں کی چوٹیاں اور گپھائیں تھیں جہاں وہ پناہ لیتے اور خون کی بو پر لپک کر پہنچ جاتے تھے لیکن ان کو گھری

دیوار پر بیٹھے انار گل نے پہلی دفعہ دیکھا تھا ورنہ وہ صرف لاش پر آتے تھے۔ اس کے رگ و پے میں خوف پنجے گاڑ چکا تھا، اسے معلوم تھا کہ یہ خون آشام جانور ہے جو بھوک کے ہاتھوں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان کی چونچیں ادھ کھلی تھیں، آنکھوں میں وحشت تھی، لگتا تھا وہ کسی بھی لمحے حملہ کر سکتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے پنجے دیوار پر مار رہے تھے۔

''کہاں رہ گئے بخت خان، میں کب تک کمرے میں بند رہوں گی''

انار گل نے دروازے سے جھانکا اور خوف سے جھرجھری لی۔

اس نے کمرے میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور زور سے دیوار کی طرف پھینکا کہ شاید گدھ ڈر کر اڑ جائیں مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی گنجی گردنیں لپکانے لگے۔ ان کی آنکھیں انار گل کو دہکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ باہر ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چلنا شروع ہو چکی تھیں، انار گل نے ساتھ والے کمرے کی وہ کھڑکی کھولی جہاں سے آنے والا راستہ دور تک نظر آتا تھا، تاحدِ نظر کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا، سامنے ہی درختوں سے بھرے وہ پہاڑ تھے جن کی طرف بخت خان گیا تھا، اب اس کے دل میں واہمے پنجے گاڑ رہے تھے، ان پہاڑی جنگلوں میں تیندوا بھی پایا جاتا تھا، کبھی کبھار پہاڑی چیتا بھی آ نکلتا تھا، بخت خان کے پاس تو عام سی پرندوں کے شکار والی گن تھی، کہیں کوئی خونی جانور اس سے نہ ٹکرا گیا ہو، انار گل کی پریشانی اب سہ سمتی ہو چلی تھی، باہر خونی گدھ قابض تھے، بہرام بخار میں جل رہا تھا، بخت خان کا کوئی پتہ نہ تھا کہ کہاں رہ گیا ہے۔ اسے تو سہ پہر کو لوٹ آنا تھا مگر آج شام ہونے کو تھی، ابھی مکمل اندھیرا نہیں ہوا تھا، ملگجا سا اجالا ہر طرف پھیلا تھا مگر پہاڑوں میں سورج ایک دم سے زمین کی گود میں اترتا تھا۔

انار گل مایوس سی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی، بہرام کا بخار کچھ کم ہوا تو اس کی بھی آنکھ لگ گئی تھی، گھر کی دیوار پر گدھ قطار بنائے بیٹھے تھے اور گردنیں لپکا کر صحن میں جھانک رہے تھے، اچانک انار گل کو سامنے والی پگڈنڈی پر کسی کے آنے کا شائبہ ہوا، اس نے آنکھیں ملیں۔ وہ بخت خان ہی تھا، ایک کاندھے پر بندوق اور دوسرے کاندھے پر لٹکتا تھیلا جس میں شکار کیے پرندے تھے، تھیلے کا حجم بتا رہا تھا کہ اس بار بخت خان نے کافی شکار کیا ہے اور شاید یہی اس کے دیر سے آنے کا سبب بنا تھا، وہ اپنی دُھن میں گنگناتا ہوا چلا آ رہا تھا، انار گل اب اس کی آواز سن سکتی تھی، اس کے اندر طمانیت کی لہر دوڑتی چلی گئی، ان دیکھی طاقت اس کے رگ و پے میں در آئی تھی۔

''او یہ خانہ خراب کدھر سے آ گئے، منحوس کا باچہ، رک ذرا، کرتا ہوں تم سب کا علاج۔ گنجے شیطان''

انار گل کو بخت خان کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے پھر کھڑکی سے جھانکا تو بخت خان اپنی گن کندھے سے اتار کر گدھوں پر نشانہ باندھ رہا تھا۔

جانے کیوں ایک تاسف کی لہر انار گل کے اندر لہرائی، وہ چاہتی تھی کہ گدھ بس یہاں سے اُڑ جائیں مگر اسے معلوم تھا کہ بخت خان ان کو زندہ نہیں چھوڑے گا، وہ ان کو منحوس سمجھتا تھا، اس کے نزدیک یہ شیطان تھے جو پرندوں کی شکل میں ان کے علاقے کو اجاڑنے آ گئے تھے۔ گدھوں سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس کی نفرت کا سبب اس کا دادا تھا جو سید و شریف کے مدرسے سے پڑھا ہوا تھا، اکثر گدھ دیکھ کر کہتا تھا کہ انہوں نے ہابیل کی لاش کی طرف لپکنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا، جھپٹنا، لپکنا، کاٹنا، نوچنا ان کی سرشت میں ڈال دیا گیا ہے۔ انار گل نے آنکھیں بند کرلیں، اگلے ہی لمحے بس ان کے مردہ جسم دیوار کے پاس تڑپ رہے ہوئے، یہ معلوم تھا انار گل کو۔!!

☆......☆......☆

دیوار پر بیٹھے سارا دن بیت چلا تھا، ان کی آنکھیں حلقوں میں کسی سرچ لائٹ کی طرح گھوم رہی تھیں، لمبی گنجی گردن اور سرخ کلغی والے گدھ جن کا سینہ تھوڑا سا سفید تھا، کلبلا رہے تھے، دیوار پر بے چینی سے دوڑ رہے تھے جب کہ چھوٹی گردن والے امریکی علاقوں کے مہاجر سیاہ گدھ تھوڑے سے پرسکون تھے مگر ان کے سکون میں بے سکون کا پرتو واضح دکھائی دے رہا تھا، وہ پہلی بار درختوں کی بلندیوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، ویران حویلیوں کی ممٹیوں، سنگلاخ پہاڑوں سے مردار کی باس کے بغیر آباد گھر کی دیوار پر اترے تھے، اسی وجہ سے بے چین تھے، انہوں نے ایک خاص بو کے آئے بغیر انسان سے پرے رہنا سیکھا تھا، آبادیاں انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں، ویرانے ان کو بھاتے تھے، اسی وجہ سے وہ زندہ انسانوں، جانداروں کے قریب نہیں پھٹکتے تھے مگر آج عام دن نہیں تھا، انہیں یہاں آنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اب تو دیوار پر پاؤں جمانا بھی دو بھر ہو چکا تھا، بڑے گدھ نے پنجے مضبوطی سے دیوار کے کنگرے میں گاڑ دیے تاکہ گرنے سے بچ سکے، ارد گرد کا منظر دھندلا رہا تھا، شاید شام ہو چکی تھی!!

جب سے خاکی وردیوں والے آئے تھے، ان کو لاشیں ملنا بند ہو گئیں تھیں، اکا دکا لاش کسی ویرانے میں مل بھی جاتی تو گدھوں کی تعداد علاقے میں اتنی بڑھ چکی تھی کہ چند ایک کے حصے میں ایک دو لقمے ہی آپاتے تھے، وہ جو روز ضیافت اڑایا کرتے تھے، جسم و جان کا رشتہ جوڑے رکھنے سے بھی لاچار ہو گئے تھے، اسی لیے وہ اس قریبی گھر کی دیوار پر بیٹھے تھے، صبح سے شام ہو چکی تھی، دن کا اجالا رات کی سیاہی نگلنے کو تیار کھڑی تھی، برفیلی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، جسم سے جیسے سکت ختم ہو چکی تھی، ساتھ بیٹھے امریکی گدھ نے بے چینی سے دیوار پر چونچ ماری مگر پتھر کے ذرات کے سوا منہ میں کچھ نہ آسکا، چار دن سے ان کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا، خالی معدہ گٹر گٹر کر رہا تھا، آنکھوں کی روشنی دم توڑ رہی تھی، سارا دن صحن میں جھانکتے گزر گیا تھا مگر کھانے کو کچھ نظر نہیں آیا تھا، اندر کے کمرے سے ایک خوبصورت لڑکی جھانکتی تو وہ بے چارگی سے اسے تکنے لگتے کہ شاید ان کی مردہ اور بجھتی آنکھوں کو پڑھ سکے مگر وہ لڑکی دوبارہ دروازہ بند کر لیتی، ایک بار تو اس نے کچھ پھینکا بھی جسے وہ گوشت کا پارچہ سمجھے مگر وہ لکڑی کا ٹکڑا تھا، امید دم توڑ گئی اور اب لمبا اندھیرا سامنے تھا جس کا کوئی انت نہیں تھا، ان میں سے کئی دیوار سے گر چکے تھے اور بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ دیوار کی پچھلی طرف کھٹکا سا ہوا، وہ مینگورہ میں رہتے ہوئے اس آواز کو پہچاننے لگے تھے، یہ بندوق کو ان لاک کرنے کا کھٹکا تھا، عام دنوں میں وہ اس سے ملتی جلتی آواز کے سنتے ہی اڑ جاتے تھے مگر اس وقت پیچھے دیکھنے کی سکت بھی نہیں تھی، کالے گدھ نے گرتی گردن کو ہمت کر کے

شناخت

ایک تربیتی سیمینار میں ''خود حفاظتی'' کا درس دیا جا رہا تھا۔ کورس کے دوران ایک عملی مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ اسٹیج پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نقاب پوش نمودار ہوا اور راہ چلتی خاتون کے ہاتھ سے پرس چھین کر فرار ہو گیا۔ انسٹرکٹر نے حاضرین سے پوچھا۔

''کیا آپ میں سے کوئی اس نقاب پوش کا حلیہ بیان کر سکتا ہے؟''

ہال کی عقبی قطاروں سے ایک خاتون نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''جی ہاں! اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ' وزن ایک سو پچاسی پونڈ' بال بھورے' آنکھیں نیلی اور چہرے پر مونچھیں ہیں۔''

انسٹرکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ نے اتنی تفصیلات کس طرح جان لیں؟''

''بڑی آسانی سے۔'' خاتون نے جواب دیا۔ ''کیونکہ وہ میرا شوہر ہے۔''

حسنِ انتخاب: رازِ عدن۔ بحرین

اٹھایا، آنکھوں کا دھندلا منظر ذرا سا چھٹا، یہ تھیلا اٹھائے ایک قوی الجثہ شخص تھا جو بندوق سے نشانہ باندھ رہا تھا، کالے گدھ نے پر پھڑ پھڑائے مگر اس کے پر محض کانپ کر ہی رہ گئے، موت سامنے تھی!!

☆......☆......☆

بخت خان کی انگلی ٹریگر پر کانپ کر رہ گئی، بڑا سا گدھ دھڑام سے اس کے صحن کے اندر کی طرف گرا، کچھ گدھ باہر کی اوڑ بھی گرے، کچھ گرنے والے تھے، اس نے ٹارچ روشن کی اور کانپ کر رہ گیا، دیوار کے پاس کئی گنجے شیطان بے حس و حرکت پڑے تھے، کچھ پاؤں مار رہے تھے، وہ ساری کہانی سمجھ گیا۔

''یہ اس قابل نہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے، یہ شیطانی بلائیں ہیں، انہوں نے نوچ نوچ کھایا ہے میرے بھائیوں کو''

اس کے اندر غصے کی ایک لہر اٹھی اور اس نے گن سیدھی کی، اسی حالت میں کئی منٹ گزر گئے، اس کے ہاتھ شل ہو گئے، یوں لگا جیسے وہ صدیوں کھڑا رہا تب بھی فائر نہیں کر سکے گا، اس کا دشمن بے بس تھا اور یہی بے بسی اس کو جامد کر گئی، اسے معلوم ہو گیا کہ اب وہ فائر نہیں کر سکتا، وہ بے اختیار اندر کی طرف دوڑا، اسے ان سب کو بچانا تھا۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ گنجے شیطان یہ بے بس پرندے نہیں جن کا رزق ہی اس طرح رکھ دیا گیا ہے بلکہ اصل شیطان تو وہ بندوق والے تھے جنہوں نے اس کے گرین چوک کو خونی چوک بنا ڈالا، اگر پاک آرمی نہ آتی تو آج منظر کچھ اور ہوتا!!

''گلے، گلے۔''

وہ ایک سانس میں چیختا اندر بھاگا اور کانوں پر ہاتھ رکھے، سر کو گھٹنوں میں لیے، فائر کی منتظر انار گل نے حیرت سے سر اٹھایا...!!!

☆☆☆

ناول
زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے **قسط نمبر 7**

''امی! آپ نے وردہ کو کیوں جانے دیا۔ آپ کو معلوم ہے نا وہ تنہا رہنے سے ڈرتی ہے۔'' اروی کی طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اس لیے اب وہ اپنی تکلیف سے ہٹ کر سوچ رہی تھی۔
''کیا کرتی! وہ یہاں رُکنے پر راضی نہیں تھی۔ میں نے سمجھایا بھی تھا مگر...... '' زہرا بات کرتے کرتے ہچکچا سی گئیں۔ مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ وردہ کی بدگمانیاں (جو اُس کے سسرالیوں خصوصاً انعم کے حوالے سے) اُسے بتا کر پریشان کریں۔ اروی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی ورنہ ماں کی ہچکچاہٹ اُسے واقعی پریشان کر دیتی۔
''ہاں...... اُسے اپنے کالج کی فکر ہوگی۔ اُس کے ایگزیم بھی تو ہونے والے ہیں۔'' وہ بدقت اٹھنے لگی۔
''ہا...... ں یہی بات ہے ویسے بھی یہاں ہاسپٹل میں اتنے لوگوں کا رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ تو میں بھی اپنے گھر جاؤں۔'' زہرا نے جلدی سے اُس کے بیڈ کو ریموٹ سے ایک بٹن دبا کر سرہانے کی طرف سے اونچا کیا اور ساتھ ہی اپنی بات بھی مکمل کی دونوں اس وقت کمرے میں تنہا تھیں۔
گھر سے کھانا سوپ چائے وغیرہ وقت پر آ جاتے تھے۔ باری باری زبیدہ، ثمن، سبرینہ اور نیلم بھی چکر لگا لیتے تھے۔ البتہ انعم نہیں آتی تھی یا پھر بی بی جان دانستہ اُسے نہیں آنے دیتی تھیں۔
''امی...... میری وجہ سے آپ سبھی کو کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ ابو بھائی وردہ...... اور یہاں بھی سب...... کیا سوچتے ہوں گے بیٹھے بٹھائے گلے پڑ گئی۔ پہلے میری شادی کا مسئلہ اور اب یہ ایکسیڈنٹ...... '' اروی اپنی سوچیں بیان کرنے سے نہ رہ سکی۔ اُس کے احساس کی اذیت اُس کی روح اب جھیل نہیں پا رہی تھی۔
''اوں...... ہوں...... '' زہرا نے فوراً ہی سرزنش کی۔
''ایسا کیوں سوچ رہی ہو...... سب اللہ کی حکمت و مصلحت ہے۔''

''اللہ تو ہمیشہ ہمارے لیے اچھا ہی کرتا ہے۔ مگر لوگوں کی سوچیں۔ وہ تو چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو بھی دوسروں کی نحوست اور بدنصیبی سے جوڑ دیتے ہیں امی......'' وہ واقعی پریشان تھی۔

اُسے اپنی شادی کے دن برات لوٹ جانے کے بعد اپنوں کے وہ جملے، وہ باتیں، وہ نظریں آج بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اب سسرال میں چند دنوں کے بعد پیش آنے والا حادثہ اُسے خوفزدہ بھی کر رہا تھا کہ نجانے اُس کے سسرال والوں کے ذہنوں میں اس حوالے سے کیا کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اُس کا خیال تھا اس حادثے کا موردِ الزام بھی یقیناً اُسے ہی ٹھہرایا گیا ہوگا۔ زہرا اُس کی بات سنتے ہی چونک کر بے ساختہ پوچھنے لگیں۔

''تم سے ور...... وہ نے کچھ کہا تھا؟''

''ور...... وہ؟ اُس نے کیا کہنا تھا؟'' اروئی کے چہرے پر مزید تفکر پھیل گیا۔ زہرا کو اپنے سوال پر پچھتاوا ہونے لگا۔ وردہ اور اروئی کے درمیان ابھی اتنی باتیں کب ہوئی تھیں۔

''نہ...... نہیں میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ اُسے بھی یہی وہم تھا کہ اس حادثے کو تمہارے سسرال والے تم سے نہ منسوب کر دیں۔ خیر تم یہ سوچ سوچ کر پریشان مت ہو...... تمہاری ساس اور باقی گھر والے کوئی بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔'' زہرا نے اُسے جیسے بہلایا۔

''آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں امی......!'' اروئی اپنی سوچ سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

''کہہ سکتی ہوں...... کیونکہ میں نے سب کو تمہارے لیے بھی اتنا ہی فکر مند دیکھا ہے جتنا اصم کے لیے سب پریشان ہیں۔ بہر حال میں تم سے یہی کہوں گی کہ تم ایسی فضول باتیں مت سوچو اور جلد صحت یاب ہو کر اپنے شوہر کی خدمت کرو...... اُسے تمہاری توجہ ہی جلد صحت یاب کرے گی۔''

زہرا نے چاہا تھا کہ اروئی اپنی سوچوں کے اثر سے نکل آئے اور ایسا ہی ہوا تھا اروئی کی توجہ خود سے ہٹ کر اصم کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ وہ اُسے دیکھنا چاہتی تھی، اُس سے ملنا چاہتی تھی۔ زہرا نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اُس سے زیادہ زخمی اور توجہ کا طالب ہے۔

☆......☆......☆

فائق آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ صالحہ درانی دستک دے کر بیٹے کے کمرے میں چلی آئیں وہ اپنا کوٹ پہنتا قدرے چونک کر متوجہ ہوا۔

''ماما...... آپ...... میں بس آ رہا تھا۔''

''نہیں مجھے تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنی تھی۔ ناشتے کے دوران تمہارے پاپا کے سامنے میں کچھ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی۔''

''انعم کے بارے میں میں بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''تو پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔'' صالحہ بیٹے کی بیزاری دیکھ کر چڑ کر بولیں اور بڑھ کر اُس کے بیڈ کے سرے پر ٹک گئیں۔

''آپ کی بہو آئے دن نیا مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ آپ کب تک اُس کے مسئلے حل کرتی رہیں گی۔'' فائق نے مخصوص تلخ لہجے میں انہیں بہت کچھ یاد کرایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

''میں تمہاری آنے والی اولاد کے لیے سب کچھ فراموش کررہی ہوں۔ تم بھی کچھ لچک پیدا کرو۔ کچھ وقت، کچھ توجہ دو اُسے۔ بچہ آجائے گا تو وہ بھی سنبھل جائے گی۔''

''مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے ماما۔'' ماں کے سمجھانے پر اُس کے لہجے میں استہزاء پھیل گیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' صالحہ زچ ہوگئیں۔

''فی الحال اُسے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی محبتیں سمیٹنے دیں۔ جب اُسے حقیقتاً میری ضرورت و اہمیت کا احساس ہوجائے گا تو پھر میں بھی اُس کے لیے اپنا آپ بدل لوں گا۔'' فائق نے سرد لہجے میں اپنی بات ختم کی اور جلدی جلدی اپنا موبائل، والٹ، کارڈز وغیرہ کوٹ کی جیب میں رکھنے لگا۔

صالحہ درانی کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بیٹے کو کیسے سمجھائیں۔ آخر جھنجلا کر بولیں۔

''فائق...... بچوں والی باتیں مت کرو...... وہ بدلے گی تو تم بدلو گے...... وہ پہلے دن سے ہی ایسی تھی۔ شادی کے شروع دنوں میں تم بھی اُسے لیے اڑ رہے تھے اب وہ اپنی منوانی کی عادی ہوچکی ہے تمہیں ہی کمپرومائز کرنا پڑے گا۔''

''ماما آپ اچھی طرح جانتی ہیں One Sided کمپرومائز سے شادی نہیں چلتی۔ دونوں کو اپنی اپنی کوشش سے اُسے لے کر چلنا پڑتا ہے۔ پلیز ماما صرف 'مجھے' کمپرومائز کے لیے مجبور مت کریں۔'' فائق جیسے اس موضوع سے بیزار اور چڑچڑا نظر آرہا تھا۔ صالحہ کو اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اُن کے دباؤ سے فائق کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالے فوراً ہی مصالحانہ انداز اختیار کر کے بولیں۔

''تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں آج بیت الجنت جارہی ہوں۔ زبدہ بہن سے اس بارے میں طریقے سے بات کروں گی۔''

''جی ہاں آپ انہیں بتادیں کہ اُن کی بیٹی کے لیے اُس کا میکہ اہم ہے میں نہیں۔'' فائق نے اپنی بھڑاس نکالنی چاہی مگر صالحہ نے فوراً ہی بات کا رخ بدل دیا۔

''ہاں میں بات کرلوں گی۔ آجاؤ ناشتہ لگ چکا ہوگا۔ تمہارے پاپا بھی انتظار کررہے ہیں۔'' صالحہ وہاں سے نکلیں تو وہ بھی سر جھٹک کر پیچھے لپک گیا۔

☆......☆......☆

اروی ڈسچارج ہوکر گھر جارہی تھی۔ ثمن اُسے لینے آئی تھی۔ وہ ابھی تک اصم سے مل نہیں پائی تھی کیونکہ بی بی جان نے اُسے یہ کہہ کر روکا تھا کہ وہ کچھ بہتر ہوکر اُس کے سامنے جائے گی تو اصم کو پریشانی نہیں ہوگی۔

وہ نہ چاہتے ہوئے اس حوالے سے خود پر جبر کرگئی تھی۔ مگر ڈاکٹر کی مکمل آرام کی ہدایت کے بعد اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں گھر جاکر اُسے اسپتال آنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ کیا کرے گی۔ سو وہ ثمن بھابی سے جھجکتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

''بھا...... بی جان اب تو میں اصم سے مل سکتی...... ہوں۔''

اُسے ہچکچاتے لہجے پر نہ صرف ثمن نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا بلکہ اُس کا سامان وغیرہ بیگ میں رکھتی زہرا بھی حیرت سے بیٹی کو دیکھنے لگی۔ زہرا کو ایک پل میں اندازہ ہوگیا کہ اروی نئے ماحول اور

سسرال کے طور طریقوں سے کچھ خائف اور نامانوس سی ہے۔
''ہا...... ں...... کیوں نہیں...... ساتھ والا روم ہی تو ہے اصم کا...... جاتے جاتے مل لیتے ہیں۔'' ثمن نے غیر محسوس انداز میں اپنی حیرت چھپائی تھی۔ اُسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اروی ابھی تک اصم سے نہیں مل پائی ہے۔ کبھی کبھی بی بی جان کی حکمتیں اُس کی سمجھ سے بھی بالاتر ہوتی تھیں۔
اصم کو بازو اور ٹانگ کے پلاسٹر نے کافی بے چین کر رکھا تھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ صدیوں سے اس تکلیف اس جکڑن کو سہہ رہا ہے۔ اُسے اپنے تمام تر صبر و حوصلے کے باوجود زندگی بوجھ لگنے لگی تھی۔
دوپہر کا وقت تھا اس وقت کوئی بھی اُس کے پاس نہیں تھا۔
کچھ دیر پہلے ڈرائیور اُس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اُس کے لیے رکھی ہوئی نرس نے اُس سے کھانا کا پوچھا بھی تھا مگر اُس نے 'ابھی نہیں' کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا گھر کے افراد وقفے وقفے سے اُس چکر لگائیں گے۔ شارم بھائی صبح آفس جانے سے پہلے اُس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر گئے تھے۔
بابا جان بھی لنچ کے بعد آ جاتے...... شام کو ضیغم بھائی اور بی بی جان اُس کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ ثمن اور سبرینہ بھی آتے تھے۔ فیصل تو آفس سے آ کر سارا وقت اُسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ حتیٰ کے کبھی کبھی رات بھی اُسی کے پاس رک جاتا تھا۔ اِس کے باوجود احساسِ تنہائی اتنا شدید ہونے لگا تھا کہ اُس کے اندر اپنوں سے ہی بدگمانیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ اروی کے بارے میں کوئی بھی اُسے تسلی بخش معلومات نہیں دیتا تھا۔ اُس کے اندر اروی کے حوالے سے کئی خدشات جنم لینے لگے تھے۔ اُسے لگتا تھا اروی اُس سے بھی زیادہ زخمی تھی، تبھی اُس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اُس سے ملنے نہ آتی۔
ابھی بھی وہ یہی سوچ رہا تھا اچانک دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ اپنی سوچوں سے نکل کر متوجہ ہوا تو حیران رہ گیا۔ ثمن بھابی کے پہلو میں لگی۔ اروی لاغر، کمزور اور زردسی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے ماتھے پر لگی بینڈج کلائی پر چڑھا پلاسٹر اُس کی مخدوش حالت کا پتہ دے رہی تھی۔ اصم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ بے اختیاری میں وہ اٹھنے لگا تھا کہ ثمن نے فوراً ٹوک دیا۔
''ار...... رے...... اصم سنبھل کر۔'' اصم کو بھی جیسے ہوش آیا کہ وہ بے اختیاری میں کیا کرنے لگا تھا۔
''السلام علیکم!'' اروی بمشکل بولتی اُس کے سامنے آ ٹھہری تھی۔ اُس کے لہجے میں نمی کا احساس نمایاں تھا۔ ثمن جیسے دونوں کی کیفیات سمجھ رہی تھی۔ ثمن نے اُسے بازو سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اروی کی آنکھیں اصم پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر اُس کی آنکھوں میں نمی اُتر کر قطرہ قطرہ پھسلنے لگی۔ ماحول میں عجیب سا سکوت پھیل گیا تھا۔ اروی آنسوؤں کی زبان میں حالِ دل کہہ رہی تھی اور وہ بھی مبہوت بس اُسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ ثمن کو دونوں کی طبیعت و کیفیت کے بگڑنے کا احتمال ہوا تو آہستہ سے بولی۔
''اروی...... اروی...... خود کو سنبھالو۔'' کندھے پر دھرے ثمن کے ہاتھ کا دباؤ اُسے اپنے آنسوؤں اور بے اختیاری کا احساس دلا گیا۔ وہ بھی اصم کی ٹوٹ پھوٹ پر حیراں اور بیکراں سی ہو گئی تھی۔
''کیسی طبیعت ہے بیٹا!'' زہرہ نے بھی اندر آتے ہوئے پوچھ کر ماحول کا بوجھل پن ختم کیا تھا۔ وہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ حادثے کے بعد دونوں کا آمنا سامنا، دونوں کو ہی متاثر کرے گا۔

''پہلے...... سے بہتر ہوں!'' اُس کی آواز بھی بوجھل تھی۔
''آج اروی ڈسچارج ہوکر گھر جا رہی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے ابھی اسے بیڈ ریسٹ کے لیے کہا ہے۔'' ثمن بھابی نے اپنے طور پر اُسے توجیہہ دی تھی۔ وہ اصم کی آنکھوں اور تاثر سے وہ شکوے محسوس کر رہی تھیں جو وہ زبان سے نہیں کہہ سکا تھا۔ ابھی دونوں میں اتنی بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ کسی کے بھی سامنے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے۔ اصم نے ہی ہمت کی تھی۔
''شکر ہے گھر شفٹ ہونے سے پہلے یہ مجھ سے ملنے آ گئی۔ ورنہ مجھے فکر رہتی۔'' اروی نے بھیگی پلکیں اُٹھا کر اُس کی جانب دیکھا تو اصم اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''ڈاکٹرز نے منع کیا تھا۔ ورنہ یہ پہلے آ جاتی بیٹا...... بہرحال یہ اب آتی رہے گی تم سے ملنے۔'' زہرہ کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ ثمن نے بھی تائیداً بات بڑھائی۔
''ہاں...... ہاں کیوں نہیں بلکہ اب تو تم بھی جلد ہی گھر شفٹ ہو جاؤ گے۔ پھر ایک دوسرے کی تیمارداری کرتے رہنا۔'' اپنی مسکراہٹ سے ثمن بھابی نے ماحول بدلنا چاہا۔ اصم کے چہرے کا تاثر فوراً ہی بدل گیا تھا۔
''ہوں...... تیماردار کو اگر تیمارداری کی اجازت ملی تو......'' دھیمے لہجے اور دھیمی مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت تھی۔
''بڑے چہکنے لگے ہو...... اروی کی آمد کا کمال ہے؟'' ثمن کو اُس کا بدلا روپ اچھا لگ رہا تھا۔ اس تبصرے پر اصم کے چہرے پر اعترافیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی جبکہ اروی کچھ جھینپی جھینپی سی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ثمن بھابی کی نگاہ میز پر دھرے لنچ بکس پر پڑی جو ویسے ہی بند تھا۔ جیسے گھر سے آیا تھا۔
''تم...... نے آج لنچ نہیں کیا۔'' جواباً اصم خاموش رہا۔
''گھر کا کھانا نہیں کھانے کو دل چاہ رہا تھا تو ہاسپٹل کے ریسٹورنٹ میں آرڈر کر دیتے۔''
''بھابی جان کچھ بھی کھانے کا دل نہیں تھا۔''
''ایسے کیسے ٹھیک ہو گے تم؟ میڈیسن بھی نہیں لی ہوں گی؟ یہ اچھی بات تو نہیں ہے اصم! چلو ہمارے سامنے لو کچھ نہ کچھ...... میں ایسے نہیں جاؤں گی۔'' ثمن بھابی نے قدرے خفگی سے اُسے دیکھتے ہوئے زبردستی اُسے سوپ نکال کر دیا۔
''اپنی صحت کا خود خیال نہیں کرو گے تو پھر ہمیں ہی زبردستی کرنی پڑے گی نا۔''
''بھیب (وہ اکثر بہت لگاوٹ سے ثمن کو یہی کہتا تھا) تھک گیا ہوں روز ایک ہی Taste لگتا ہے کھانے کا' تنگ آ گیا ہوں۔'' اُس کی اکتاہٹ چہرے کے ساتھ زبان پر بھی آ گئی۔
''کیا کریں...... ڈاکٹرز نے دیا ہے Menu' ہمیں تو Follow کرنا ہی پڑے گا۔ تم دونوں کی صحت کا معاملہ ہے۔ ڈاکٹرز کہیں گے تو بدل دیں گے۔ بس اب اچھے بچوں کی طرح سوپ لے لو...... میں اٹینڈنٹ کو کہہ کر جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں کھانا بھی سرو کرے۔''
''جی بیٹا! سوپ وغیرہ صحت کے لیے اچھے ہوتے ہیں، آپ کو انرجی ملے گی۔'' زہرا نے بھی اپنی رائے دی۔ اروی اس دوران بس اصم کو ہی دیکھتی رہی۔ اذیت اور کرب کا احساس اُس کے چہرے کے

تاثرات سے ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں پی لیتا ہوں...... گھر جا کر مجھے فون تو کرلیا کریں۔'' یہ شکوہ تھا یا پیغام کوئی نہ سمجھ سکا۔ ثمن نے فقط سر ہلایا اور اروی سوچتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی کہ گھر جا کر وہ کس طرح اصم کو فون کرے گی۔ اُس کا موبائل فون تو حادثے کی رات ہی یقیناً ٹوٹ پھوٹ کر ضائع ہو چکا ہوگا۔

''ا......ر......وی......اب گھر چلو بھئی' بی بی جان ہمارے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' ثمن نے اُسے چونکایا۔ تو وہ خیالات سے چونک کر کھڑی ہوگئی۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اللہ حافظ کہتی اُن کے ہمراہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ اُن کی گاڑی بیت الجنت کی جانب رواں دواں تھی اور اُس کی سوچیں اصم کی ذات کی جانب......

☆......☆......☆

بیت الجنت میں بی بی جان نے کافی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ اروی کا صدقہ اُتارا گیا تو زہرا متاثر ہوئے بغیر نہ رہی وردہ کی باتوں سے دل میں جو موہوم سے خدشات تھے وہ بھی بی بی جان کی پذیرائی پر اڑنچھو ہو گئے تھے۔ وہ کس محبت سے کہہ رہی تھیں۔

''زہرا بہن ویسے تو آپ کے لیے گیسٹ روم صاف کروا دیا گیا ہے لیکن اگر آپ اروی کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ خوشی سے رہ سکتی ہیں۔''

اروی کو ملازمہ شادو سہارا دے کر اُس کے کمرے میں اوپر لے گئی تھی۔ جبکہ زہرا مروتاً و تکلفاً بی بی جان کے پاس لاؤنج میں بیٹھی تھیں بلکہ بی بی جان نے چائے کے لیے روکا تھا۔

''زبیدہ خان آپ نے تردد کیا۔ میں بس شام تک ہی ہوں یہاں...... احمد حسن کو ہاسپٹل میں ہی کال کردی تھی وہ آ رہے ہیں مجھے لینے۔''

''کیا مطلب......! آپ اروی کو اس طرح...... میرا مطلب ہے ابھی تو وہ مکمل صحت یاب نہیں ہوئی۔ اُسے آپ کی ضرورت ہے۔'' بی بی جان کو جیسے سن کر حیرانی ہوئی۔

''مجھ سے زیادہ آپ اُس کا خیال رکھتی ہیں۔ پھر دیکھیں ناں وہاں جوان بیٹی گھر پر اکیلی ہے۔ یہاں آپ سب ہیں یہ اُس کا گھر ہے مجھے اروی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بس اب مجھے اجازت دیں۔'' زہرا نے سہولت سے جواز دیا۔

''لگتا ہے آنٹی کو اپنے گھر کی یاد ستا رہی ہے۔'' سبرینہ نے برسبیل رائے دی۔ وہ چائے سرو کر رہی تھی اُس دوران انعم بھی اشارے سے سلام کرتی ایک طرف آ بیٹھی۔

''آنٹی...... کے گھر میں ایسا کیا ہے جس کی یاد ستائے گی...... اچھا ہے دو چار دن یہاں آ......ر......ام کرلیں۔'' انعم کے لہجے میں ایسا طنز پوشیدہ تھا جو زہرا کو لمحے میں ہی محسوس ہو گیا۔

''بیٹا...... آرام تو صرف اپنے ہی گھر میں ملتا ہے' ہے تو وہ چھوٹا سا گھر...... مگر میرے لیے پوری دنیا ہے۔ میری جنت ہے۔'' زہرا نے بہت نرمی سے جواب دیتے ہوئے انعم کو دیکھا تھا۔ وہ ڈھٹائی سے پلیٹ میں کباب رکھے کھانے میں مصروف تھی۔

''ہاں صحیح کہتی ہیں آپ! عورت کی جنت تو اُس کا گھر ہی ہوتا ہے اور بچے اُس کی وفا کا انعام۔'' بی بی

جان بھی قائل سی بولیں۔ انہیں انعم کی بات اتنی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یا پھر انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ موضوع گفتگو عورت کی وفا' صبر اور حوصلے کی جانب رخ موڑ گیا تھا۔ انعم فوراً ہی پلیٹ لے کر غائب ہوگئی تھی۔ دونوں سمدھنیں اپنے اپنے خیالات کے اظہار کے بعد مطمئن تھیں۔

بی بی جان خوش تھیں زہرا کافی سلجھی ہوئی خاتون ثابت ہوئی تھیں۔ اروی انہی کی بیٹی تھی اُن کی تربیت کے زیر اثر ہونے کا یقین سا انہیں ہوا تھا۔ زہرا اُس وقت اُٹھ کر شادو کی رہنمائی میں اروی اور اصم کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ نیم دراز کسی سوچ میں مستغرق تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی۔

''اچھا ہوا آپ آگئیں...... ورنہ میں آپ کو بلوانے ہی والی تھی۔'' اروی نے سرسری لہجے میں کہا۔ زہرا بیٹی کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔ کمرے کی آرائش وزیبائش دیکھ کر زہرا کافی متاثر نظر آرہی تھیں۔ شادی کے بعد پہلی بار اُس کمرے میں آئی تھیں۔

''ہاں تمہاری ساس نے چائے کے لیے روک لیا تھا، ماشاءاللہ تمہارا کمرا تو کافی بڑا اور آراستہ ہے۔ تمہاری شادی سے پہلے ہی سے سامان وغیرہ سیٹ تھا یا تمہارے آنے کے بعد اضافہ کروایا ہے۔'' بے ساختہ سراہتے ہوئے بھی زہرا کے لہجے میں ماؤں والی کرید آگئی۔

''نہیں امی پہلے دن سے ہی ایسا ہے۔ بلکہ ساتھ والا روم بھی اصم کا میوزک اور اسٹڈی روم ہے۔'' اروی نے ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا...... !شکر ہے...... میری بیٹی کو اچھا اور سکھی سسرال ملا۔ ورنہ اُس دن تو......'' زہرا یکدم چپ ہوگئیں۔ گزرے دن کی تلخ یاد زبان پر آتے آتے رہ گئی۔

''بس امی آپ کی اور ابو کی دعاؤں سے ہی تو یہ سُکھ ملے ہیں۔ آپ دعا کرنا...... یہ سب ہمیشہ اچھے رہیں۔'' اروی بھی اپنے سسرال سے متاثر تھی۔

''آمین !تم بھی سب کی عزت کرنا۔ کوئی کبھی کچھ کہہ بھی دے تو برداشت کرلینا۔ پیار محبت اور خدمت سے سب کے دل جیتنا...... جو زبدہ بھابی کہیں وہی کرنا۔''

''جی امی ! مجھے معلوم ہے بی بی جان کا رتبہ اور مقام سب سے اونچا ہے۔ آپ فکر نہ کریں اپنی بیٹی پر بھروسہ رکھیں۔ ویسے امی خیریت ہے۔ یہ نصیحتیں دہرانے کا مقصد...... کسی نے کچھ کہا تو نہیں۔'' اروی نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔ اُسے یکدم انعم کا خیال آیا تھا۔ وہ ہی بے باکی سے کبھی بھی کچھ بھی بول جاتی تھی۔

''نہ...... نہیں...... نہیں کسی نے کیا کہنا تھا۔ تم پریشان مت ہو۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ تمہارے ابو آجاتے تو اُن کے سامنے تمہیں سمجھانا اچھا نہیں لگتا۔'' زہرا نے لہجے کی نرمی سے اُس کی پریشانی زائل کرنا چاہی۔

''ابو آرہے ہیں؟ مطلب آپ آج ہی جارہی ہو۔'' اروی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے !اب گھر تو جانا ہے نا بیٹا...... !زبدہ بھابی بھی اصرار کررہی تھیں۔ مگر مجھے ٹھہرنا مناسب نہیں لگ رہا۔'' زہرا نے اُٹھ کر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں امی!'' اروی کچھ جھنجلائی...... ماں کا جانا اُسے اچھا نہیں لگا۔

''بیٹا تم سمجھدار ہو۔ وردہ اکیلی ہے وہاں...... تمہارے ابو اور بھائی کو کھانے پینے کی تنگی ہو رہی ہے تمہارے پاس تو یہاں سب ہیں دیکھ بھال کرنے والے۔'' زہرا پلٹ کر اُسی کے پاس بیٹھ گئی۔

''سب ہیں...... مگر امی آپ؟ اچھا! اصم کے آنے تک ہی رک جائیں۔ وردہ کو بھی بلا لیں۔'' اروی کے اصرار میں بچپنا سا تھا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو اروی...... تمہارے سسرال میں نہ ٹھہرنا ہی مناسب ہے۔ میں تمہیں فون کرتی رہوں گی۔''

''امی...... کیوں مناسب نہیں ہے۔ یہ میرا بھی تو گھر ہے اور آپ کا مجھ سے تعلق و رشتہ ہے۔ آپ کس زمانے کی بات کر رہی ہیں۔ وقت بدل گیا ہے امی...... لوگوں کو شعور آ گیا ہے کہ گھر میں بہو بنا کر لائی گئی بیٹی سے وابستہ بھی رشتے اپنی اہمیت اور حیثیت رکھتے ہیں۔'' اروی نے قدرے جذباتی ہو کر ماں کو قائل کرنا چاہا۔

زہرا کے چہرے پر سنجیدگی اور لہجے میں رسانیت مزید بڑھ گئی۔

''میں مانتی ہوں بیٹا وقت بدل گیا ہے' مگر...... لوگوں میں اب تک شعور نہیں جاتا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی تم لوگوں...... بلکہ اپنوں ہی کی جاہلیت کا شکار ہوتے ہوتے بچی ہو...... خیر یہ بحث بے کار ہے۔ بس ماں کی مجبوری کا خیال کرو۔ اور اپنے ابو کے سامنے یہ ذکر مت چھیڑنا۔'' زہرا نے سمجھایا۔

اروی چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ زہرا اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ بدلتے وقت اور بدلتی روایات کے باوجود معاشرتی رویوں میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اُس کا تجربہ وہ اُٹھا چکی تھی۔ اُس کی سوچیں پھر سے بکھرنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

بی بی جان نمازِ عصر کی ادائیگی کے لیے اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ نماز کے بعد انہوں نے خصوصاً ثمن کو بلوایا تھا اور وہ فوراً آ بھی گئی تھی۔ بی بی جان تسبیح میں مصروف تھیں۔ اس لیے وہ منتظر سی ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ بی بی جان کو دعا سے فارغ ہوتے دیکھ کر بعجلت بولی۔

''جی بی بی جان...... کوئی خا...... ص کام تھا آپ نے مجھے بلوایا۔''

''ہا...... ں کام ہی سمجھو...... دراصل صالحہ بہن بس پہنچنے والی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس دوران اروی کی امی اور اُن کا سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔''

''ج...... ی...... !'' ثمن کے چہرے پر حیرانی در آئی۔

''دیکھو ثمن...... تم سمجھدار ہو اس لیے یہ معاملہ میں تمہیں سونپ رہی ہوں۔ دیکھو نا ابھی اُن سے ہمارا نیا نیا سمدھیانہ ہے۔ اچھا نہیں لگتا گھر کی بیٹی کا کوئی مسئلہ اُن کے سامنے حل ہو۔'' بی بی جان نے کچھ ہچکچا کر بات کی۔ بات ثمن بھی سمجھ گئی تھی۔ فوراً تائید اً بولی۔

''جی بی بی جان آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں ویسے بھی آنٹی زہرا تو اروی کے پاس ہی ہیں اوپر...... مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب نیچے آئیں گی۔''

''احتیاط پھر بھی ضروری ہے۔ وہ واپس جانے کا کہہ رہی ہیں' جانے سے پہلے مل کر تو جائیں گی۔ تم مجھے بلوا لینا۔ اور ہاں...... کھانے پر کچھ اہتمام بھی کروا لینا۔''

''جی ضرور...... آپ فکر نہ کریں اور کچھ......''

''نہیں بس تم جاؤ' اپنا کام کرو اور انعم کو میرے پاس بھیج دینا...... اسے بھی تو سمجھانا ہے۔'' انعم کا سوچ کر ہی انہیں کوفت سی ہوئی اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے اب وہ نالاں سی تھیں۔

☆......☆......☆

سبرینہ' انعم اور نیلم کچن میں تھیں۔ سبرینہ شام کی چائے کی تیاری میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ انعم کچن ٹیبل کے پاس کرسی پر بیٹھی فروٹ چاٹ کھانے کے ساتھ سبرینہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ جبکہ نیلم کالج سے آ کر دوپہر کا کھانا گول کر کے سونے کے بعد اب کچن میں اپنے لیے سینڈوچ بنانے کھڑی تھی۔

''رینا بھابی...... آپ کو نہیں لگتا کہ بی بی جان اصم بھائی کے سسرال والوں کو کچھ زیادہ ہی سر چڑھا رہی ہیں۔'' فروٹ چاٹ کھاتے کھاتے اُس نے تیسری چوتھی بار گھما پھرا کر باتوں کا رخ اصم کے سسرال والوں کی طرف موڑا۔

''سر چڑھانے سے آپ کا کیا مطلب ہے انعم آپی۔'' نیلم کو بہن کی بات سمجھ نہیں آئی تھی یا پھر وہ مزید اُس کے خیالات جاننا چاہتی تھی۔

''مطلب یہ ہے کہ اتنے اصرار کی کیا ضرورت ہے۔ جب اروی کی امی رُکنا نہیں چاہتیں اور یہ سب اتنا اہتمام...... وی آئی پی پروٹوکول دینے کی کیا ضرورت ہے۔'' انعم کو وضاحت دینے مین کوئی قباحت نہیں تھی۔

''انعم آپی' آپ بھول رہی ہیں' مہمانداری ہمارے گھر کی روایت ہے۔ اور بی بی جان سبھی کو اسی طرح پروٹوکول دیتی ہیں۔ آپ کو کیوں برا لگ رہا ہے۔'' وہ سینڈوچ پلیٹ میں نکال کر بولتے ہوئے بہن کے سامنے آ بیٹھی۔ انعم ایکدم چڑ گئی۔

''مجھے کیوں برا لگے گا...... میں تو وہی کہہ رہی ہوں جو نظر آ رہا ہے۔ بی بی جان کا یوں بچھ' بچھ جانا مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ اروی کی امی ہیں کوئی ایسی بڑی ہستی تو نہیں ہیں۔ جن پر یوں نثار ہوا جا رہا ہے۔'' وہ بولنے پر آئی تو پھر بولتی چلی گئی۔ ثمن بھابی بھی اُسے بلانے وہیں چلی آئی تھیں اُس کی آخری بات سن کر پوچھنے لگیں۔

''کس کی بات کر رہی ہو۔ کس پر نثار ہوا جا رہا ہے۔''

''یہ جو نئے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں ہمارے...... مجھے کوفت ہوتی ہے ابھی تک یہ سوچ کر کہ بابا جان نے اصم بھائی کی شادی ایسی جگہ پر کر دی جن سے ہمارا کوئی میل ہی نہیں ہے۔'' اُس کے لہجے میں دبا دبا غصہ بھی تھا۔ نخوت و حقارت بھی نمایاں تھی۔ ثمن بھابی نے قدرے افسوس و ملال سے اُسے دیکھا۔ سبرینہ کے چہرے پر محفوظ سی کیفیت تھی۔

''تم یہ بات جب دل سے مان لوگی کہ اللہ نے اُن کا میل لکھا تھا' تو تمہیں نہ کوفت ہوگی نہ غصہ آئے گا۔ ہمیں نصیب پر راضی رہنا سکھایا گیا ہے۔ تم کیوں اسی بات پر اتنا خون جلاتی رہتی ہو۔'' ثمن کا لہجہ نرم

اور سمجھانے والا تھا۔

''نہیں خود سوچیں بھابی کیسی فیملی کی لڑکیاں تھیں' جو بی بی جان کو پسند نہیں آئیں۔ اروی کی حیثیت دیکھیں۔ اُسے دل و جان سے قبول کرلیا۔'' وہ ابھی تک ماضی کی جلن میں جل رہی تھی۔

''انعم آپی...... کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟'' نیلم کو حیرانی کے ساتھ کچھ غصہ بھی آیا۔ اچھی بھلی تو ہیں اروی بھابی...... اصم بھائی کے ساتھ صحیح میچ ہے اُن کا...... آپ کو خواہ مخواہ کا کامپلیکس ہے۔''

''مجھے کیوں کوئی کامپلیکس ہوگا۔ تم میری باتوں میں ٹانگ نہ اڑایا کرو...... جاؤ اپنا کام کرو...... فضول میں چیچی بنی رہتی ہو۔'' انعم نے بہن کو بری طرح جھاڑ دیا۔ سبرینہ نے ثمن کو اشارتاً دیکھا۔

''میں کوئی چیچی نہیں ہوں۔ صحیح بات کرتی ہوں۔ اسٹیٹس' فیملی آپ کے ذہن کا فتور ہے۔ بھائی یا بی بی جان کو اروی بھابی کے فیملی بیک گراؤنڈ سے کوئی ایشو نہیں ہے۔ آپ بھی اسے ایشو نہ بنائیں تو اچھا ہے۔'' نیلم کو بھی جیسے غصہ آ گیا۔ بہن کو جواب دے کر کرسی چھوڑ کر وہ سینڈوچ کی پلیٹ تھام کر کچن سے نکل گئی۔

''ٹھیک کہہ رہی تھی نیلم...... تم کیوں کیوں ابھی تک اس مسئلے میں اُلجھی ہوئی ہو انعم...... چھوڑو...... اپنی فیملی کا سوچو...... جاؤ تمہیں بی بی جان بلا رہی ہیں۔ اُن کی بات سن لو صالحہ آنٹی آنے والی ہیں۔'' ثمن نے ایک بار پھر نرمی سے سمجھانا چاہا۔ صالحہ درانی کے آنے کا سنتے ہی اُس کے تاثرات مزید بگڑ سے گئے۔

''وہ کیو...... ں؟ آ رہی ہیں؟''

''پتہ نہیں...... بی بی جان سے جا کر پوچھ لو۔'' ثمن نے مزید بحث سے بچنے کے لیے اپنی جان چھڑائی۔ وہ جانتی تھی انعم کو سمجھانا بے حد مشکل ہے۔ ثمن فوراً ہی ڈیپ فریزر کی طرف بڑھ گئی۔ رات کے کھانے سے متعلق وہ سبرینہ کو بی بی جان کا پیغام دے رہی تھی۔ انعم چڑ کر بڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کر کچن سے نکل گئی۔

''تم ہی اُسے سمجھا دیا کرو...... تم سے تو وہ کلوز ہے۔'' انعم کے جاتے ہی ثمن نے خاموش تماشائی بنی سبرینہ کو متوجہ کیا تو وہ اوون سے خود کا بیک کیا ہوا پیزا نکالتے ہوئے بیزاری سے بولی۔

''میری کہاں سنتی ہے' آپ کو تو معلوم ہے اپنی کہنے کی عادت ہے اُسے...... ویسے بھی تو صالحہ آنٹی سے اُس کی بنتی ہے نہ فائق سے...... اب دیکھیں آج کیا تماشا ہوتا ہے۔'' سبرینہ نے بھی جیسے اپنی بھڑاس نکالی۔

آج اُس کی مما نے بھی انعم کے حوالے سے کافی کچھ سنایا تھا۔ آخر وہ صالحہ کی کزن تھیں۔ ایک دوسرے سے مذاکرات تو چلتے ہی تھے' سبرینہ کا موڈ دیکھتے ہوئے ثمن نے بھی موضوع بدل دیا۔ ثمن کا سبھاؤ نہیں تھا بات کو ہوا دینا۔

''بی بی جان...... بی بی جا...... ن...... آپ نے فائق کی ماما کو کیوں بلوایا ہے۔ آپ صاف سن لیں میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' انعم بگڑے موڈ کے ساتھ بی بی جان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے صبرے پن سے بولی۔

بی بی جان اپنے روم کے ڈریسنگ ایریا سے لباس بدل کر دوپٹہ درست کرتی باہر آ رہی تھیں۔ اُسے دیکھ اور سن کر ٹھٹک سی گئیں۔

''ا...... نعم...... یہ...... کیا انداز ہے تمہارا...... میں نے تمہیں یہ سکھایا ہے؟'' بی بی جان کی آنکھوں میں

غصہ اور لہجے میں ناراضگی واضح طور پر نظر آئی۔

''کیا کروں میں پھر...... کوئی میری بات سمجھتا ہی نہیں۔ فائق نے صاف کہہ دیا تھا اب میں واپس نہ آؤں۔ پھر آپ نے اُس کی ماما کو دعوت کیوں دے دی۔'' وہ فوراً ہی اُن کے بستر پر دھپ سے بیٹھ کر مصنوعی پن سے رونے لگی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے انہیں کوئی دعوت نہیں دی۔ وہ خود اروی کی مزاج پرسی کو آرہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے اچھا ہے وہ آئیں گی تو آمنے سامنے بیٹھ کر کچھ باتیں کلیئر ہو جائیں گی۔''

انہوں نے بیٹی کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے اظہار کیا۔

انعم ذرا چونکی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''مطلب...... کیا کلیئر ہوگا؟ آپ کو وہی سچے لگیں گے۔ مجھ پر تو آپ کو اعتبار ہی نہیں۔ میں جھوٹی ہوں...... غلط کہہ رہی ہوں...... ہے نا۔'' اُس نے جذباتی ہو کر بی بی جان کو جذباتی کرنا چاہا۔

''تمہارا یہ واویلا میری سمجھ میں نہیں آرہا انعم...... آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' بی بی جان زچ ہو اٹھیں۔

''بتایا تو تھا...... فا...... ئق کا رویہ کتنا برا رہتا ہے میرے ساتھ...... آنٹی بھی بیٹے سے کم نہیں ہیں۔ فی الحال میں ٹینشن میں نہیں جانا چاہتی۔'' اُس نے دل کی بات کہتے ہوئے کافی لاڈ سے ماں کو دیکھا۔

''پہلے بھی میرا Miscarriage فائق کی وجہ...... سے ہی ہوا تھا۔ آپ چاہتی ہیں کہ...... پھر......'' وہ آنسو بہانے لگی۔

''اللہ نہ کرے...... میں کیوں ایسا چاہوں گی...... ٹھیک ہے میں صالحہ سے بات کروں گی کہ بچے کی پیدائش تک تمہیں یہیں رُکنے دیں۔ تم بھی اُن کے سامنے تحمل سے کام لینا۔ کوئی فضول بات نہ کہنا...... بہر حال وہ تمہاری ساس ہیں۔'' بی بی جان کی اندر کی ماں آخر پسیج گئی۔ انعم کے لیے ماں کی حمایت ہی کافی تھی۔ اُسی وقت شمو صالحہ کے آنے کی خبر لے کر آ گئی۔

''ہاں چلو میں آرہی ہوں۔'' شمو الٹے پیروں واپس پلٹ گئی۔ شمو کے جاتے ہی بی بی جان نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''انعم...... میں تمہیں پھر سمجھا رہی ہوں' صالحہ کے سامنے فضول بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بات کرلوں گی اُن سے۔'' انعم کچھ کہنا چاہتی بھی انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔

''جاؤ جلدی سے اپنا حلیہ ٹھیک کر کے ڈرائنگ روم میں آؤ' مجھے بلوانا نہ پڑے۔'' وہ اُسے تنبیہ کر کے باہر نکل گئیں۔

وہ جل کڑھ کر بڑبڑانے لگی۔

''بی بی جان کو بھی اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔ میری کوئی بات سمجھتی ہی نہیں...... خیر کچھ بھی ہو میں تو نہیں جاؤں گی۔ فائق کو بھی پتہ چلے...... کیسے دھمکیاں دے رہا تھا۔'' وہ کچھ سوچ کر بالآخر چینج کرنے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آخر ساس کو جتانا بھی تو تھا کہ وہ یہاں زیادہ خوش اور فریش ہے۔

☆......☆......☆

اروی دواؤں کے زیر اثر باتیں کرتے کرتے غنودگی میں چلی گئی تھی۔ زہرہ نے اُسے سونے دیا اور خود

نمازِ عصر کی ادائیگی کے لیے اٹھ گئی۔ وضو کے لیے اُس کے باتھ روم کا رخ کیا تو جدید تقاضوں کے پیشِ نظر خاصا بڑا اور مرصع و مزین غسل خانہ دیکھ کر انہیں بیٹی پر رشک بھی آیا اور اپنی کمتری کا احساس بھی جاگا۔ اُن کے گھر کا ایک کمرا غسل خانے کے برابر تھا۔ اصم اور اُس کے گھر والوں کا طرزِ زندگی جس قدر شاہانہ تھا۔ اُس لحاظ سے تو وہ لوگ کچھ بھی نہیں تھے۔ پھر بھی یہ لوگ 'قدر' پیار اور عزت سے پیش آئے تھے۔ یہ اُن کی بڑائی اور خوبی تھی کہ اُن میں غرور و تکبر نہیں تھا۔ ورنہ کیا تھا انہیں کوئی پوچھتا نہ پوچھتا...... یہ سب اللہ کے فضل و کرم سے ہوا تھا کہ اُن کے چھوٹے سے گھر کی غریب ماں باپ کی بیٹی سکھوں کے مسکن کی باسی بنی بیٹھی تھی۔

وضو کرتے ہی زہرہ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر اٹھیں تو اُن کے پاس جو موبائل فون تھا اُس کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی آواز سے اروی کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ کچھ حیران سی ہوئی۔ زہرہ کے فون پر اروی کی دوست نرمین کی کال آ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اروی کی خیریت معلوم کرتی رہی تھی۔

''نرمین کی کال آ رہی ہے' تمہارے بارے میں پوچھتی رہتی ہے نا۔'' زہرہ نے کال ریسو کرنے سے پہلے وضاحت دی۔

''و...... ہ...... آ...... ئی...... تھی؟'' اروی کو نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ بولی نہیں۔ زہرہ نے نفی میں سر ہلا کر کال ریسیو کی۔

''وعلیکم السلام بیٹا...... میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اروی پہلے سے بہتر ہے۔ گھر آ گئی ہے اپنے...... ہا...... ں ہاں میں بات کرواتی ہوں۔'' زہرہ نے بڑھ کر بیٹی کے کان سے فون لگا دیا۔

اسلام وعلیکم...... نرمین کیسی ہو تم؟'' اروی نے کوشش سے خود کو سنبھال کر بات کی۔ اکلوتی سہیلی تھی ہمدرد غمگسار...... عیادت کو نہ آ سکی تھی تو کوئی وجہ ہی ٹھہری ہو گی۔ وہ دل میں کئی بار سوچ چکی تھی۔

''میں بھی اب اچھی ہوں...... شکر ہے تمہاری آواز سننے کو ملی۔ تم سے بہت شرمندہ ہوں' پتہ ہے ماموں کے گھر جا کر تو میں ایسی بیمار پڑی کہ جسم سے سارا پانی ہی ختم ہو گیا۔ اور مجھے تو لگتا ہے خون بھی۔ اماں تو مجھے دیکھ کر رونے ہی لگتی ہیں۔ خیر تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ' پھر میں آؤں گی' دو مریض ایک دوسرے کی عیادت کرتے اچھے نہیں لگیں گے نا۔'' نرمین قدرے شوخی سے بول رہی تھی۔ اروی کو اُس کے کہے پر یقین تو نہیں آیا پھر بھی تشویش سے بولی۔

''تمہیں کیا ہو گیا...... چیک اپ کروایا...... ڈاکٹر نے کیا کہا، ٹیسٹ کروائے۔'' اروی اپنی تکلیف بھول گئی۔

''بقول اماں کے...... ممانی کی نظر کھا گئی مجھے...... خیر ملیں گے تو سارا قصہ سناؤں گی۔ تم بتاؤ...... اصم بھائی اب کیسے ہیں۔ وردہ بتا رہی تھی پہلے سے بہتر ہیں۔''

''ہا...... ں سبھی کہہ رہے ہیں پہلے سے بہتر ہیں مگر مجھے تو بہتر نہیں لگے۔ بہت زخمی ہیں و...... ہ پلاسٹرز میں جکڑا ہوا انسان بہتر کیسے ہو سکتا ہے، نرمین۔'' وہ دلگرفتہ سی دل کی بات سہیلی سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔ زہرہ نے بیٹی کو ہمدردی سے دیکھا۔ شوہر کے لیے اُس کے جذبات چھپ نہیں سکے تھے۔

''اچھا...... تم پریشان مت ہو...... جلدی ٹھیک ہو جائیں گے وہ...... پہلے اپنا خیال رکھو۔ پھر اُن کا

خیال رکھا۔ ہم بھی دعا کر رہے ہیں۔'' نرمین نے مزید دو چار رسمی باتیں کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ زہرہ بھی جو اُس کے پاس ٹکی بیٹھی تھیں اُسے پھر سے تسلی دینے لگیں۔

☆......☆......☆

صالحہ درانی اور بی بی جان تقریباً پاس پاس ڈرائنگ روم کے صوفے پر براجمان تھیں۔ قریب ہی میز کے علاوہ چائے کی ٹرالی میں بے شمار لوازمات پڑے تھے۔ جنہیں کھانے کے لیے بی بی جان سمدھن کو بار بار اُکسا بھی رہی تھیں۔ اصرار بھی کر رہی تھیں۔ صالحہ انصاف کرنے کے ساتھ تعریف بھی کر رہی تھیں اور باتوں باتوں میں انعم کی خامیاں بھی اپنے حساب سے جتا رہی تھیں۔

''آپ کو بہوؤں میں تو بڑا سلیقہ ہے۔ ماشاء اللہ ہماری سبرینہ کی کوکنگ کے تو شادی سے پہلے ہی خاندان بھر میں بڑے چرچے تھے۔ ہوم اکنامکس کالج سے ماسٹرز کیا تھا۔ میرا فائق تو بہن سے فرمائشیں کر کر کے کھانے بنواتا تھا۔'' صالحہ، سبرینہ کو دیکھتے ہی مزید مداح سرائی کرنے لگی تھیں۔ بی بی جان نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔ آج انہیں صالحہ کا انداز و رویہ خاصا محسوس ہو رہا تھا۔ سبرینہ کے چہرے پر واضح مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

''خالہ جان اب تو فائق بھائی آتے ہی نہیں...... وہ یہاں آ کر بھی فرمائش کر سکتے ہیں۔ یہ اُن کا بھی گھر ہے۔ ویسے آج میں نے انہی کی پسند کا پیزا اور کیک بنایا ہے وہ آئے کیوں نہیں۔''

''اس وقت تو وہ آفس ہوتا ہے نا...... شادی کے بعد مرد کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ وقت بے وقت تو کہیں آ جا نہیں سکتا۔'' انہوں نے مخاطب تو سبرینہ کو کیا تھا مگر براہ راست انعم کو دیکھ کر جتایا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے سلام کرتی بی بی جان کے برابر میں آ کر بیٹھی تھی۔

''صالحہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر ایسی بھی کیا مصروفیات فائق بیٹا تو اب اِدھر آتے ہی نہیں۔ کبھی کبھی تو آ سکتے ہیں۔'' بی بی جان نے اپنے طور پر ماحول کا تناؤ ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

''یہ تو آپ کو انعم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ وہ اب اِدھر کیوں نہیں آتا۔ وہ پتہ نہیں کیوں اِدھر آنے سے ہی چڑ جاتا ہے۔'' صالحہ درانی نے صاف گوئی سے کہا۔

''ایسی...... کیا بات ہوگئی؟ ہم نے تو ہمیشہ اُسے عزت دی ہے...... اور......'' بی بی جان حیرانی کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔ سبرینہ بھی کچھ چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

''باتیں تو بہت ہیں، اب کس کس کا ذکر کیا جائے۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ اسی لیے ہمیں توقع تھی کہ انعم میں بھی سمجھ بوجھ ہوگی۔ شوہر کی پسند نہ پسند کو جانچنے کا ہنر رکھتی ہوگی۔ مگر معاف کیجیے گا زبدہ بھابی...... انعم کو تو ابھی تک سوائے اپنی ذات اور میکے کے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔'' صالحہ درانی نے بنا کسی تمہید کے دل میں آئی بات صاف گوئی سے کہہ ڈالی، سبھی حیران ہکا بکا صالحہ کی صاف گوئی سن کر ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے جبکہ انعم سے ساس کی تنقید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ فوراً تلملا کر بولی۔

''دیکھا...... دیکھا...... صرف فائق نہیں انہیں بھی میرا میکے آنا کھلتا ہے۔ انہیں بھی اعتراض ہے آپ لوگوں سے ملنے پر...... اسی لیے تو میرا وہاں دم گھٹتا ہے...... سکون کا ایک دن نہیں گزارا میں نے وہاں ہر بات پر

پابندی۔'' انعم جوش میں ہوش کھونے لگی تھی۔ بی بی جان نے اُسے گھرکا۔
''ان...... عم...... ہم بڑے بات کر رہے ہیں نا...... ''
''برداشت تو بالکل نہیں ہے اس میں...... میں نے کبھی ساس بن کر نہیں دکھایا۔ اسے پھر بھی شکایتیں رہتی ہیں۔ کیا کمی رکھی ہے ہم نے...... شادی کے ایک سال تک تو سیر سپاٹے کرتے رہے ہیں دونوں...... میں نے ابھی تک کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں ڈالی۔ اس کے باوجود یہ وہاں اس کا وہاں دم گھٹتا ہے۔'' صالحہ بھی آج گزشتہ اڑھائی سال کی بھڑاس نکالنے آئی تھیں۔ برداشت اُن کی بھی ختم ہوگئی تھی۔ بی بی جان کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ اُن سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ ثمن ہی مصلحت آمیزی سے بولی۔
''صالحہ آنٹی آپ اُس کی کنڈیشن تو جانتی ہیں دو مس کیرج کے بعد اب اللہ نے نوید دی' اس کنڈیشن میں برداشت کم ہو ہی جاتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں ڈلیوری کے بعد یہ نارمل ہو جائے گی۔ آپ کو پھر شکایت نہیں ہوگی۔'' بی بی جان نے ممنون نظروں سے ثمن کو دیکھا۔ بات کے لیے الفاظ اُن کے پاس ابھی بھی نہیں تھے۔
''بیٹا...... اتنا تجربہ اور عقل بوجھ تو مجھ میں بھی ہے کہ عورت اس حالت میں چڑتی جھنجلاتی رہتی ہے مگر اپنی کیفیت سے گھبرا کر شوہر سے ضد باندھنا اُسے غصہ دلانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بہرحال میں اس موقع پر یہ باتیں کہنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بات بیٹے کے گھر کی ہے اور گھر آسانی سے نہیں بستے...... یہ بات آپ بھی سمجھتی ہیں زبدہ بھابی...... فائق انعم کی بے جا ضدوں سے چڑا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بیزار ہو جائے...... اور......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
انعم کے تیور بگڑ رہے تھے۔ وہ مزید کیا کہتیں وہ سمجھ رہی تھی۔ بی بی جان کا خوف نہ ہوتا تو وہ صاف کہہ دیتی کہ اگر وہ ایک دفعہ بیزار ہے تو وہ اُن کے بیٹے سے سو دفعہ بیزار ہو چکی ہے۔ وہ اُس کی حکمرانی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر اس وقت وہ کچھ کہہ کر سارے گھر کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتی تھی۔
''سبرینہ...... تمہاری دیورانی کیسی ہے...... میں اُس کی عیادت کرنا چاہتی...... ہوں...... ''
''ہاں...... ہاں ضرور آیئے آنٹی...... میں آپ کو اُس کے روم میں لے چلتی ہوں۔'' ثمن فوراً ہی مستعد ہوگئی۔ ساس کی ہدایات جو یاد تھیں۔ سبرینہ کو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اُن کے جاتے ہی بی بی جان نے خشمگیں نگاہوں سے انعم کو گھورا۔
''انعم...... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''
''میں نے کیا؟ کیا ہے بی بی جان؟'' انعم کی جھنجلاہٹ اُس بلند آواز میں نمایاں تھی۔ سبرینہ اُس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ بی بی جان کو اُس کی موجودگی کا احساس تھا۔ تبھی ڈپٹ کر بولیں۔
''آواز نیچی رکھو...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے شوہر اور ساس کو تم سے اس قدر شکایتیں ہوں گی۔ تم اُن کی مرضی اور اجازت کے بغیر یہاں آ کر رہتی ہو؟ مجھے افسوس ہو رہا ہے تم پر...... تمہاری تربیت ایسی تو نہیں کی گئی تھی۔'' بی بی جان کے دبے دبے لہجے میں بھی اُن کے اندرونی غصے کی جھلک نمایاں تھی۔
''دیکھا...... آپ کو بھی وہی سچے لگ رہے ہیں نا...... اُن کی شکایتیں آپ نے سن لیں۔ مجھ سے کسی نے کبھی پوچھا ہے کہ میرے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔'' انعم غصہ دکھاتی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''انعم...... ایسا بھی کیا برا سلوک کرتی ہیں خالہ جان۔ جس کا تمہیں غصہ ہے۔ ہم نے خود دیکھا ہے انہوں نے

ہمیشہ تمہیں پیار اور محبت سے ٹریٹ کیا ہے۔ ایک دن بھی گھر کی ذمہ داری تم پر نہیں ڈالی۔ فائق بھائی اور تمہارے کسی معاملے میں کبھی انٹرفیر نہیں کیا۔'' سبرینہ کے بھی میکے سے جڑا معاملہ تھا۔ وہ بھی چپ نہیں رہ سکی۔ بی بی جان چاہ کر بھی اُسے ٹوک نہیں سکیں۔ انہیں سبرینہ کی دخل اندازی بری لگی تھی تو بیٹی کی جرأت پر بھی غصہ تھا۔

''ہاں...... بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر میں وہاں رہتی ہوں...... مجھ سے پوچھیں...... وہ فائق کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ انہیں میرے سونے جاگنے' کھانے پینے' آنے جانے ہر بات پر اعتراض ہے۔'' انعم کے لیے خود پر قابو پانا بے حد مشکل تھا۔ بی بی جان اُس کی جذباتیت پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے مزید بولنے سے پہلے وہ تقریباً چیخ ہی پڑیں۔

''بس کرو انعم...... تمہاری فضول باتیں میں نہیں سننا چاہتی۔ ساس بھی ماں ہوتی ہے' اگر وہ تمہیں اچھا برا سمجھاتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں وہ تمہاری دشمن ہوگئی۔''

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا...... مجھے پتہ تھا کسی کو بھی میرا احساس نہیں ہے۔ وہ اچھے ہیں؟ بات بات پر میکے کا طعنہ دیتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے میکے میں چھوڑ دیں گے۔ میرے یہاں آنے پر اعتراض ہے اور خود...... خود رات رات بھر نجانے کہاں اور کن دوستوں کے ساتھ وقت گزاری ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ اچھے ہیں۔ میں بری ہوں۔'' وہ جوش میں بولتے بولتے رونے لگی۔

سبرینہ حیرانگی سے اُسے دیکھ اور سن رہی تھی۔ جیسے اُسے انعم کی کسی بات کا یقین نہ ہو...... اور بے یقین تو بی بی جان بھی تھیں۔ سوائے آج کے دن کے انہوں نے کبھی صالحہ درانی کے رویے میں تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ فائق کا رویہ بھی کبھار محسوس ہوا تھا تو وہ اُس تبدیلی کو بھی مرد کے موڈ کا حصہ سمجھتی تھیں۔

''انعم...... بس یہ رونا دھونا بند کرو اور جاؤ یہاں سے...... آج تم نے مجھے بہت شرمندہ کروایا۔'' بی بی جان نے غصے سے بولتے ہوئے اپنا رخ اُس کی جانب سے پھیر لیا۔

ناشتے کے بعد سبھی مرد حضرات تو آفس جا چکے تھے۔ سبرینہ اور ثمن اپنے معمولات میں مصروف تھیں جبکہ بی بی جان لاؤنج میں بیٹھیں چائے پی رہی تھیں۔ پاس ہی انعم ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ آج بھی معمول سے زیادہ سوئی تھی اور اب اُٹھ کر آئی تھی۔ بی بی جان چاہ کر بھی اُسے ٹوک نہ سکیں کہ وقت پر اٹھا کرو۔ وہ خود ہی شرمندہ شرمندہ سی بولی۔

''بی بی جان...... پتہ نہیں کیوں آج کل مجھے غصہ بہت آنے لگا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میں سب سے لڑوں۔ سب کو اپنا دشمن محسوس کرنے لگی ہوں میں۔'' وہ اپنا صحیح تجزیہ کر رہی تھی۔ بی بی جان نے اُسے سمجھانے کے بجائے نرمی سے مشورہ دیا۔

''وقت پر کھاؤ پیو گی۔ اپنی میڈیسن پراپر لی لو گی تو ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارا اپنی ڈاکٹر کے پاس کب وزٹ ہے؟''

''سوچ رہی ہوں آج ہی چلی جاؤں۔ لاسٹ وزٹ میں نے مس کر دیا تھا۔'' وہ آج بہتر لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے سہ پہر میں' میں اصم سے ملنے جاؤں گی تم بھی ساتھ ہی چلنا۔ واپسی پر تمہارے ڈاکٹر کے پاس بھی چلے جائیں گے۔ میں ابھی ٹائم لے لیتی ہوں۔'' بی بی جان کو بھی سکون محسوس ہوا آج انعم کا موڈ خاصا بہتر لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بی بی جان۔'' اُسی لمحے شمو نے آ کر اطلاع دی۔
''بی بی صیب! چھوٹے خان جی کے دوست ہیں نا فیصل صاب وہ آئے ہیں۔''
''فیصل اس وقت؟'' بی بی جان نے بے ساختہ حیرت کا اظہار کیا۔ دل میں کچھ فکر مند بھی تھیں۔
''اچھا! اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور کچن میں جا کر جوس کے لیے کہو۔'' بی بی جان فوراً ہی اُٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔ شمو اُن کی ہدایت پر پہلے ہی لپک کر جا چکی تھی۔ فیصل کی آمد پر تجسس و فکر تو انعم کو بھی ہوا تھا مگر وہ اس حلیے میں اُس کے سامنے جا نہیں سکتی تھی۔
ڈرائنگ روم میں اِدھر بی بی جان داخل ہوئیں اور بیرونی دروازے سے فیصل اُس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔
''السلام علیکم! بی بی جان۔'' وہ وہیں فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔
''وعلیکم السلام!''
''آؤ آؤ فیصل رُک کیوں گئے بیٹھو بیٹا۔'' بی بی جان نے اپنی نشست سنبھال کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فیصل کچھ جھجکتا ہوا اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔
''خیریت ہے نا بیٹا! ا...... صم ٹھیک ہے؟'' بی بی جان نے اُس کے چہرے پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے کچھ پریشانی سے پوچھا۔
''ج...... ی...... جی بی بی جان میں رات کو ملا تھا تو وہ ٹھیک تھا...... وہ دراصل......'' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کس طرح اپنی بے وقت آمد کا مقصد بیان کرے۔ بی بی جان مسلسل اُسی کی جانب متوجہ تھیں۔
''فیصل بیٹا مجھے موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی۔ تم نے تو دوست ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔''
''بی بی جان آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔ کیا بیٹوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے؟'' فیصل نے بے ساختہ ندامت سے کہا۔ اُس کے چہرے پر واقعی خجالت کا رنگ تھا۔
''اصم میرا بھائی ہے بی بی جان...... بھائیوں کے لیے کچھ وقت نہ نکال سکوں تو کیا فائدہ ہماری بچپن کی دوستی کا۔''
''یہ تو تم لوگوں کی محبت اور احساس ہے بیٹا...... تم سبھی دوستوں نے اُسے سنبھالا ہے۔ اور دیکھو آگے بھی اُسے ہمت دلاتے رہنا...... اپنی تکلیف سے وہ تھوڑا چڑچڑا ہو گیا ہے۔'' بی بی جان دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دل کی باتیں کر رہی تھیں۔ آج سے پہلے فیصل نے انہیں اس روپ میں نہیں دیکھا تھا۔
''آپ فکر نہ کریں بی بی جان...... ہم اُس کے ساتھ ہیں۔ انشاء اللہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔'' فیصل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے تسلی دے۔
''آمین...... تم یہ لو...... بیٹا...... چائے وغیرہ پینی ہے تو بتا دو۔'' شمو جوس لے آئی تھی اور اُس کے قریب مزید پر رکھ کر جا چکی تھی۔
''میں یہ لے لیتا ہوں بی بی جان' چائے وغیرہ پھر کبھی...... دراصل مجھے ابھی آفس پہنچنا ہے۔ میں یہ بھابی کے لیے لے کر آیا تھا۔ آپ انہیں دے دیجیے گا۔'' فیصل نے پہلو میں رکھا ڈبہ اُن کی طرف بڑھایا۔
''یہ...... ؟ کیا ہے؟ فیصل......'' بی بی جان کے چہرے پر واضح ہچکچاہٹ تھی۔

''بھابی کے لیے موبائل فون ہے۔ اصم کی اُن سے بات نہیں ہو پائی تھی تو وہ پریشان تھا۔ میں نے کہا' میں بھابی کو بھی موبائل دے آؤں گا تو پھر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آرام سے بات ہو جائے گی۔'' فیصل نے تفصیل سے جواب دیا تو بی بی جان کو شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اُن کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ اس وقت اصم کے لیے سب گھر والوں کے علاوہ اپنی بیوی سے رابطے میں رہنا کس قدر ضروری ہے۔

''بس بیٹا...... پریشانی اتنی تھی' ذہن سے ہی نکل گیا تھا کہ اروی کے لیے بھی یہ ضروری تھا۔ تم مجھے فون کر دیتے میں خود منگوا دیتی۔''

''بی بی جان میں لے آیا ہوں ایک ہی بات ہے۔ آپ انہیں بتا دیجیے گا کہ اصم نے بھجوایا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آفس سے دیر ہو رہی ہے۔'' فیصل جوس کا گلاس ختم کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بی بی جان اُس کا شکریہ ادا کرنے اُسے دروازے تک رخصت کرنے آئیں۔

☆......☆......☆

انعم تجس کے ہاتھوں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ سبرینہ اور ثمن بھی چائے پینے کے لیے وہیں آ بیٹھی تھیں اور انعم انہیں فیصل کی اس وقت آمد کے حوالے سے آگاہ کرنے کے ساتھ اپنا تجسس بھی ظاہر کر رہی تھی۔

''پتہ نہیں فیصل اس وقت کیوں آیا ہے؟ اصم بھائی کی کنڈیشن اللہ کرے کہ ٹھیک ہو۔ اروی سے اُن کی شادی اُن کے لیے ہی مصیبت بن گئی ہے۔'' انعم کا اروی کے لیے وہی مخصوص رویہ تھا۔ جو نخوت و کدورت کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔

''انعم...... سوچ سمجھ کر بولا کرو...... اللہ کے فیصلے کسی نہ کسی مصلحت کے تحت ہی طے پاتے ہیں۔'' بی بی جان نے انعم کی بات سن لی تھی اُن کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور سرزنش بھی۔

سبرینہ اور ثمن اپنی اپنی جگہ پر جیسے چور سی بن گئی تھیں۔

''بی بی جان میں نے ایسا غلط تو نہیں کہا۔ اصم بھائی کی جب سے شادی ہوئی بے چارے کچھ نہ کچھ جھیل ہی رہے ہیں خود سوچیں اصم بھائی کتنی اذیت میں ہیں' صرف......'' انعم اپنے موقف پر ڈھٹائی سے ڈٹی انہیں زچ کر رہی تھی۔

''بس انعم...... چپ کر جاؤ...... عجیب باتیں کرنے لگی ہو تم...... جاؤ جا کر جانے کی تیاری کرو...... میں ڈاکٹر سے ٹائم لیتی ہوں۔'' بی بی جان نے بڑے ضبط سے اپنا غصہ دبایا۔ پھر ثمن سے مخاطب ہوئیں۔

''ثمن...... بیٹا یہ موبائل اروی کو دے آؤ' اصم نے بھجوایا ہے' فیصل اسی لیے آیا تھا۔'' بی بی جان نے انعم کو نظر انداز سا کر دیا۔ وہ ابھی تک وہیں موجود تھی۔ آخر بی بی جان ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ ثمن نے بھی حکم کی تعمیل میں پیش قدمی کی۔ سبرینہ کو منہ کھولنے کا موقع مل گیا۔

''بی بی جان کا رویہ کچھ بدل سا گیا ہے نا؟ انہیں اب صرف اروی کی ہی فکر رہتی ہے۔''

''اور اصم بھائی کو بھی دیکھو۔ بیوی سے بات کیے بغیر انہیں چین نہیں آ رہا۔ بستر پر لیٹے ہیں مگر نئی نویلی بیوی سے رومانس کی سوجھ رہی ہے۔'' انعم نے تائید اُن کی بھڑاس نکالی۔ سبرینہ بے ساختہ ہنسی۔

''یہ بھی تم نے خوب کہی نئی نویلی...... مگر زخمی دلہن سے رومینس کا تصور کتنا مضحکہ خیز ہے نا۔'' سبرینہ نے جان بوجھ کر انعم کو تڑپایا جانتی تھی اس وقت وہ اصم کے معاملے میں کس قدر حساس ہو رہی ہے۔

''یہ خمار بھی جلد اُتر جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ فائق کی محبت تو چار دن بعد ہی بیزاری میں بدل گئی تھی۔ یہ تو پھر مجبوری کا سودا ہے۔'' انعم نے ساتھ ہی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ سبرینہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مصنوعی ہمدردی سے سمجھایا۔

''فائق کو تو تمہاری قدر ہی نہیں ہے۔ نجانے کیا ہوگیا ہے اُسے تم دیکھنا آخر وہ تمہیں منانے آ ہی جائے گا۔''

''آنا تو پڑے گا اُسے...... میں بھی اب ایسے نہیں جاؤں گی۔'' انعم نے بڑے زعم سے کہا۔ سبرینہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ اُس کے چہرے پر ہلکا سا استہزا پھیل گیا تھا۔

☆......☆......☆

اروی کے پاس موبائل فون کا ڈبہ پڑا تھا اور سینے پر موبائل فون...... سوچیں سرشار تھیں۔ ثمن بھابی جب سے اُسے اصم کا بھیجا ہوا موبائل دے کر گئی تھیں۔ وہ خود کو مزید خوش قسمت خیال کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں بھی اصم کو نہ صرف اُس کی ضرورت اور اپنی ذمہ داری کا احساس تھا بلکہ اُس نے گھر والوں کو بھی باور کرا دیا تھا کہ کسی بھی حال میں وہ اروی کو فراموش نہیں کرے گا۔ اصم کے اس عمل سے تو یہی محسوس کر رہی تھی۔ اصم نے سیل فون میں اپنا اور گھر والوں کے چند خاص نمبر بھی Feed کروا کر بھیجے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی فوراً اصم کو کال کرے۔

ابھی وہ ذرا اوپر ہو کر بیٹھنے کے بعد اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فون ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھی ہی تھی کہ انعم کھٹاک سے دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

''ارے...... مجھے تو پتہ چلا تھا آپ آرام فرما رہی ہیں...... لیکن لگتا ہے اصم بھائی کے بھیجے ہوئے موبائل کو استعمال کرنے کی کچھ زیادہ ہی بے چینی ہے۔'' انعم دروازے سے ہی بولتی اُس کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔ اروی اُسے دیکھتے ہی گڑبڑا سی گئی اور موبائل فوراً ایک طرف پہلو میں رکھ دیا۔

''نہ...... نہیں...... میں تو...... کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔'' انعم نے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

''اچھا......! تو پھر آپ چیک کر رہی ہوں گی۔ اتنا Expensive ایسا برانڈڈ موبائل فون کبھی آپ نے تو نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر آپ کو اسے یوز کرنے میں دقت پیش آئے تو شمو سے سمجھ لینا...... وہ بھی کافی ایکسپرٹ اور ٹرینڈ ہو چکی ہے۔'' وہ اتنی کم فہم تو نہیں تھی جو انعم کا انداز و رویہ نہ سمجھتی۔ وہ برملا اُسے اُس کی کم حیثیتی جتا رہی تھی۔ اروی کے چہرے کا رنگ یکدم زردی مائل ہوگیا۔

''انعم آپ پریشان نہ ہوں۔ اتنی Awarenes تو اب بچے بچے کو بھی ہے اور پھر میڈیا کے ذریعے کافی نالج مل جاتی ہے۔'' اروی نے کافی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''آپ تو برا مان گئیں...... میں تو بس مشورہ دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ کی کلاس اس طرح کی Awarenes بھی افورڈ کر سکتی ہے۔'' اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہتے ہوئے نئے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ انعم کا برتری جتاتا رویہ خاصا تکلیف دہ تھا۔ اروی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مزید کیا جواب دے۔ حالانکہ کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سو خاموش ہوگئی۔ انعم پہلے تو اُس کی کیفیت سے محظوظ ہوئی پھر اُس کی خاموشی سے بیزار ہو کر کھڑی ہوگئی۔

''مجھے لگتا ہے آپ کو میری موجودگی اچھی نہیں لگ رہی۔'' انعم نے قدرے چڑ کر اُسے مخاطب کیا تھا۔

''ضروری نہیں ہے۔ جو آپ محسوس کریں وہ صحیح ہو بہرحال میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز آپ شمو کو بھیج

دینا۔ مجھے واش روم میں جانا۔'' اروی نے اپنے لہجے کو نارمل رکھ کر کافی اپنائیت ظاہر کی۔

''میں بھیجوں شمو کو؟ خود بلا لو...... انٹر کام ہے نا۔'' انعم کے تیور مزید بگڑ گئے تھے۔ وہ بڑبڑاتی وہاں سے نکلی۔

''میں اس کی ملازمہ ہوں کیا؟ مجھے آرڈر دے رہی ہے۔ آئی کہیں کی مہارانی...... دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ بتاتی ہوں بی بی جان کو...... سمجھ کیا رکھا ہے اُس نے مجھے۔'' وہ اندر ہی اندر کھولتی نیچے اُتر کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔ شکر تھا کسی سے سامنا نہیں ہوا تھا ورنہ ہنگامہ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

سبرینہ کو موقع نہیں مل رہا تھا کہ شہرینہ کو کال کر لیتی' نہ ہی شہرینہ نے اُسے فون کیا تھا حالانکہ وہ کہہ کر آئی تھی کہ وہ اُس سے بات کرے۔ اب کچن سے ذرا فراغت پا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ کچھ دیر میں بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ پھر اُسے موقع نہ ملتا۔ شہرینہ آجکل اپنی قریبی دوست کے پرائیویٹ اسکول کو بحیثیت پرنسپل وقت دے رہی تھی۔ اُس کی دوست اسکول کی نئی برانچ کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سبرینہ کو علم تھا اس وقت وہ اسکول میں ہی ہوگی۔ دوسری تیسری گھنٹی پر اُس نے سبرینہ کی کال ریسیو کی۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بہن سے شکوہ کناں ہوئی۔

''کل کہہ کر آئی تھی کہ مجھے فون کرنا یا پھر میری طرف چکر لگا لینا مگر بھئی تم واقعی 'میڈم' ہوگئی ہو۔''

''سبرینہ...... تم جانتی ہو میرا فضول وقت ضائع کرنے میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں تمہیں کل ہی بتا چکی ہوں۔'' دوسری طرف شہرینہ کافی سنجیدہ تھی۔

''بے وقوف ہو تم...... یہی تو موقع ہے...... تمہیں سمجھ ہی نہیں آرہی۔'' سبرینہ قدرے جھنجلائی۔

''مجھے تو سمجھ آگئی ہے سبرینہ...... تم خود کو بے وقوف بنا رہی ہو...... جو شخص پہلے مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں تھا۔ وہ اب...... پسند کی شادی کرنے کے بعد کیسے میری طرف مائل ہو سکتا ہے۔'' شہرینہ کے لہجے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس مسئلے پر کافی بیزار ہے۔

''تب بھی تم نے ہی مائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب دیکھنا میری کوشش تمہیں تمہاری محبت تک کیسے لے جاتی ہے۔'' سبرینہ کافی پُرجوش سی تھی۔

''ہونہہ...... اصم کے لیے بھی تمہارا یہی دعویٰ تھا۔''

''مانتی ہوں...... اصم کے حوالے سے تمہیں خواب دکھا کر غلطی کی تھی۔ کیا کرتی' ان لوگوں کے اصول...... ایک گھر سے دو بہوئیں لانے کا رواج ہی نہیں ہے ان میں...... مگر تم دیکھنا فائق کو تمہارے مقدر کا ہمسفر کرنے کے لیے کیا کرتی ہوں۔''

''سبرینہ......'' شہرینہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُسے کیسے روکے ٹوکے۔

''بس اب تم کچھ نہیں بولو گی...... ماما کا ہی کچھ خیال کر لو...... وہ تمہارے لیے کتنی فکر مند ہیں۔ میں ویک اینڈ پر چکر لگاتی ہوں پھر تفصیل سے بات کریں گے' او کے اللہ حافظ۔'' سبرینہ نے دوسری طرف موجود بہن کو مزید بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ بہن کے لیے اُس کے ذہن میں بہت کچھ تھا جسے وہ عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ مارچ میں ملاحظہ فرمائیں)

بازگشت

حسب نسب

تحریر کی روانی اور گیرائی لیے یقیناً یہ یادگار افسانہ آپ کے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دے گا

لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیتل کے جھال پال تیتڑے' اونچا حمام' مٹکے' رنگ برنگی صابن دانیاں' بیسن' ابٹن' جھانوے' لوٹے' آفتابے' مگے' کھونٹیوں پر غرارے اور میلے دوپٹوں کا انبار' آنولوں' ریٹھوں سے بھری طشتریاں' اندھیرا خدوس مواعلی بابا چالیس چور کا غار...... لیکن یہی غسل خانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اسی کی ہر شیشے والی بند کھڑکی کا رخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے شیشے کا رنگ ناخن سے ذرا کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ چھمی بیگم کے لاڈلے ابن عم اجو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے۔ پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہ جہاں اپنے قید خانے میں تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے تھے۔ باہر والا مردانہ' جس کے صحن چمن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ''چنبیلی والا مکان'' کہلاتا تھا۔ زنانے حصے کے آنگن میں املی کا سایہ دار درخت کھڑا تھا اس لیے محلے دار اسے ''املی والا مکان'' کہتے تھے۔ دونوں آنگنوں کے درمیان دیوار میں آمد و رفت کے لیے ایک کھڑکی تھی۔

چھمی بی کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھمی بی کی پیدا ہوتے ہی اجو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی۔ نو دس سال کی عمر میں منگیتر سے پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اجو بھائی بلا کے خوبصورت اور کھلنڈرے تھے۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے اور دو بھائیوں کے گھر کا واحد چراغ تھے۔ اس لیے وہ تو جی بھر کے بگڑے۔ پتنگ بازی' کبوتر بازی' یہ بازی وہ بازی...... لیکن بڑے ابا اور ابا کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔ چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھیں۔ ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ ان کے ناز بھی کم نہ اٹھائے جاتے۔ ضدی' غصیلی اور طنطنے والی چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوش حال گھرانے کی بساط ہی الٹ دی۔ اس سال شاہجہاں پور میں جو ہیضے کی وبا پھیلی' اس میں پندرہ دن کے اندر اندر چھمی بیگم کے ابا اور اماں دونوں چٹ پٹ ہو گئے۔ چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی لیکن ابھی تایا اور تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اجو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا۔ چھمی بیگم ماں باپ

کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہوگئیں۔ شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کردی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا نئی تاریخ مقرر کریں ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہوگیا۔

بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی نے کہا کہ وہ چند مقدموں کے معاملات میں لکھنؤ جارہے ہیں اور مصاحبوں کے ساتھ اڑنچھو ہوگئے۔ اب املی والے مکان میں رہ گئیں بڑی اماں جو بالکل باؤلی ہورہی تھیں اور پھمی بیگم...... مردانہ سونا ہوگیا۔ ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھمو خان ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے۔ اندر سلامت بوا اور ان کی روتی لڑکیاں ناک سنگتی کھانے پکانے میں جتی رہتیں۔ گھر کی حفاظت کے لیے بڑی اماں نے ایک بوڑھے رشتے دار ملن خان کو بریلی سے بلوا بھیجا جو چنبیلی والے مکان کے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے۔

اجو بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ ہر خط میں ماں کو لکھ بھیجتے کہ تاریخ بڑھ گئی ہے۔ مہینے دو مہینے میں آجاؤں گا۔ پورے چھ مہینے بعد آئے تو بڑی اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ بولے 'جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سدھرتے' میں شادی وادی نہیں کرنے کا۔ اس کے بعد پھر واپس لکھنؤ۔

جبھی سے پھمی بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں۔

اب پھمی بیگم انیس سال کی ہوچکی تھیں۔ اجو بھائی نے شاید طے کرلیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے۔ لوگوں نے آکر بتایا تھا کہ وہاں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پھمی بیگم نہ جانے کیسا نصیب لے کر آئی تھیں' ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں۔

اب پھمی بیگم تن تنہا حق حیران رہ گئیں۔ آنگن میں الو بولنے لگا۔ مزید حفاظت کے خیال سے اندھے دھندے ملن خاں چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہوگئے۔ ادھر دالان میں پڑے وہ کھانستے رہتے۔ ڈیوڑھی میں دھمو خاں کھانستا رہتا۔

اجو بھائی ماں کے مرنے پر آئے تھے۔ تیجہ کرتے ہی واپس چلے گئے۔ کس طرح انہوں نے بیچ منجدھار میں پھمی بیگم کا ساتھ چھوڑا۔ اللہ! اللہ! جب وہ سوچتیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا۔ مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آجاتا یا کبھی کبھار ملن خان کے نام خیر خبر پوچھنے کا خط۔

ملن خاں کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آگئی تھیں

لیکن اپنی تنگ مزاجی کی وجہ سے چھمی بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی۔ دن بھران رشتے داروں سے لڑنے جھگڑنے یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلسنے کے بعد چھمی بیگم پھر غسل خانے میں گھس جاتیں اور روتیں۔ ''شاہجہانی شیشے'' میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں۔

یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے' وہ سوچتیں۔ ابھی سب کچھ ہے' ابھی کچھ بھی نہیں' کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس گھر میں کتنی رونق تھی۔ دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ صحن میں مونڈھے پڑے ہیں۔ گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں' ابا اور بڑے ابا کے دوستوں کی محفل جمی ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ قوال گا رہے ہیں۔ جب اجو بھائی کے دوست احباب آتے تو اجو آنگن والی کھڑکی میں آکر کھنکارتے اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے۔ ''ارے بھئی چھمو! ذرا چائے تو بھجوادو۔''

اس بھرے پرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی۔

اپنے اس شدید یاس اور ناامیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اجو واپس آئیں گے۔ چنبیلی والا گھر پھر آباد ہوگا۔

جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں۔ دھمو خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکار کی صفائی کرواتیں۔ دالان کے جالے صاف کیے جاتے۔ اندر کمرے مقفل تھے۔ دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا' ابا اور اجو کے کمروں پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتی' ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس آجاتیں۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہوگئیں۔ بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے۔ اب انہیں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی۔ دل دنیا سے اچاٹ سا ہو گیا لیکن غصے اور طنطنے کا عالم وہی رہا بلکہ اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لیے وجوہ کچھ کم نہ تھیں۔ ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان۔ دادا پردادا ہفت ہزاری نہ سہی' ایک ہزاری (یا گھوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضرور ہی رہے ہوں گے۔ سارے کنبے کا سرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خودداری اور غصہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ اس خاندان میں کھنبل کبھی نہ ہوئی۔ ماضی کے ان جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اس فکر میں وہ بالکل قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ محلے کی عورتوں سے ملنا جلنا بھی بند کر دیا۔ بیواؤں کے سے سفید کپڑے پہننے لگیں۔ ان کا زیادہ تر وقت مصلے پر گزرتا۔

اکثر دوپہر کے سناٹے میں سلامت بوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراؤنی آواز میں آپ ہی آپ بڑبڑاتیں۔ ''باری تعالیٰ فرماتا ہے۔ مجھے دو وخت اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے' ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں' اسے کوئی بگاڑنے کی کوشش کرے اور دو جب جسے میں بگاڑ رہا ہوں' وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے' بس دو وخت۔'' اور چھمی بیگم دہل کر ڈانٹتیں۔

''اے سلامت بوا! نحوست کی باتیں مت کرو۔''

لیکن سلامت بوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں۔

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ چھمی بیگم غسل خانے میں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے اور چھمی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ جلدی سے بال تولیے میں لپیٹ کر کھڑاویں پہن رہی تھیں۔ جب باہر سے سلامت بوا کی سڑیلی نواسی نے زور سے غسل خانے کے دیمک لگے کواڑ کی کنڈی کھڑکائی۔

''آپا! اے آپا جلدی نکلو۔''

''ارے کیا ہے باؤلی!'' چھمی بیگم نے جھنجلا کر آواز دی۔

''آپا! چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا ہے کہ چار پانچ جنوں کے لیے چائے بھجوادو جلدی۔''

''کیا؟ کیا؟'' چھمی بیگم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے جلدی سے شاہجہانی شیشے سے آنکھ لگا دی۔

صحن کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ باہر دو تانگے کھڑے تھے۔ دو تین لقندرے سامان اتروا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقشے والی عورت سرخ جارجٹ کی ساڑی پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں موڑھے پر بیٹھی اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھی۔ ایک اس کی ہم شکل تیرہ چودہ سالہ لڑکی شکل والی اچھال چھکا سی لڑکی کاسنی شلوار قمیص پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک

بکس کھولنے میں مشغول تھی۔ اتنے میں اندر سے اجو بھائی' جی ہاں' ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل ہی اندھا کنواں بن گیا۔ انہوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑی۔ لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ سی ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔

بات یہ تھی کہ اجو بھائی جنہوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلو کو گھر میں ڈال رکھا تھا' اب باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی' کلو اپنے ساتھ لائی تھی۔ اجو بھائی کی نہیں تھی۔

شام کو اجو بھائی پردہ کروائے بغیر زنانے میں چلے آئے اور دالان میں پہنچ کر پکارا۔ ''ارے بھئی چھمو' آؤ' اپنی بھابی سے مل لو۔''

چھمی بیگم کانپ کر رہ گئیں۔ پلنگ سے اٹھ کر پھر غسل خانے میں جا گھسیں اور زور سے چٹخنی چڑھا دی۔ اجو بھائی ذرا چور سے بنے دالان کے ایک در میں کھڑے رہے۔ کلو ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر سر جھکائے چنبیلی والے مکان میں واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے چھمی بیگم کی دنیا بدل گئی۔ اب وہ سارا دن قرآن شریف ہی پڑھا کرتیں۔ اجو نے انہیں اتنے برسوں سے ہوا میں معلق رکھ کے' ان کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی' اس ناقابلِ برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انہیں اس بات کی تھی کہ انہوں نے کلو بائی طوائف سے شادی کر کے خاندان کا حسب نسب برباد کر دیا۔ چھمی بیگم اس جرم کے لیے انہیں مرتے دم تک معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ کلو نے کئی بار ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آ کر آہستہ سے کہتی۔ ''بیٹا' کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے۔'' کبھی کوئی خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ سینی میں بھجواتی لیکن چھمی بیگم نے دھمو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔ گھر واپس آنے کے بعد دوسرے مہینے اجو بھائی نے ملن خاں کے ہاتھ دو سو روپے بھجوائے جو وہ اب تک لکھنؤ سے بھیجا کرتے تھے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔

چھمی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں۔ ''جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے۔ ملن خاں! غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر یہ دو سو روپے بھیجنے والے کے منہ پر دے مارو۔'' یہ رمز پڑھ کر انہوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کر لیا اور اس میں موٹا قفل ڈال دیا۔

اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے۔ جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمی بیگم کو دھمو خاں' ملن خاں' سلامت بوا اور ان کے چینگو پوتوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ انہوں نے گھر میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لیے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔ جب محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں اور بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا ہڑبڑا گئیں اور غصے سے بولیں۔ ''بی بی! کیا آن پر جان دے دو گی؟ ایسی بھی کیا نگوڑی آن۔'' لیکن چھمی بیگم پر غنودگی طاری تھی۔ سلامت بھاگی بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں۔

کلو فوراً سر پر برقع ڈال گلی کے راستے اندر آئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ کلو ساری رات نند کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ اجو بھائی نے کئی بار آ کر دکھیاری چچازاد بہن کی حالت دیکھی لیکن شاید اب بھی اس بے انصافی کا احساس انہیں نہ ہوا جو انہوں نے چھمی بیگم کے ساتھ کی تھی کیونکہ بقول سلامت بوا' اس کالی کلوٹی کلو نے انہیں الو کا گوشت کھلا رکھا تھا۔

چھمی بیگم کو جونہی ہوش آیا' آنکھیں کھولیں اور کلو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا۔ ان پر غم و غصہ کا بھوت پھر سوار ہو گیا۔ کلو ان کے پٹھانی جلال سے بے حد خوف زدہ تھی۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی۔

بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفا شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں' کلو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمی بیگم اسے کھلے دل سے بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر اصلی والے مکان میں

داخل کریں۔ اس کی یہ تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔
دس سال نکل گئے۔ اجو بھائی کو چھمی بیگم کے رشتے کی بھی فکر تھی لیکن چھمی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ اب ان سے شادی کون کرے گا؟
چھمی بیگم ان سے اور کلو سے اسی طرح شدید پردہ کرتی تھیں۔ اسی طرح مدرسہ چلا کر گزر کر رہی تھیں کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ آدھا شاہ جہانپور سمجھو خالی ہو گیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اجو بھائی دلی گئے اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب ان کی سناؤنی آئی ہے 'کلو بچھاڑیں کھانے لگی۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ آنگن کی کھڑکی پر مکے مار مار کر ہاتھ لہولہان کر لیے۔ ''بٹیا' بٹیا' دروازے کھولیے ہائے بٹیا...... ! بٹیا! ارے میں کہیں کی نہ رہی۔''
چھمی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ بین سن کر جاگ اٹھیں۔ گھبرا کر دیوار کی کیل سے کنگھی کنجی اتاری۔ تالا کھولا۔ کلو بال بکھرائے بھتنی کی طرح چیخ رہی تھی۔
''ارے لوگو! میرا سہاگ لٹ گیا۔ ہائے بٹیا! میری مانگ اجڑ گئی۔'' اس نے آگے بڑھ کر چھمی سے لپٹنا چاہا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آ گئی۔ تب وہ بھی کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سفید دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔ سسک سسک کر رونے لگیں اور روتے روتے بولیں۔ ''اری مردار! تو' تو آج بیوہ ہوئی ہے' میں بدبخت تو سدا کی بیوہ ہوں۔''
اجو بھائی کے چہلم کے بعد ہی کلو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس کی لڑکی اشرفی کا چند سال پہلے اجو بھائی مرحوم نے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروا دیا تھا۔ وہ لکھنؤ سے آئی۔ چنبیلی والے ساز و سامان پر قبضہ کیا اور سب چیزیں چھکڑوں پر لدوا کر چلتی بنی۔ چھمی بیگم غسل خانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے سارے تماشے دیکھتی رہیں۔
چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا کیوں کہ چھمی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کر پائیں کہ اجو بھائی پاکستان نہیں گئے بلکہ بلوے میں مارے گئے

ہیں۔ خود کسی پرانے آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں۔ ملن خان اور دھمو خاں بڑھاپے اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر گئے۔ سلامت بوا پر فالج گر گیا۔ ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے۔ چھمی بیگم سلائی کر کے پیٹ پالتی رہیں۔ تن تنہا مکان میں رہتے اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا کیونکہ سر سفید ہو چکا تھا۔ بہت جلد محلے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی۔
کچھ عرصے بعد چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے۔ کبھی کبھی سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آ بیٹھتیں اور وہ چھمی بیگم سے اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چرنجیت کی شادی نئی دہلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی۔ اب کی بار وہ میکے آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اس کے شوہر کے مسلمان افسر اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے۔ وہ گھر پر رہ کر ان کے بچوں کو اردو اور قرآن پڑھائے۔ میں تو چھمی ماسی سے کہتے ڈرتی ہوں۔ انہیں جلال آ جائے گا۔ آپ کہہ کر دیکھیے۔
بڑی سردارنی نے چھمی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا۔ سمجھایا' بجھایا۔ ''بہن جی! اس تنگدستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی۔ دلی چلی جاؤ۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں عزت و آرام سے بڑھاپا کٹ جائے گا۔''
چھمی بیگم کا غصہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا۔ جوش و خروش طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اگر کل کلاں کو مر گئی تو آخر وقت میں یٰسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے۔
قصہ مختصر یہ کہ چھمی بیگم برقع اوڑھ صرف ایک بکس اور بستر اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں جو اب تک بالکل کھنڈر ہو چکا تھا اور جس کے کھنڈر ہونے کا اب انہیں قطعی غم نہ تھا کیونکہ وہ تیاگ اور سنیاس کی اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچیں جہاں ریلوے اسٹیشن پر بے چاری بیگم صبیح الدین چرنجیت سندر سنگھ کا خط ملنے پر کار لے کر خود انہیں گھر لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔
اس روز سے چھمی بیگم بنت جمعہ خاں زمیندار شاہجہاں پور مغلانی بی بن گئیں۔
چھمی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے سے لپیٹے صبیح الدین صاحب کے گھر میں گزار

دیئے۔ بچے جنہیں وہ قرآن شریف اور اردو پڑھانے آئی تھیں بڑے ہوگئے۔ بڑا لڑکا بی اے کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا۔ منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی۔ چھوٹی لڑکی کالج پہنچ گئی۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمی بیگم کی ضرورت نہیں تھی۔ صبیح الدین صاحب ریٹائر ہوکر اپنے وطن مرزا پور جانے والے تھے۔ دلی سے روانہ ہونے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا۔ راشد علی صاحب بھی حکومت ہند کے اعلیٰ افسر تھے۔

چھمی بیگم، صبیح الدین صاحب کے ہاں بہت سکھ چین سے رہی تھیں۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ انہیں تینوں بچوں سے بے حد محبت ہوگئی تھی۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا۔ اگر آتا بھی تو اپنی مجبوریوں کا خیال کرکے پی جاتی تھیں۔ اب وہ تیہا دکھاتیں بھی کس پر۔ ناز اٹھانے، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ کبھی کبھی انہیں کلو کا خیال بھی آجاتا اور سوچتیں، نہ جانے کمبخت اب کہاں اور کس حال میں ہوگی یا شاید وہ مرکھپ گئی ہو۔ آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ ہے۔

بیگم راشد علی بیگم صبیح الدین کی طرح دردمند اور دیندار خاتون تو نہ تھیں۔ آج کل کی ماڈرن لڑکی تھیں لیکن عزت انہوں نے بھی چھمی بیگم کی بہت کی۔ یہاں بھی وہ گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتیں۔ راشد علی صاحب ان کا بہت خیال رکھتے۔ ان کی بارعب، پروقار شکل وصورت اور اعلیٰ نسبی سے بہت ہی متاثر تھے۔ بیگم راشد اکثر سہیلیوں سے کہتیں۔ ''بھئی واقعی، زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب آتے ہیں۔ پل کی پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ہماری مغلانی بی کا قصہ سنا ہے آپ نے؟ یہ شاہجہاں پور کے فلاں فلاں خاندان......'' اور سننے والی خواتین سر ہلا کر ٹھنڈی سانس بھرتیں اور دوسرے اسی طرح کے عبرت انگیز نصیحت آموز واقعات سناتیں۔

بیگم راشد علی کے بچے بہت خورد سال تھے۔ ان پر حیدرآبادی ''آیاماں'' مامور تھی۔ چھمی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں۔ گھر سنبھالنے کے لیے بیگم راشد کو چھمی بیگم کی بے حد ضرورت تھی کیوں کہ ان کا اپنا وقت تو کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا۔

پانچ برس چھمی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں بھی کاٹ دیئے۔ جب راشد علی صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانے واشنگٹن ہونے لگا تو ان کی بیگم کو فکر ہوئی کہ چھمی بیگم کا کہیں اور ٹھکانہ بنائیں۔

ایک دن وہ اپنے الوداعی لنچ کے لیے روشن آراء کلب گئی ہوئی تھیں اور چھمی بیگم سے کہتی گئی تھیں کہ فلاں وقت کار لے کر منی کو میرے پاس لے آیئے گا۔

جب چھمی بیگم روشن آراء کلب پہنچیں، لنچ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ چھمی بیگم بچی کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں۔

چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں اور ساڑی پہنتی تھیں۔ اس نگوڑی دلی میں انہیں پہچاننے والا اب کون تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی اور ایک بے حد فیشن ایبل چالیس، پینتالیس سالہ حقاقہ وقاقہ خاتون پانچ چھ مردوں کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھیں۔

سترہ برس نئی دلی میں رہ کر چھمی بیگم اس نئی اعلیٰ سوسائٹی اور جدید ہندوستانی خاتون کی الٹرا ماڈرن طرز زندگی کی بھی عادی ہوچکی تھیں اس لیے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلنے لگیں۔

چند منٹ بعد اس خاتون نے سر اٹھا کر چھمی بیگم کو ذرا غور سے دیکھا، کچھ دیر بعد نظر ڈالی اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔

تب چھمی بیگم نے دیکھا۔ ایک مرد واتاش کی میز سے اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔

قریب آکر اس نے کہا۔ ''بڑی بی! ذرا ادھر آیئے۔''

چھمی بیگم متانت سے برآمدے میں پہنچیں۔ اجنبی خاتون نے پوچھا۔ یہ بچی کس کی ہے اور وہ کس کی ملازمہ ہیں؟ چھمی بیگم نے بتایا۔ خاتون نے کہا کہ وہ بمبئی میں رہتی ہیں اور آج کل انہیں بھی ایک قابل اعتبار بڑی بی کی تلاش ہے اگر وہ اپنی جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہوں تو بتائیں۔ چھمی بیگم فوراً دل میں اس رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجالائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے پھر انہوں نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ خود بہت جلد اپنی موجودہ ملازمت سے سبکدوش ہونے والی ہیں۔ ''میری بیگم ابھی باہر تی ہوں گی' ان

سے بات کر لیجیے۔" اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے انتظار میں وہیں برآمدے کے ایک در میں ٹک گئیں۔

جب بیگم راشد لنچ روم سے نکلیں تو میز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نام مسز رضیہ بانو بتایا اور چھمی بیگم کے متعلق ان سے بات کی۔ بیگم راشد بھی بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے وہ چھمی بیگم کو خود بمبئی کی ریل گاڑی میں بٹھا دیں گی۔ رضیہ بانو نے بتایا تھا کہ وہ آج شام ہی بمبئی واپس جا رہی ہیں۔ اپنے گھر کا پتہ لکھ کر انہوں نے چھمی بیگم کو دے دیا لیکن بیگم راشد نے ذرا متفکر ہو کر چھمی بیگم سے پوچھا۔ "خالہ! تم اکیلی اتنی دور کا سفر کر لو گی؟" چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لیے "نہیں" کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انہوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے ایک ہی تنخواہ اپنے لیے مقرر کی تھی۔ چالیس روپے ماہوار اور کھانا۔ یہ چالیس روپے ان کی ذاتی ضروریات کے لیے ضرورت سے زیادہ تھے۔

کپڑے ہمیشہ انہیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے لتے، گہنے پاتے، جائیداد املاک، رشتے ناتے، دوستی محبت سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں۔

بیگم راشد علی اور چھمی بیگم برآمدے سے اترنے لگیں تو رضیہ بانو نے فوراً بیگ کھول کر ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر چھمی بیگم کے حوالے کر دیئے۔

"سفر خرچ اور دوسرے اخراجات۔" انہوں نے ذرا بے پروائی سے کہا۔

بیگم راشد کو ان کی اس دریا دلی پر حیرت ہوئی لیکن انہیں خود معلوم تھا کہ بمبئی میں ایک سے ایک بڑی سیٹھانی ہوتی ہے۔ چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑوس لیے۔ انہوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمی بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رخ کیا۔

بمبئی سینٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں کیونکہ نئی دلی کی پرسکون کوٹھیوں میں انہوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گزاری تھی۔ اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے باہر نکلیں۔ قلی کے سر سے اپنا ٹین کا بکسا اور دری میں لپٹا بستر اتروایا۔ اپنا لوٹا، دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی۔ سردار جی کو پتہ بتایا۔

"گلزار جارڈن روڈ۔"

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالا نئی عمارت کی برساتی میں جا رکی۔ چھمی بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ دیا، جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلہ خیال کرتے آئے تھے۔

اسی وقت دو بے حد اسمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیگ گرایا اور پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ کس قدر غیر شخصی، منظم اور تکلینیکل زندگی اس شہر کی تھی۔

چھمی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پھر آنکھیں چندھائیں اور پتہ پڑھا۔ گیارہویں منزل فلیٹ نمبر 3، اسٹول پر بیٹھے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں خاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا۔ چھمی بیگم بہت گھبرائیں، چوکیدار جلدی سے اندر آیا اور انہیں گیارہویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا۔ اب چھمی بیگم اپنے سامان سمیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں پھر ان کی نظر ایک نزدیکی دروازے پر پڑی جس کے اوپر 3 لکھا تھا۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا تھا جو اندر سے مقفل تھا جیسے بینکوں کے دروازے ہوتے ہیں۔ چھمی بیگم نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کے جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا۔ چھمی بیگم کو دفعتاً برسوں بعد اپنے غسل خانے کی کھڑکی کا کھرچا ہوا شیشہ یاد آ گیا جس میں انہوں نے پہلی بار اس منحوس لال چڑیل کو دیکھا تھا جو ان کے بھرے پرے کنبے کو چٹ کر گئی۔ مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا۔ اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمی بیگم کو دیکھا۔ چھمی بیگم ڈر سی گئیں لیکن پھر یاد آیا وہ بھی پٹھان ہیں۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا۔

"بیگم صاحب سے کہو چھمی بیگم دلی سے آ گئی ہیں۔"

"معلوم ہے تم دلی سے آیا ہے' اندر آجاؤ۔" گورکھے نے خشکی سے جواب دیا اور باہر نکل کر ان کا بکس اور بستر اٹھایا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمی بیگم اندر آگئیں تو اس نے کھٹ سے دونوں دروازے قفل کر دیئے۔

اب چھمی بیگم ایک نیم تاریک' ایئر کنڈیشنڈ' بے حد عالیشان ڈرائنگ روم میں کھڑی تھیں۔ ایسا شاندار ڈرائنگ روم تو نہ بے چارے صبیح الدین صاحب کا تھا اور نہ ہی راشد علی صاحب کا۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا تھا۔ جو ذرا سا سرکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دیوار میں نصب سنیما کی چھوٹی سی اسکرین نظر آرہی تھی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں بار تھی۔

"بیگم صاحبہ ہیں؟" چھمی بیگم نے دونوں ہاتھوں میں لوٹا' پندنیا اور پنکھا اٹھائے دریافت کیا۔

"میم صاحب سو رہا ہے۔"

"اور صاحب؟" ملازمت شروع کرنے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا۔ چھمی بیگم اس کے پیچھے پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہوئی چلیں۔ گیلری میں دو رویہ چار دروازے تھے جو سب اندر سے بند تھے۔

آگے جا کر گیلری بائیں طرف کو مڑ گئی۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر سے کمرے تھے جن کے باہر بالکونی تھی۔ نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالہ پڑا تھا۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھری میں جا کر گورکھے نے بکس بستر ادھم سے زمین پر رکھ دیا اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق کے تختے پر رکھ کر اپنی نئی جائے پناہ' نئے ٹھکانے پر نظر ڈالی۔ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ انہوں نے دل میں سوچا' یہ بہت چبھے گا۔ دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی ہوئی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔ کوٹھری میں حبس طاری تھا۔ چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی تو اچانک سمندر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ نیلا' وسیع' بکھرا ہوا' سمندر ٹھاٹھیں مارتا' غیر متوقع' زندگی کے واقعات کی مانند اچانک' انہوں نے سمندر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دفعتاً خیال آیا اس کارساز کے قربان جاؤں۔ سمندر تک پہنچ گئی۔ اب انشاء اللہ حج بھی کر آؤں گی۔ اسی سمندر کے اس پار مکہ مدینہ ہے۔ یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا۔

کوٹھری سے ملحق نوکروں کا غسل خانہ تھا۔ چھمی بیگم نے بکسا کھولا' کپڑے نکالے' غسل خانے میں گئیں۔ اپنے آبائی مکان کا وہ طویل و عریض' نیم تاریک غسل خانہ' مامائیں' اصیلیں وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں کہ انسان پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے ورنہ مر جائے۔

نہا دھو' کپڑے بدل وہ پھر اپنی کوٹھری میں آئیں۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ نوکر نہ چاکر۔ صاحب دفتر گئے ہوں گے' بچے اسکول۔ میم صاحب سو رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اب انہیں چائے کی طلب ستانے لگی۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیز طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے ستری بہتری بھولی بھگی ہو کر رہ گئی تھیں۔ سادگی سے سوچا' اب کچن میں جا کر چائے بنالوں۔

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولہے نظر آئے جو استعمال کرنا نہ جانتی تھیں۔ ذرا جھنجلا کر گیلری میں آئیں جس کے چار دروازوں میں سے ایک اب کھل چکا تھا اور اس پر بڑا بیش قیمت پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ان کے پردے کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ "کون ہے؟"

"اوہو' آگئیں آجاؤ۔"

یہ پردہ سرکا کر اندر آگئیں۔ ایک بالکل شاہانہ خواب گاہ میں وسیع و عریض امریکن چھپر کھٹ پر رضیہ بانو گلابی رنگ کا نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ چھمی بیگم کو ان کا یہ پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا لیکن سوچا بھئی اپنا اپنا دستور ہے۔ اس شہر کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انہیں اچھا نہ لگا۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔ بہر حال انہوں نے بردباری سے کہا۔ "السلام علیکم!"

"آجاؤ بوا' بیٹھو۔" رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

جب سے چھمی بیگم برقع سر پر ڈال کر حق حلال کی

روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلی تھیں۔ آج تک انہیں کسی نے بوا نہیں کہا تھا۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انہیں چھمی خالہ یا صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے پر ٹک گئیں۔

رضیہ بانو کے سرہانے دو ٹیلی فون رکھے تھے۔ ایک سفید' ایک سرخ' سفید والے کی گھنٹی بجی۔ رضیہ بانو نے ریسیور اٹھا کر انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ ہاتھ بڑھا کر ٹیبل سے ایک بڑی سی مجلد نوٹ بک اٹھائی۔ اس میں کچھ لکھا پھر ریسیور رکھ کر سرخ رنگ کے ٹیلی فون کا ایک نمبر ملایا اور آہستہ سے کہا۔ ''مادھو چار نمبر' نائن تھرٹی'' اور فون بند کر دیا۔ چھمی بیگم خاموش بیٹھی آرائش دیکھتی رہیں۔ مرمریں مجسمے' بڑی بڑی تصویریں' ریڈیو گرام' طول طویل سفید رنگ کا وارڈ روب۔ اتنے میں پردہ سرکا۔ ایک طرحدار لڑکی ہاؤس کوٹ پہنے اندر آئی۔ گیلری کے بند دروازوں میں سے ایک کھلا۔ کمرے میں زور سے ''ہائی فائی'' کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ مٹ کی۔ الٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

''اللہ رکھے' کتنے بچے ہیں؟'' چھمی بیگم نے دریافت کیا۔ ''میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ یہ میری بھانجیاں میرے ساتھ رہتی ہیں۔'' رضیہ بانو نے مختصراً جواب دے کر پھر مجلد نوٹ بک کھول لی۔

''کالج میں پڑھتی ہوں گی۔'' چھمی بیگم نے کہا۔

''کون؟'' رضیہ نے بے خیالی سے پوچھا۔

''بھانجیاں آپ کی۔''

''ہوں۔''

''اللہ رکھے' آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں؟'' چھمی بیگم کو معلوم تھا کہ بمبئی میں سب لوگ بزنس کرتے ہیں۔

''ہیں؟ کیا؟'' رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا۔ ''میاں؟ میاں مر گئے۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' چھمی بیگم کے منہ سے نکلا۔ پل بھر کے لیے اجو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر موت کی خبر پر ہرا ہو جاتا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا تھا کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گزار دی صبر' شکر' صبر شکر!

چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی کمرے میں آئی۔ رضیہ بانو نے اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی۔ اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جنہیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں۔ رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا۔ ''بوا!'' (چھمی بیگم پھر کلبلائیں) آپ نے نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں آ گئیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دکھی ہیں۔ اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیے میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کہ کوئی بزرگ بی بی میرے ہاں رہیں۔ بڑا سہارا سا رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز قرآن پڑھتی رہا کریں۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدر آبادی بڑی بی تھیں۔ وہ پچھلے سال بے چاری حج کرنے گئیں تو وہیں انتقال ہو گیا۔''

''اچھا۔'' رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔

''میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں بوا کہ یہ بمبئی شہر میدان حشر ہے۔ طرح طرح کی باتیں' طرح طرح کے لوگ۔ آپ کسی بات پر کان نہ دھریئے' بس اپنے کام سے کام رکھیے۔ کچن کی نگرانی کر لیجیے۔ باقی وقت اپنے نماز روزے میں گزاریئے۔ اب آپ کے لیے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔ قرآن شریف پڑھیے۔ میرے حق میں دعائے خیر کرتی رہا کیجیے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں' میری بھانجیوں کے لیے دوسری آیا موجود ہے۔ ابراہیم خانساماں کا نام ہے۔ بشن سنگھ گورکھا ہے۔ مادھو میرا ڈرائیور ہے لیکن بلا کسی ضرورت کے جھگڑوں قضیوں میں نہ پڑیے۔''

''میں خود......'' چھمی بیگم نے کہنا چاہا۔ لیکن رضیہ بانو نے ان کی بات کاٹی۔

''میری اللہ کے فضل سے بہت بڑی بزنس ہے۔'' کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''ایکسپورٹ امپورٹ جانتی ہیں' ایکسپورٹ امپورٹ؟''

''جی ہاں!'' چھمی بیگم نے سر ہلایا۔ صبیح الدین صاحب محکمہ تجارت کے افسر تھے اور اس طرح کے الفاظ

چھمی بیگم کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ رضیہ بانو چھمی بیگم کو بہت سمجھ دار اور نیک دل بی بی معلوم ہوئیں اور اس قدر خدا پرست کہ چھمی بیگم نے ان کا باریک نائٹ گاؤن اور سگریٹ نوشی معاف کر دی۔

''میں عورت تن تنہا اتنا بڑا کاروبا چلا رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ بھانجیاں بھی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ ان کے دوست احباب بھی آتے رہتے ہیں پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔''

''پولیس؟'' چھمی بیگم نے ذرا دہل کر دہرایا۔

رضیہ بانو ہنس پڑیں۔ ''ڈریئے نہیں' یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس والے پریشان کرتے ہیں۔ میں اکیلی عورت' دسیوں دشمن ہو گئے۔ کسی نے پولیس کو جا کر خبر دی کہ میں نے انکم ٹیکس نہیں دیا۔ بس دوڑ آ گئی۔ اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوالیا ہے تو آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے تو آپ پہلے سوراخ میں سے دیکھ کر اطمینان کر لیجیے۔ کبھی کبھی پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آ جاتے ہیں۔''

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔ ''بی بی' گیس کا چولہا کیسے جلتا ہے؟''

رضیہ بانو نے سرہانے ایک برقی بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ میں ابراہیم باورچی دروازے میں نمودار ہو گیا۔

''ابراہیم! یہ ہماری نئی بوا ہیں' ان کے لیے چائے تو بنا دو جھٹ پٹ۔''

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراہیم کے پیچھے پیچھے کچن کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ظہر' عصر' مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکونی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گھر میں کام کرنے کے لیے کچھ کام ہی نہ تھا۔ کمروں میں روشنی جل رہی تھی۔ تیسری بھانجی غائب تھی۔ تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے اس لیے گھنٹی بجی تو بجتی ہی چلی گئی۔ چھمی بیگم نئی دلی کی عادت کے مطابق فوراً دروازہ کھولنے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں اور جلدی سے اندر والا دروازہ کھول دیا۔ باہر کا آہنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف کو سرکا ہوا تھا۔

اور جس طرح صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائنگ روم کی دہلیز پر آ کر وہ مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتی تھیں۔ ''تشریف لائیے۔'' اسی عادت کے مطابق انہوں نے اخلاق سے کہا۔

''تشریف لائیے۔''

دو فربہ مارواڑی' ایک معطر نوجوان امیرزادہ اندر داخل ہوئے۔ امیرزادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔ فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ صبیح الدین کے ہاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے۔ معطر نوجوان کو دیکھ کر البتہ ذرا تعجب ہوا پھر سوچا' اس شہر کا یہی دستور ہو گا۔ ابھی وہ یہی طے کر رہی تھیں کہ معزز مہمانوں سے چائے کے لیے پوچھیں یا کافی کے لیے کہ سونے کے بٹنوں اور ہیرے کی انگوٹھیوں والے فربہ مارواڑی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ''میڈم کدھر ہے؟''

چھمی بیگم بخوبی جانتی تھیں کہ بیگم کو میڈم کہتے ہیں۔ سلیقے سے جواب دیا۔ ''میڈم باہر گئی ہیں۔''

''سالا چھوکری لوگ کدھر گیا؟''

چھمی بیگم کو غصہ آ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اہل بمبئی تمیزدار اور اہل زباں نہیں لیکن یہ گالی گلوچ کیا معنی؟ انہوں نے ہونٹ پچکا کر پوچھا۔ ''بیگم صاحبہ کی بھانجیاں؟''

اتنے میں دروازہ کھلا اور رضیہ بانو سرعت سے خود اندر آ گئیں۔ چھمی بیگم سے کہا۔ ''بوا' تم جا کر اپنی کوٹھری میں بیٹھو' آرام کرو۔''

''جی اچھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ان کے گیلری میں سے گزر جانے کے بعد ایک بھانجی کے کمرے سے ایک صاحب نکل کر باہر چلے گئے۔

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھری میں جا کر بستر کھولا۔ جاء نماز نکالی۔ وضو کیا' نفلیں پڑھنے لگیں اور اس رب ذوالجلال کا شکر ادا کیا جسے اپنے بندوں پر صرف دو وخت ہنسی آتی ہے اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج' ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کے حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔ (سورۃ محمد 33)

شیطان کا گھر

حضرت انسؓ سے روایات ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کا پتلا بنایا تو کچھ عرصے تک اسے یونہی رہنے دیا۔ شیطان اس پتلے کے اردگرد چکر لگاتا تھا اور اس پر غور کرتا تھا' جب اُس نے دیکھا کہ اس مخلوق کا جسم کے درمیان پیٹ ہے تو وہ سمجھ گیا کہ یہ مخلوق اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے گی۔

رفعت۔ کراچی

محبت

محبت...... مرد کے لئے صرف ایک لمحہ ہوتی ہے۔
جبکہ...... عورت کے لیے ساری زندگی ہوتی ہے۔
مرد کی محبت دھنک کی طرح ہوتی ہے جو ہوتی تو بہت خوبصورت ہے مگر رہتی بہت کم عرصے کے لیے ہے۔
جبکہ...... عورت کی محبت بارش کی طرح ہوتی ہے جو برستی ہے تو دل و جاں کو سکون دیتی ہے برسنے کے بعد بھی دل و جاں کو اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے مرد کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے شدید اور سارے وجود کو اپنے آپ میں سمیٹ لینے والی...... مگر جب یہ درد ختم ہوتا ہے تو لگتا ہے کبھی ہوا ہی نہ تھا۔
جبکہ...... عورت کی محبت سر درد کی طرح ہوتی ہے اور درد سارے وجود کو اذیت دیتا ہے مگر ختم ہونے کے بعد بھی جسم و جان کو مضمحل رکھتا ہے بہت دیر تک درد کا احساس باقی رہتا ہے۔
مرد کی محبت چودھویں کے چاند کی طرح ہوتی ہے جو پوری آب و تاب سے چمکتا ہے ہر طرف روشنی کر دیتا ہے مگر پھر آہستہ آہستہ گھٹنا شروع کر دیتا ہے اور کم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔
جبکہ...... عورت کی محبت پہلی رات کے چاند کی طرح ہوتی ہے جو شروع میں تو بہت کم ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اُس کی روشنی اور شدت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

حقیقت

کیا تم نے کبھی موت کو دیکھا ہے؟
بالکل ویسی ہے
جیسی میں زندگی تمہارے بغیر گزار رہی ہو

زندگی

زندگی محبوب کی نگاہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے
محبوب مہربان تو خزاں میں پھول کھلنے لگتے ہیں

اور محبوب نگاہ پھیر لے تو
پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کا بستر بن جاتی ہے
راحت وفا راجپوت۔ لاہور

فرق

شِفا اور شَفا میں کیا فرق ہے۔
شِفا کا مطلب ہے صحت' تندرستی
شَفا کا مطلب ہے موت' گڑھا' کنارہ

ارم حمید۔ کراچی

نعمت

ایک عورت نے کسی عالم سے پوچھا۔
''اسلام نے ہمیں شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا پابند کیوں کیا ہے؟'' عالم نے پوچھا۔
''تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟'' عورت بولی۔
''3 بیٹے ہیں۔'' اس پر عالم نے جواب دیا۔
''اللہ نے تمہیں ایک مرد کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور 3 مردوں کو تیری اطاعت کا حکم دیا ہے۔ تیری اطاعت اور تیرے ساتھ اچھا معاملہ کیے بغیر وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ اب تم بتاؤ زیادہ پابند کون ہے مرد یا عورت؟'' عورت نے جواب دیا۔
''بے شک اسلام کی نعمت پر میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔''

غزالہ۔ بحرین

غزالہ رشید کی ڈائری سے

امریکہ نے چور پکڑنے والی مشین تیار کی۔
امریکہ میں 30 منٹ میں 5 چور پکڑے گئے۔
افغانستان میں 30 منٹ میں 10 چور پکڑے گئے۔
انڈیا میں 30 منٹ میں 60 چور پکڑے گئے۔
اور پاکستان میں 15 منٹ میں مشین چوری ہوگئی۔

مرزا جی!

جس طرح مرزا غالب نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا۔ اسی طرح مطالعہ کے لیے بھی باوجود یہ کہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری' کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہمیشہ کرائے پر کتب منگواتے اور مطالعہ کے بعد واپس کردیتے۔

رباعی

بعد از تمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم
اے غمِ گزشتہ یک قدم استقبال

رضوانہ پرنس کی ڈائری سے

ایک بوڑھے مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔
''میری دائیں ٹانگ میں بہت درد ہوتا ہے۔''
''بڑے میاں ایسا عمر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔''
''لیکن میری دوسری ٹانگ بھی تو اسی عمر کی ہے۔'' بڑے میاں نے احتجاج کیا۔

قطعہ

تاریخ ہزاروں سالوں میں بس اتنی بدلی ہے
وہ دور تھا پتھر کا یہ لوگ ہیں پتھر کے

ہائے ری قسمت

ایک مینڈک نے قسمت کا حال بتانے والے کمپیوٹر کا بٹن دبایا تو جواب آیا۔
''یکم جنوری 2017ء کو تمہاری ملاقات ایک حسین لڑکی سے ہوگی۔'' مینڈک نے خوشی سے بے تاب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ملاقات کہاں ہوگی، کسی پارٹی میں یا کسی نہر کے کنارے؟'' کمپیوٹر سے جواب آیا۔

''میڈیکل کالج کی لیبارٹری میں آپریشن کرنے والی میز پر۔''

رشک

ہم ساری زندگی دوسروں کی زندگی کو دیکھ کر انہیں اپنے سے بہتر تصور کرتے ہیں مگر ایسا کرتے ہوئے ہمیشہ بھول جاتے ہیں کہ ہم بھی کسی کے لیے قابلِ رشک ہیں۔

افشاں۔U,K

قطعہ

رتبہ بھی میرے سر کو تیرے در سے ملا ہے
حالانکہ مجھے سر بھی تیرے در سے ملا ہے
لوگوں کو ملا ہے تو مقدر سے ملا ہے
مجھ کو تو مقدر بھی تیرے در سے ملا ہے

سلمیٰ۔بحرین

عقیلہ حق کی ڈائری سے

لڑکا فون پر: ''کہاں ہو؟''

لڑکی: ''امی کے ساتھ آئی ہوں یہاں فائیو اسٹار ہوٹل میں پارٹی ہے، تم کہاں ہو؟''

لڑکا: جس گلی میں تم دیگ کے چاول کھا رہی ہو میں وہیں بیٹھا ہوں اور چاول چاہیے تو بتانا۔''

پروین شاکر کے قلم سے

وہ بچپنے کی نیند تو خواب ہوگئی
کیا عمر تھی کہ رات ہوئی اور سو گئے

لطیفہ

مجرم: کوشش کرنا مجھے پھانسی نہ ہو جائے، عمر قید بھلے ہو جائے۔''

سردار وکیل: ''ٹھیک ہے۔''

مجرم: ''کیا بنا؟''

سردار وکیل: ''بڑی مشکل سے عمر قید کروائی ہے ورنہ جج تمہیں رہا کرنے پر تلا ہوا تھا۔''

سادگی

ٹیچر بچے سے: ''بتاؤ دنیا کا سب سے پہلا جانور کون ہے؟''

بچہ: ''میڈیم زیبرا......''

ٹیچر: ''وہ کیسے؟''

بچہ: ''اس لیے کہ وہ بلیک اینڈ وائٹ ہے۔''

دعا

میرے اللہ مجھے کبھی بھی، کسی بھی حالت میں
مشکلوں اور پریشانیوں میں
خوشیوں میں راحتوں میں
کبھی بھی اکیلا مت چھوڑنا میرے مالک
ہمیشہ اپنی رحمت کے سائے میں رکھنا
ہمیشہ اپنی محبت کی نگاہ سے دیکھنا
میرے گناہوں کو معاف کرنا، میرے مولا
مجھے ایسا بنا دینا کہ میں تجھے پسند آ جاؤں۔ آمین۔

عافیہ۔فیصل آباد

ابو آپ کی جیکٹ

باپ نے پپو کی تلاش لی، جیب سے گٹکا، سگریٹ، کترینہ کیف کی تصویر اور لڑکیوں کے نمبر نکلے۔

باپ نے پپو کو بہت مارا اور پوچھا۔

''بتاؤ یہ سب کب سے کر رہے ہو؟''

پپو نے روتے ہوئے کہا۔

''ابو میں نے آپ کی جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔''

محمد عرفان۔لالہ موسیٰ

رنگ آپ کی پہچان

سبز رنگ۔ ایسی خواتین جنہیں سبز رنگ پسند

ہو ہمیشہ خوش رہتی ہیں۔

گلابی رنگ: پسند کرنے والی خواتین قناعت پسند ہوتی ہیں۔

نیلا رنگ: پسند کرنے والی خواتین ہر شعبے میں بلندی کی جستجو رکھتی ہیں۔

جامنی رنگ: پسند کرنے والی خواتین لوگوں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

سفید رنگ: پسند کرنے والی خواتین امن پسند ہوتی ہیں۔

بھورا رنگ: '' پسند کرنے والی خواتین محنتی ہوتی ہیں۔

نیرہ شاکر۔ قلات

سنہری باتیں

☆...... جو لوگ اصولوں کے پابند ہوتے ہیں وہ زندگی کے کسی مقام پر محرومی کا شکار نہیں ہوتے۔

☆...... خواہ مخواہ دوسروں کے کردار پر شک نہ کیا کرو، ہوسکتا ہے کسی کے جس عمل سے تمہارے ذہن کو وقتی اذیت پہنچ رہی ہو کل وہ تمہاری زندگی کی اصل حقیقت بن جائے جسے تم تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ' سچائی اپنا آپ خود منوالیا کرتی ہے۔

☆...... دل میں خلوص ہو تو انسان کے زخموں کا مداوا تقدیر خود کردیتی ہے۔

☆...... خوددار انسان موت کو ہنس کر قبول کرلیتا ہے موت تو آنی ہے کیوں نہ اُسے ہنس کر گلے لگالیا جائے۔

☆...... کائنات بولتی نہیں مگر زندہ ہے کائنات دلیلوں سے نہیں اُلجھتی لیکن اصلیت کی منزل تک پہنچاتی ہے۔

☆...... جو چیز نہ آتی ہو اُسے سیکھنے میں شرم محسوس نہ کرو۔

☆...... برائی کھوٹے سکے کی مانند ہوتی ہے جو فوراً لوٹا دی جاتی ہے۔

☆...... جس کو پیار کرو اُس کی خامیاں نظر انداز کرواتنے مخلص بنو کہ غیر کا خیال ہرگز دل میں جاگزیں نہ ہو۔

☆...... جس سے دوستی کرو اُس کی برائیاں نہ اُس سے کرو اور نہ کسی اور سے۔

☆...... محبت مکمل زندگی ہے اِس کا نشہ تمام عمر انسان کو مدہوش رکھتا ہے۔

مسز نگہت غفار۔ کراچی

انسان

1)...... انسان بھی عجیب مزاج کا ہے۔ جو اُس کی 'طبیعت' کو سمجھے وہ برا لگتا ہے۔

2)...... لاکھ لوگوں کے شجرے کھنگال لیں۔ واسطہ پڑنے پر ہی کردار کھلتے ہیں۔

3)...... انسان دو وجہ سے ہی بدلتا ہے

کوئی بہت خاص اُس کی زندگی میں آجائے

یا......

کوئی بہت خاص اُس کی زندگی سے چلا جائے

4)...... اللہ پر ایمان مضبوط رکھنے والوں کے لیے ہر دور میں معجزے ہوتے ہیں۔

ناصرہ۔ ناروے

فرصت کے لمحے

اُسے ہم یاد آتے ہیں فقط فرصت کے لمحوں میں
مگر یہ بات بھی سچ ہے اُسے فرصت نہیں ملتی

شاعر۔ احمد فراز

قطعہ

ہم تسلیم کرتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں زمانہ بھول جاتے ہیں

رباب جعفری۔ لاہور

نئے لہجے نئی آوازیں

غزل

فاصلہ رکھ کر تیرا ملنا مجھے اچھا لگا
کیا بتاؤں میں بھلا تجھ میں مجھے اچھا لگا
قبل آنے سے ترے اور اک ترے جانے کے بعد
یاد کرنا آنکھ بند کر کے تجھے اچھا لگا
تیری اُلفت سے پرے سب درد میرے ساتھ تھے
اُن کی سنگت میں اکیلا پن مجھے اچھا لگا
رسم دنیا تم نبھاؤ اور میں رسم وفا
دل سے میرے کھیلنا تیرا مجھے اچھا لگا
آس پاس دل کے ترے کچھ ہیں میری پرچھائیاں
عکس آنکھوں میں تیری اُن کا مجھے اچھا لگا
جھوٹ میں کہتا نہیں، سچ کی تجھے ہمت نہیں
اس لیے بس نام ہی لینا...... مجھے اچھا لگا

شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

زندگی

اے میری زندگی تُو کہاں کھو گئی
چار سو وحشتیں چار سُو تیری
دوستی کے لیے کر گئے دشمنی
کھا گئی ہے مجھے اک تیری بے رخی
میں مریضِ وفا کیا کروں نوکری
بے وفا لوگ بھی کر گئے دشمنی
کون سمجھے مگر اب مری بے بسی
ڈھونڈ لاؤ اُسے کھو گیا اجنبی

شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

تُو ہی تُو......

تجھ کو دیکھوں تو جی اٹھتا ہوں
تجھے چھولوں تو مہک اٹھتا ہوں

تیرا دیدار ہے زندگی میری
تیری یادیں ہیں عبادت میری
میرے خیالوں کو بخشی ہے تُو نے ضیاء
میرے ارادوں کی طاقت ہے تُو
میری تمنا، میری محبت ہے تُو

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

غزل

جاگنا دشوار تر ہے صبح کی تنویر تک
نیند کا اک سلسلہ ہے خواب سے تعبیر تک
یہ زمانہ وہ طلسماتی زمانہ ہے کہ یاں
شاخ پر زیتون کی دیکھے گئے انجیر تک
کاش تم بھی دیکھتے اِس دور کی نیرنگیاں
موم کی آہوں سے بھی گل جاتی ہے زنجیر تک
عالم عُسرت بلا ہے اور اک ایسی بلا
دل سے رانجھا کے نکل جاتا ہے عشق ہیر تک
کیا ڈرائے گا زمانہ مجھ کو اپنی چال سے
ہیں تو عامر کھا چکا ہوں دوستوں کے تیر تک

شاعر: عامر ثانی۔ کراچی

میں بھی نا!

یہی سوچ کر اپنی زندگی کی دعا کرتی تھی
کہ کوئی پُرنم آنکھ مجھے دیکھ کر جیا کرتی تھی
اک شجر تھا وہ چاہے خزاں رسیدہ تھا
پتے زمین اور شاخ آسمان ہوا کرتی تھی
میں اکثر اسے ہاتھ تھامنے کو کہتی تھی
با خدا میں تو دل و جان سے وفا کرتی تھی
وہ یوں چلا گیا جیسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا

اُس کی آنکھ کا آنسو تو میں ہوا کرتی تھی
وفاؤں کے عہد و پیماں جب کرتے تھے
تقدیر بے پروائی سے ہنسا کرتی تھی
شاعرہ: نگین افضل وڑائچ۔ گجرات

ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں
لوگوں کا دل یہ دُکھاتے ہیں
چہرے پر مسکراہٹ لیکن......
دل میں بغض و کینہ یہ رکھتے ہیں
لیکن ایسے بھی لوگ دنیا میں دیکھے ہیں
احسان تو کرتے ہیں پر جتاتے نہیں
لوگوں کا دل وہ دُکھاتے نہیں
معصوم دل سے کھیل کر دھوکہ دے جاتے ہیں لوگ
کچھ اچھے بہت، کچھ برے بہت دیکھے ہیں
لیکن زندگی میں دونوں ہی یاد رہ جاتے ہیں
شاعرہ: زہرا سعید۔ کراچی

کیا کہوں

زندگی کہوں
خوشی......محبت......خواہش
یا پھر اپنا کُل سرمایہ کہہ دوں
اُس نے مجھ سے
اپنے نام کا مطلب پوچھا ہے
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ شادیوال گجرات

تنہائی

دیکھا جو چہار سُو تو بس تنہائی ہے
تجھ بن میں جیوں ایسی نوبت آئی ہے
کیسے جئیں تم بن کیسے کاٹیں رات دن
بہت رُسوا کرتی تڑپاتی جدائی ہے
تیری یادوں کے گلشن سجائے رکھے ہیں
کہ ہر پھول سے تیری خوشبو آئی ہے

زندگی کے لمحوں نے جو ساز چھیڑے ہیں
ہر طرف گونجتی غموں کی شہنائی ہے
اُس کو دیکھا بس اس کے ہی ہو گئے ہم
نہ بعد اُس کے کوئی صورت بھائی ہے
دل کو جیتنے والی باتیں کر کے ہزار
توڑا ہے دل...... کس قدر ہرجائی ہے
باتیں وفا کی کوئی اس سے سیکھے
جس کی رگ رگ میں بہتی بے وفائی ہے
شاعرہ: نینا خان۔ کراچی

محبتوں کے ادھورے سفر

زندگی کے اس طویل سفر میں
راہیں تمہاری جدا، ہماری جدا
وقت کے اِن دریچوں میں
یادیں تمہاری جدا، ہماری جدا
مانا کے اُن حسین خوابوں میں
جہاں زندگی کو بھی بُنا تھا ہم نے
اب اِنہی خوابوں کی اندھیر نگریوں میں
منزلیں تمہاری جدا، ہماری جدا
انتظار کی اذیت کا کرب
جیسے تم نے سہا، ویسے ہم نے سہا
مگر پھر بھی اس کرب میں مبتلا
درد تمہارے جدا، ہمارے جدا
تمہاری رفاقت میں یہ زندگی
شاید ہمارے نصیب کی منتظر نہیں
ورنہ چاہا تو تمہیں ٹوٹ کر تھا
بس اب دل کے راستے تمہارے جدا، ہمارے جدا
بے ضرر سہی بے ضمیر نہیں ہم بھی!
محبتوں میں ہوس کے اسیر نہیں، ہم بھی
کبھی تھی جس محبت سے وابستگی
اب اُسی محبت کی تنہائیاں تمہاری جدا ہماری جدا
شاعرہ: رجاء امیر۔ کراچی

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

تھوڑا جی لے

"تھوڑا جی لے" ایک ایسی فلم ہے جو ہر

پاکستانی کو اپنی فیملی کے ساتھ ضرور دیکھنی چاہیے۔
20 جنوری کو ریلیز ہونے والی اس فلم نے پاکستان

سینما انڈسٹری میں تہلکہ مچادیا ہے۔ نئے چہروں اور ہلکی پھلکی کہانی کے ساتھ یہ فلم ایک حقیقی تفریح ہے۔ ویسے بھی مہتاب اکبر راشدی سے اس سے کچھ کم کی امید بھی نہیں تھی ۔ وہ اس فلم کی پروڈیوسر ہیں۔ کاسٹ میں رضوان علی جعفری' رمشا خان' بلال عباسی' سلمان فیصل' فاطمہ شاہ جیلانی' قاسم خاں اور احسن محسن شامل ہیں۔

لوٹ کے بدھو......

خبر ہے کہ بہت جلد ڈاکٹر شائستہ لودھی دوبارہ

جیو چینل جوائن کرنے جارہی ہیں۔ وہ ایک بار پھر سے مارننگ شو کی میزبانی کریں گی جو اپنی نوعیت کا سب سے مختلف مارننگ شو ہوگا۔ ایسا چینل کا کہنا ہے' شاید شائستہ لودھی کو اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ اداکاری کے میدان میں کسی حد تک ناکام ہوگئی ہیں۔ فیصل قریشی جیسے منجھے ہوئے اداکار کی موجودگی بھی ان کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہوسکی اور ان کے مدمقابل جاناں کے کردار نبھانے والی نو عمر اداکارہ صبور نے دیکھنے والوں کو حیران کردیا ہے ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ جیو سے نشر ہونے والا مارننگ شو کیا گل کھلاتا ہے۔

شکریہ

عابدہ پروین فوک اور صوفی موسیقی کا بہت بڑا نام ہے۔ برصغیر میں اس فنکارہ کا کوئی مقابل نہیں۔ عابدہ پروین نے جب بھی کوئی نئی کافی اپنے سننے والوں کے سامنے پیش کی۔ سننے والے اپنا سر دھنے پر مجبور ہوگئے۔ اس بڑی فنکارہ نے 2017ء کی آمد پر اپنے Fans کے لیے نیا ٹریک ریلیز کیا ہے۔ Mulk-e-Khuda کے نام سے، جس نے ریلیز ہوتے ہی دھوم مچادی ہے۔ ہم عابدہ پروین کا اس خوبصورت تحفے پر دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جی آیا نوں......

آمنہ ملک جو ایک بہترین مارننگ شو ہوسٹ ہیں جلد ایک نئے چینل پر مارننگ شو کی میزبانی کرتی نظر آئیں گی۔ آمنہ کا شو سلجھے ہوئے لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔Content کے اعتبار سے اُن کے شوز قابل تعریف ہوتے ہیں۔ ہم منتظر ہیں کہ ایک بار پھر آمنہ اپنے فینز کے لیے بہترین صبح کا شو پیش کریں گی۔

چھوٹی سی زندگی

ہم ٹی وی نے اپنی سابقہ روایت برقرار

رکھتے ہوئے ایک اور بہترین ڈرامہ اپنے حاضرین کے لیے نشر کیا ہے۔ ڈرامے کا نام ہے

چھوٹی سی زندگی' بے انتہا خوبصورت فیملی ڈرامہ تحریر ثروت نذیر' ڈائریکشن ثقلین خان' فنکار اقراء عزیز' شہزاد شیخ' نمرا خان۔ ملتان کے دہی علاقے کی ترجمانی کرتا یہ ڈرامہ بہت خوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

چھا گئے ہیں......

ARY ڈیجیٹل سے پیش کیا جانے والا

ڈرامہ میرے ہمنوا اپنی نوعیت کا بہترین ڈرامہ ہے نعمان اعجاز جیسے منجھے ہوئے اداکار کے مدمقابل کام کرنا کوئی آسان کام نہیں جو بڑی خوبصورتی سے علیشاہ یوسف ادا کررہی ہیں۔ اصفر رحمان کی بھی اداکاری یہاں قابل ذکر ہے لو ٹرائی اینگل کے گرد گھومتا یہ ڈرامہ دیکھنے والوں پر اپنا سحر طاری کر چکا ہے۔

یک طرفہ

آج کل صبا قمر بہت عجیب و غریب

خواہشات کا اظہار کررہی ہیں۔ اپنی پہلی فلم (انڈین) عرفان خان کے ساتھ مکمل کرنے کے بعد اب وہ چاہتی ہیں کہ وہ سلمان خان کے ساتھ کام کریں۔ آخر سلمان خان کی بہت بڑی فین

ہیں وہ' مزید بھارتی فلموں میں کام کرنے کی خواہشمند ہیں مگر صرف سلمان خان کے ساتھ اب یہ واضح نہیں ہے کہ کیا سلمان خان بھی یہی خواہش رکھتے ہیں یا یہ یک طرفہ خواہش ہے۔

خوش خبری

علی ظفر کے مداحوں کے لیے خوشی کی خبر ہے کہ وہ بہت جلد احسن رحیم کی فلم تیفا ان ٹربل' میں نظر آئیں گے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ فلم مزاحیہ ہوگی۔ احسن رحیم مشہور ہیں اُن کے اشتہارات میں بھی مزاح کی جھلک ہوتی ہے۔ ویسے تو علی ظفر کی گائیکی مشہور ہے مگر ماضی میں بھی علی ظفر نے مزاحیہ فلم میں کام کر کے اپنے دیکھنے والوں کو حیران کر دیا تھا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ فلم بھی باکس آفس پر اپنا رنگ جما سکے گی۔

نگار ایوارڈز

ایک اچھی خبر کہ تقریباً 12 سال کے تعطل کے

بعد پاکستان کے سب سے پرانے فلمی ایوارڈز کا دوبارہ اجراء ہونے جا رہا ہے۔ 16 مارچ کو یہ تقریب کراچی میں منعقد ہوگی۔ 47 نگار ایوارڈز اپنے بانی الیاس رشیدی کے انتقال کے بعد ایک بار پھر پوری شان و شوکت کے ساتھ دیے جائیں گے جس میں شوبز کی دنیا کے تمام ستارے شرکت کر رہے ہیں۔ ہم اس تقریب کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور اسلم رشیدی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

روسٹ چکن سوپ

اجزاء

مرغی کا گوشت (بون لیس)	1 کپ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پیسٹ	1 چائے کا چمچہ

سوپ بنانے کے لیے:

چکن کی یخنی	4-5 کپ
لہسن (کٹا ہوا)	1 چائے کا چمچہ
تھائم	پون چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گاجر (کدوکش کی ہوئی)	آدھا کپ
مٹر	آدھا کپ
مکھن	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (آملیٹ جیسی کاٹ لیں)	1 عدد
چکن کے ٹکڑے	گارنش کے لیے
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے
انڈا (پھینٹ لیں)	1 عدد

ترکیب:

پیالے میں گوشت، نمک، کٹی لال مرچیں اور لہسن پیسٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے گرم اوون میں 200°C پر روسٹ کر کے چکن روسٹ تیار کرلیں اور ایک طرف رکھیں۔ ایک سوس پین میں مکھن گرم کریں اور کٹا ہوا لہسن اور پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ لہسن، پیاز میں ہلکا سا کلر آجائے تو مٹر اور گاجر ڈال کر ہلکا سا فرائی کرلیں۔ چکن یخنی، نمک، سفید مرچ پاؤڈر، تھائم اور آدھا چکن روسٹ ڈالیں اور ساتھ ہی کارن فلور، پانی میں گھول کر ڈالیں۔ انڈا ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکال لیں اور اس میں باقی چکن ڈال کر پیش کریں۔

فش گرین مسالا

اجزاء:

مچھلی (سلائس کاٹ لیں)	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	2 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	3 عدد
پودینہ (چوپ کیا ہوا)	1 کھانے کا چمچہ
لہسن کے جوے	6 عدد
ادرک	1 انچ کا ٹکڑا
تیل	پون کپ
زیرہ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:
مچھلی کو آٹا لگا کر دھولیں اور خشک کرلیں۔ چوپر میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، پودینہ، لہسن، ادرک، زیرہ پاؤڈر، سفید مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر دردرا پیس لیں۔ سوس پین میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ سنہری ہو جائے تو پسا ہوا مسالا ڈال کر فرائی کریں۔ تیل الگ ہو جائے تو مچھلی کے سلائس مسالے پر رکھیں۔ دہی پھینٹ کر مچھلی پر ڈالیں اور ڈھک کر 2 منٹ پکائیں اور کپڑے سے پکڑ کر پین ہلائیں درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ تیل الگ ہو جائے سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

ڈھابہ دال مرغ

اجزاء

چکن	آدھا کلو
لہسن، ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
دال مونگ	آدھا کپ (دھو کر بھگودیں)
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
پیاز	2 عدد (کدوکش کی ہوئی)
ٹماٹر (سلائس کاٹ لیں)	2 عدد
املی کا پانی	آدھا کپ
تیل	آدھا کپ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	4 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
ادرک (سلائس کاٹ لیں)	حسب ضرورت

ترکیب:
ہانڈی میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ سنہری ہو جائے تو گوشت، لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ 6-5 منٹ فرائی کرکے دال مونگ، دال مسور، نمک، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ٹماٹر اور 2 کپ پانی ڈال کر ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں، دالیں گل جائیں تو ہلکا ہلکا گھوٹ لیں۔ اس میں املی کا رس، حسب ضرورت پانی، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر 2 منٹ مزید پکائیں سرونگ ڈش میں نکال کر ادرک سے گارنش کرکے نان کے ساتھ سرو کریں۔

مچھلی کی بریانی

اجزاء:

مچھلی کے ٹکڑے	ایک کلو
چاول (اُبلے ہوئے)	آدھا کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	250 گرام
ٹماٹر (چوپ کیے ہوئے)	375 گرام
پسا ہوا لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا، پودینہ (چوپ کیا ہوا	آدھا، آدھا گڈی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	6 عدد
آلو بخارے	50 گرام
بادیان کے پھول، چھوٹی الائچیاں	4 عدد
بڑی الائچیاں	2 عدد
لونگیں	4 عدد
پسی ہوئی جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	پون چائے کا چمچہ
بریانی ایسنس	چند قطرے
پسا ہوا دھنیا، ثابت کالا زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک پیالی

ترکیب:
دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں مچھلی کے ٹکڑے بھی تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں ٹماٹر، لہسن ادرک، آلو بخارے، بادیان، چھوٹی اور بڑی الائچیاں، لونگیں، جائفل جاوتری، زردے کا رنگ، دھنیا، کالا زیرہ، کالی مرچ، لال مرچ اور نمک ڈال کر ٹماٹر نرم ہونے تک پکائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس میں آدھی ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال کر مچھلی کے ٹکڑے تہہ کی طرح رکھ دیں۔ اس کے اُوپر چاولوں کی تہہ لگائیں پھر باقی ہری مرچیں، دھنیا، پودینہ اور بریانی ایسنس چھڑک کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بریانی ٹماٹر سے سجا کر پیش کریں۔

دیسی اسٹائل مغز

اجزاء:

بکرے کا مغز	2 عدد (دھو کر صاف کر لیں)
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
پودینہ (چوپ کیا ہوا)	پون پیالی
ہری مرچیں (چوپ کیا ہوا)	6-7 عدد
ٹماٹر (کیوب کاٹ لیں)	2 عدد
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	1 چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	1 چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچیں (کُٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
ثابت گرم مسالا	1 کھانے کا چمچہ

ترکیب:

دیگچی میں مغز، نمک، ہلدی پاؤڈر ڈال کر اُبال لیں۔ تیل گرم کر کے اس میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑکڑائیں اور لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں اس کے بعد ہرا مسالا ڈال کر بھونیں۔ اس میں کٹا ثابت دھنیا اور زیرہ، کُٹی لال مرچیں اور ٹماٹر ڈال کر پکائیں۔ تمام مسالے اچھی طرح بھون لیں۔ اُبلے ہوئے مغز کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر ڈھک کر پکائیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو پسا گرم مسالا ڈال کر 5 منٹ مزید پکائیں۔ مزیدار دیسی اسٹائل مغز تیار سرونگ پلیٹ میں نکال کر گرما گرم نان کے ساتھ سرو کریں۔

فرنچ آملیٹس

اجزاء:

مرغی (اُبلی اور ریشہ کی ہوئی)	250 گرام
انڈے	4 عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی)	2 کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چیڈر پنیر (کدوکش)	25 گرام
کھمبی (باریک کٹی ہوئی)	4 عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	پون پیالی
سلاد پتے	سجانے کے لیے

ترکیب:

انڈے کی سفیدی اور زردی الگ الگ کر لیں۔ سفیدیوں کو الیکٹرک بیٹر کی مدد سے جھاگ اُوپر آنے تک پھینٹیں۔ اس میں زردیاں، پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، لال مرچ اور نمک ملا لیں۔ فرائنگ پین میں آدھا تیل گرم کریں اور اس میں انڈے کا آدھا آمیزہ ڈال کر پھیلائیں، اس کے اوپر آدھی کھمبی اور آدھا پنیر پھیلا کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ فرائنگ پین میں باقی تیل گرم کریں، اس پر انڈے کا باقی آمیزہ پھیلا کر سُنہری کریں اور اسے پلٹ دیں۔ اس پر مرغی، باقی کھمبی اور باقی پنیر ڈالیں اور دوہرا کر کے پکائیں۔

☆☆☆......☆☆